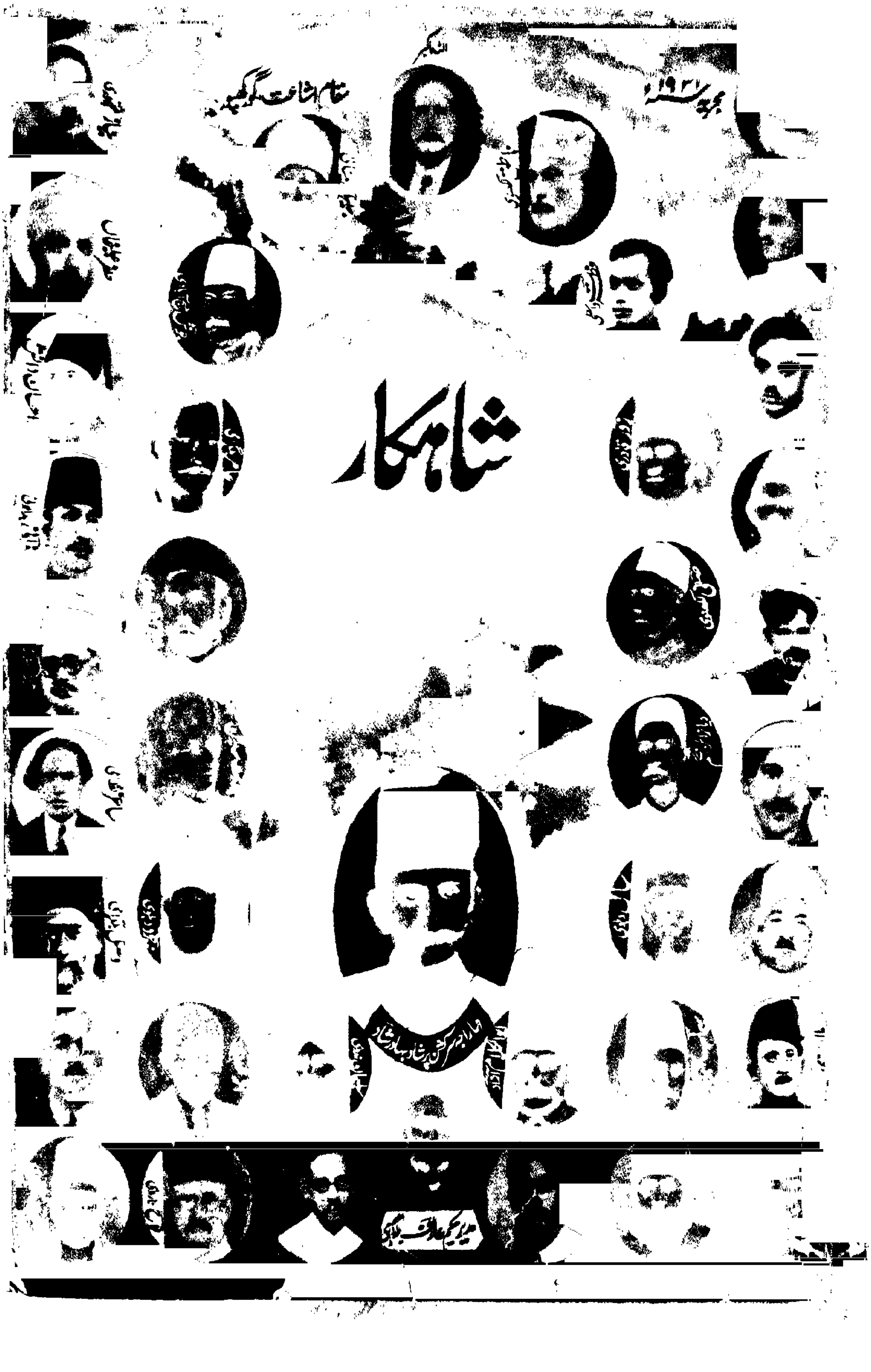
شاہکار



مقام اشاعت گورکھپور
اکبر
مجریہ سنہ ۱۹۳۱ء
شاہکار
مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد



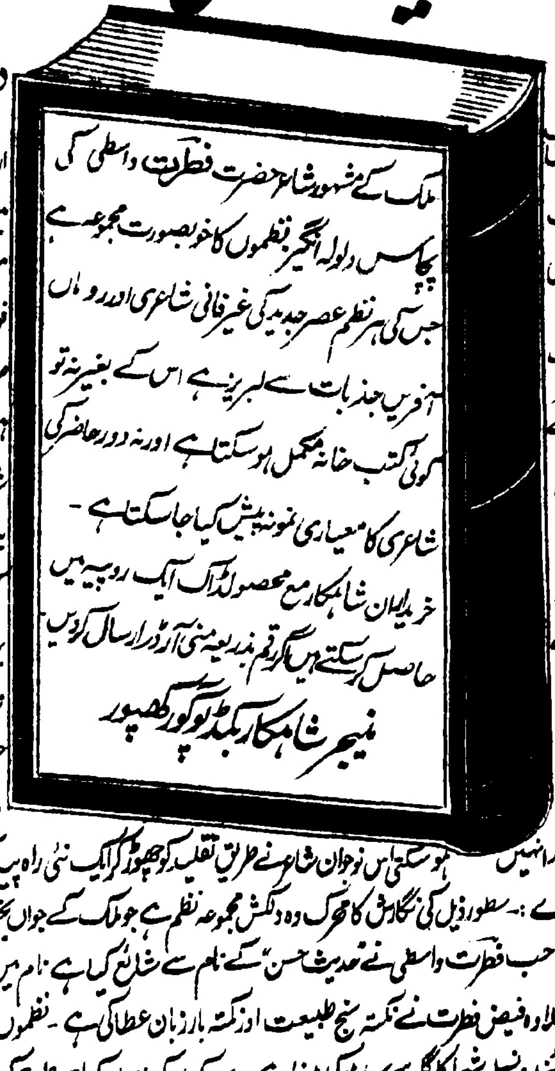
تار کا پتہ "حنا"

اصغر علی محمد علی تاجر عطر (لکھنؤ)

ٹیلیفون نمبر ۱۳۹

کارخانہ ۱۸۳۹ء میں قائم ہوا

حدیث حسن



حدیث حسن

حضرت نیاز اُن بیگم: فطرت صاحب
تعارف نہیں ہیں۔ خیالات
روانی و ترنم بندشوں میں چستی بھی
ہیں واسطی صاحب کا

علامہ نیاز فتحپوری: فطرت
چند ذہین نوجوانوں میں سے
کچھ بن سکتے ہیں۔ فطرت کی
مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ
وحقائق کا شوق نہیں وہ جو
تاثرات میں لکھتے ہیں ان کے
پائی جاتی ہے اور سلاست

مولانا سید سلیمان ندوی:
اس وقت جب یہ یقین ہو چلا
فرسودہ راہ میں کوئی جدت اب پیدا نہیں

درحدیث دیگراں

اردو کی دنیا میں محتاج
میں بلندی الفاظ میں
موجود ہے - اس کتاب
فوٹو بھی ہے -
صاحب یوپی کے ان
ہیں جو دنیا میں سب
شاعری میں جو بات
یہ ہے کہ انھیں معارف
کچھ لکھتے ہیں اپنے
یہاں ندرت بھی کافی
وحلاوت بھی -
حیرت ہوئی کہ عین
تھا کہ ہماری شاعری کی

ہو سکتی اس نوجوان شاعر نے طریق تقلید کو چھوڑ کر ایک نئی راہ پیدا کی ہے -

مولانا اقبال سہیل ایم اے :- سطور ذیل کی نگارش کا محرک وہ دلکش مجموعہ نظم ہے جو ملک کے جواں بخت فرزند اور جواں سال ادیب سید تمیم احمد صاحب فطرت واسطی نے "حدیث حسن" کے نام سے شائع کیا ہے نام میں شعریت اور حسب میں شاعری ہونے کے علاوہ فیض فطرت نے نکتہ سنج طبیعت اور نکتہ بار زبان عطا کی ہے - نظموں کے تیور کہہ رہے ہیں کہ ان کے مصنف کو آئندہ نسل شعرا کا گل سر سبد ہو کر رہنا ہے - میں کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی سراپا محشرستان جذبات نظمیں شاذونادر ہی نظر آ سکتی ہیں - جدت کے باوجود تشبیہات کی ندرت، استعارات کی تازگی، ترکیبوں کی شگفتگی - تصویروں کی دلکشی جذبات کی شدت اور خیالات کا جزرومد وہ محاسن ہیں جو یکجا طور پر پختہ کاروں کے کلام میں بھی مشکل سے مل سکتے ہیں -

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مجلہ ادبیہ شاہکار　　　　اردو کا سب سے قیمتی ادب ساز ان صحیفہ　　　　مجریہ ۱۹۳۱ء

سالنامہ شاہکار ۱۹۳۶ء

گورکھپور

انتساب

میں بہ کمال عقیدت و ارادت سالنامہ شاہکار ۱۹۳۶ء کو عالیجناب ہز اکسلنسی شاعر اعظم حضور مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر جی سی آئی ای متخلص بہ شاد دام اقبالہٗ کے نام نامی پر معنون کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں۔

خادم ادب: حکیم عارف بلگرامی

مدیر

ارشادات عالیہ

ہز اکسلنسی مہاراجہ بہادر سر کشن پرشاد شاؔد جی سی آئی ای حیدرآباد (دکن)

عشق کو بے نیاز ہونا تھا ۔۔۔ سوز سے دل کا ساز ہونا تھا
اپنا افشائے راز ہونا تھا ۔۔۔ عشق کو فتنہ ساز ہونا تھا
شیوہ عاشق کا ناز برداری ۔۔۔ اور انھیں بے نیاز ہونا تھا
مختصر کیوں نہ ہوتی وصل کی شب ۔۔۔ طولِ ہجراں دراز ہونا تھا
ہے مرے درد کی دوا تو ہی ۔۔۔ کوئی تو چارہ ساز ہونا تھا
گر حقیقت بتوں کی جانتا شیخ ۔۔۔ دیر بہرِ نماز ہونا تھا

تو حقیقت شناس ہوتا شاؔد
پہلے شغلِ مجاز ہونا تھا

تبرکات

شاہزادہ خضر سلطان بہادر

کیا سماں ہے رات کو اپنی نظر میں چاندنی　　دنکو بھی دیکھی ہے ہم نے اُسکے گھر میں چاندنی
تم جو ٹہلے زمستاں میں نہ بیٹھے بام پر　　لوٹتی ہے کوہ و شہر و بحر و بر میں چاندنی
تا سحر کو ہو سکیں مانع در و دیوار کیا　　ہے ہر اک شب اس گلی کی رہگذر میں چاندنی
خوب ہوتے ہیں پیری میں جو ہوئے سر سفید　　آخر شب کام آتی ہے سفر میں چاندنی
اسکے آگے یوں ہوا اوروں کا جوبن بے فروغ　　جس طرح ہو لمعہ نورِ سحر میں چاندنی
دیکھو وہ کب جائے جو ہو رات بھر تیرا جلیس　　چھپ رہی ہوگی ترے دیوار و در میں چاندنی

کیوں نہ بنیں روز یعنی میرے دودِ آہ سے
خضر ہو جاتی ہے میلی رات بھر میں چاندنی

خاص سالنامہ کیلئے　　　　مرسلہ حضرت مسلم از حیدرآباد

تبرکاتِ حضور

از محمد عبدالبصیر حضور لکھنوی مرحوم

دانا کوئی ناداں کا ہو ماتحت اگر
گھٹتی نہیں آبرو ہے اسکی ہرگز
دیکھا ہے بارہا میں نے دریا میں حضور
اوپر ہے حباب اور نیچے گوہر

جان دینا ہے تو دو اس کہکشاں کے نام پر
دل کو بھٹکاؤ نہ کوئی صورت اچھی دیکھ کر
زلف کا سودا انہوں نے خال عارض کا خیال
عشق کو عمر گھٹاؤ لیکن بال سیمیں دیکھ کر

(غیر مطبوعہ)

تبرکات شاد

از حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئیگا ۔۔۔ تو میں مرنے سے درگزرا مرے کس کام آئیگا

شب ہجراں کی سختی ہو تو ہو لیکن یہ کیا کم ہے ۔۔۔ کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئیگا

لگی ہو کچھ تو قاصد دل میں خود پیغامبر کے بھی ۔۔۔ وہاں جائیگا جو تیری طرح ناکام آئیگا

نہ جھپکاؤ پلک تک ٹکٹکی باندھے رہو رندو ۔۔۔ ہتھیلی پر کبھی تو رکھ کے ساقی جام آئیگا

یہاں دل پر بنی ہے تجھ سے اے غمخوار کیا الجھوں ۔۔۔ یہ کون آرام ہے مرجاؤں تب آرام آئیگا

عطا کی جبکہ خود پیر مغاں نے پی بھی لے زاہد ۔۔۔ یہ کیا سوچنا ہے تجھ پہ کیوں الزام آئیگا

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی ۔۔۔ خم آئیگا صراحی آئیگی تب جام آئیگا

گلی میں یار کی اے شاد سب مشتاق بیٹھے ہیں
خدا جانے وہاں سے حکم کس کے نام آئیگا

مرسلہ حضرت طفیل سلطان پوری

تبرکات بیدار

(از حضرت بیدار دہلوی مرحوم)

جو اب کی چھوڑے مجھے غم تری جدائی کا — تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا

نہیں رہا ہے کسی کے اب اختیار میں دل — کیا ہے قصد مگر تم نے دلربائی کا

اُگے ہے پنجۂ مرجاں مزار سے اسکے — شہید ہو جو کوئی اس کفِ حنائی کا

مرے قدم سے ہے لبریز بوستانِ جنوں — ہر یک آبلہ گل ہے برہنہ پائی کا

جہاں ہو نقش قدم اسکا دیکھو بیدار

کہ واں نشان ہے میری بھی جبہ سائی کا



صاحبِ نقش و نگار حضرت جوش ملیح آبادی کے تازہ نقوش

نیچی نگاہیں

آہ یہ نیچی نگاہیں، اے نگارِ شرمگیں　　　عشق اس کافر حیا کی تاب لا سکتا نہیں
یہ شہابی رنگ، نازک جلدیں رخسار کی　　　خون کا یہ رقص، تہ میں عارضِ گلنار کی
سرخ آنچل کا ڈھلک جانا یہ سر سے بار بار　　　دونوں ہاتھوں سے چھپا لینا یہ منھ بے اختیار
سرنگوں ہیں پھول، سکتے میں ہے پیمانے کا رنگ　　　اف یہ نم آلود رخساروں پہ شرمانے کا رنگ
عارضِ گلرنگ پر یہ پھول سا کھلتا ہوا　　　یہ تبسم جو طلوعِ صبح سے ملتا ہوا
گفتگو یہ، سر جھکا کر شرمگیں انداز سے　　　یہ گرہ ہر لفظ میں رکتی ہوئی آواز سے
ہر نفس، کڑیاں سی کھلنا سانس کی زنجیر میں　　　کہتے کہتے کچھ یہ رک جانا مرا تقریر میں

لب کو یوں جنبش سی ہونا نطقِ شرم آمیز سے
پنکھڑی جس طرح مڑ جائے ہوائے تیز سے

خاص سالنامہ شاہکار کیلئے ۔ جوش



صاحبزادہ سید حسن جعفری فطرت واسطی کا ایک تازہ شاہکار

جھنجھیاں مانگنے کی رومانی رسم

ایک شام دیہات میں

(۱)

یہ ارضِ حسن و جنتِ رومان و اشتیاق ہر شے میں جلوہ ریز ہے اک شانِ طمطراق
ہر جنبشِ ہوا میں ہے کیفِ رباب و چنگ موسم میں لاکھ حسن ہے، جلووں میں لاکھ رنگ
پھر بھی اس ارض کو ہے کہاں زینتوں کا ہوش دیہات کی فضا ہے لبِ شام ہی خموش
شہروں میں یہ سکون و فراغت کہاں نصیب رسموں کے دار و بست پہ، راحت کہاں نصیب
دنیا کو رشک جس پہ ہو، یہ وہ دیار ہے یہ گاؤں، اس جہاں کا رخِ سادہ کار ہے
ہر چیز میں ہے، سادگی و بے تکلفی تعریف اس دیار کی ہے بے تعرفی
یہ وہ جگہ ہے جس کا ملک بھی کریں طواف یہ جنتِ نگاہ ہے فطرت کا انکشاف

(۲)

حوریں بھی اس ارم میں ہیں بیباک و بے مثال طوفاں سے تیز طبع، غزالوں سے تیز چال

پودوں پہ عکس ڈال رہی ہے سنہری دھوپ
اٹھتی جوانیوں کا ہے کندن سا رنگ روپ

ماتھوں کے یہ کنول، رخ و عارض کے یہ گلاب
رعنائیوں کے چاند، جوانی کے آفتاب

زلفوں میں برشگال کی راتیں چھپی ہوئی
راتوں میں حسن و عشق کی باتیں چھپی ہوئی

آنکھوں میں ایک صاعقۂ مست و خوش خرام
ہونٹوں میں ایک بط کا عنوانِ ناتمام

دل میں ہے ایک جشن نگاہوں میں اک برات
کتنی مسرتوں سے ہم آغوش ہے حیات

(۳)

گانے کو آئی ہیں یہ دسہرہ کی رات میں
جلووں میں برقِ حسن ہے، جگنو ہیں ہات میں

اصرار ہے یہ انکا، کہ ہم گیت گائینگے
نووارد دیار کو گانا سنائینگے

لب پر ہے اک ترانہ مگر فہم سے بعید
آواز کے پہنچنے کی ملتی نہیں رسید

حیراں ہوں میں، کہ گیت ہیں یہ کس زبان کے
شاید زمیں پہ نغمے ہیں یہ آسمان کے

نوعمر دیویوں کا یہ اندازِ التفات
کس درجہ کامیاب ہے فطرت مری حیات

شاید دلوں سے انکے مرا دل ہے متصل
میں بھی ہوں آج عیش بہ جان و طرب بدل

خاص سالنامہ شاہکار کیلئے۔ فطرت

قیمت سالانہ تین روپیہ

سالنامہ شاہکار

گورکھپور

قیمت ششماہی دو روپیہ

ہر ماہ کے آخری ہفتے میں شائع ہوتا ہے

نوٹ:- اگر رسالہ نہ موصول ہو تو ماہ آئندہ کی ۷ تاریخ تک منیجر شاہکار کو مطلع ہونا چاہئے ورنہ بلا قیمت نہ روانہ ہوگا۔

جلد ۸	جنوری ۱۹۳۸ء	شمارہ ۱

تعارف

انتساب	مدیر	۱
ارشادات عالیہ	مہاراجہ کرشن پرشاد	۲
تبرکات خضر	شاہزادہ خضر سلطان	۳
تبرکات حضور	حضور بلگرامی	۴
تبرکات شاد	شاد عظیم آبادی	۵
تبرکات بیدار	بیدار دہلوی	۶
سچی نگاہیں (نظم)	جوش ملیح آبادی	۷
جھنجھیا ماٹنگنے کی رومانی رسم (")	فطرت واسطی	۸
تعارف		۱۰
ملاحظات	مدیر	۱۳

ارشادات عالیہ		ابوالعلا ناطق لکھنوی	۱۷
جذبات عالیہ		سیماب اکبر آبادی	۱۸
ارشادات آسی		عبدالباری آسی	۱۹
جدید اردو نثر کے رجحانات		سید اعجاز حسین ایم اے	۲۰
روزلی	افسانہ	محمد وسیم بی اے	۴۰
صنمیات ہند		نیاز فتحپوری مدیر نگار	۴۴
بغداد خاتون		قاضی تلمذ حسین ایم اے	۴۹
باورچی کا انعام	افسانہ	زور ایم اے پی ایچ ڈی	۶۵
مہدی افادی الاقتصادی		مجنوں گورکھپوری ایم اے	۶۸
فلسفۂ سیاسیات کا ایک رخ		سید رضوان اللہ ایم ایل اے	۷۷
عکس تحریر		علی کبیر بی اے	۸۱
عکس تحریر		احمد علی شوق مرحوم	۸۳
عکس تحریر		ریاض خیرآبادی مرحوم	۸۵
کمزوری تیرا نام عورت ہے	افسانہ	فطرت	۸۶
چکبست کی شاعری		حسن جمیل	۹۲
برامکہ کا عروج وزوال		ماہر القادری	۹۵
جذبات اثر		اثر لکھنوی کلکٹر بلیا	۹۹
شراب دوآتشہ		حافظ غازیپوری، جگر مرادآبادی	۱۰۰
نفحات عالیہ		صفی لکھنوی	۱۰۱
چاندی کے شمعدان	ڈرامہ	محمد وسیم بی اے	۱۰۲
جاپانی طالبات		مدیر	۱۱۷

بے زبان عورت	افسانہ	مدیر	۱۲۴
باقیات فانی		فانی بدایونی	۱۳۰
ایک علمی حقیقت کا انکشاف		خیر بہوروی	۱۳۱
نیند اور خواب		عبدالحلیم بی اے عثمانیہ	۱۳۴
انقلاب	افسانہ	مظفر گیلانی ایم اے پٹنہ	۱۳۸
ناقدان ادب		عطاء اللہ پالوی	۱۴۱
جنت	مزاحیہ	شوکت تھانوی	۱۴۶
ارتقائے حیوانی کی ایک جھلک		مدیر	۱۴۹
ہندوستان	نظم	ضیا فتح آبادی	۱۵۵
سرگزشت ناتمام	″	مسیح بنارسی	۱۵۶
برقپارے	″	ماہر القادری	۱۵۷
شاعرہ	″	ستیش چندر شباب	۱۵۸
فلسفۂ ہستی	″	بسمل الہ آبادی	۱۵۹
ماضی کی ایک حسین یاد	″	ثاقب کانپوری	۱۶۰
اشتہارات		صاحبان اشتہار	۱۶۱

تصاویر ——— رسالہ کے اندر ——— (۱) جناب مولوی سید رضوان اللہ بی ایس سی ال بی ایم ال اے رئیس اعظم گورکھپور
(۲) آنریبل جسٹس خان بہادر مولوی محمد اسماعیل رئیس اعظم گورکھپور (۳) خان بہادر سید شاہ زاہد علی سبز پوش رئیس اعظم گورکھپور (۴) جناب میاں صاحب
سید جواد علی شاہ رئیس اعظم گورکھپور (۵) خان بہادر مولوی نثار اللہ بی اے ایم ال سی گورکھپور (۶) جناب سید محمد کاظم علی شاہ سبز پوش گورکھپور
(۷) جناب قربان ارشد خاں چیف ایڈیٹر اخبار مشرق گورکھپور (۸) جناب محمد وسیم بی اے فائنل سینٹ انڈریوز کالج گورکھپور

″ ——— سرورق پر ——— شاعر اعظم اقبال، نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل، ادیب اعظم
نیاز فتحپوری، شاعر شباب حضرت فطرت واسطی، حضرت فانی بدایونی وغیرہم ——— ۴۰ تصویریں

صدر ——— عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد بالقابہ ———

شاہکار

مدیر: حکیم عارف بلگرامی　　معاون مدیر اعزازی:- مجنوں گورکھپوری ایم اے

شمارہ ۱	جنوری ۱۹۳۸ء	جلد ۸

ملاحظات

خداوندا! مجھے تیری بے نہایت کرم گستری کا اعتراف ہے، تو نے میرے ضعیف دل میں قوت ودیعت فرماکر میرے دست مرتعش کو تقویت دے کر اور میرے پائے لغزیدہ میں ثابت قدمی کی روح رواں کرکے "شاہکار" کو آٹھویں سال کی پہلی منزل تک بار یاب کردیا، یہ تیری بندہ نوازی ہے — محض تیری! ورنہ مجھ ایسا بے بضاعت غیر ادبی ماحول اور غیر کاروباری مقام سے "شاہکار" کی صورت میں علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی اور اقتصادی خدمات کیسے بجالاتا، کتابت، طباعت اور نشرواشاعت کے علاوہ اکثر ضروریاتِ ادارت کی پے در پے مشکلات اور شدید ترین زلزلوں پر کیونکر قابو پاتا — اگر تیری قابل نیائش دستگیریاں شامل حال نہ ہو جاتیں —

ہاں اے میرے پروردگار! میں تیرا شکر بجالاتا ہوں، تو نے میری حقیر مساعی اور بے حقیقت کاوشوں کو سہارا دے کر شاندار اور ہر صوری و معنوی حیثیت سے دیدہ زیب سالنامہ شائع کرنے میں کامیاب فرمایا۔

میں اپنی اس عظیم الشان کامیابی پر سپاس ختم کرتا ہوں کہ شاہکار کا سرورق جذب و کشش میں لاجواب اور جدت و ندرت میں بے مثل ہونے کے علاوہ اتنا دلفریب اور معنویت بردوش ہے کہ روبرو آتے ہی اہل ذوق کی نگاہ پڑتی اور ہٹنے کا نام نہیں لیتی

اسمیں کوئی حیرت ہے نہ استعجاب ــ علمی دنیا میں اہم ترین مرتبہ رکھنے والے مشاہیر جس مجموعے یا مرقعے کو زینت بخشیں اور اسکے وسط میں بطور صدر

عالی جناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاؔد دام اقبالہٗ

رونق افروز ہوں اس کی جھلک پاکر کون سی آنکھ ہے جو مشتاق نظارہ نہ ہو اور کون سا دل ہے جو کیف و مسرت سے مخمور نہ ہو جائے ــ گو اس اہم مرقعے کو جن اکابر کی تصویروں سے مزین کرنے کی تجویز ممبران انتظامیہ شاہکار نے بالاتفاق پاس کی تھی، بار بار اعلان کرنے پر بھی کئی باکمال ادبا اور شعرا نے اپنی تصویروں سے محروم رکھ کر ہمیں صرف اکتالیس تصویروں سے مصور کرنے پر مجبور رکھا ــ اس قابل افسوس کمی کے باوجود بھی اس سرورق کو آج جس ذوق و شوق اور جتنی عزت و عظمت سے دیکھا، کل اس میں اضافہ ہوگا، پرسوں اور اضافہ ہو جائے گا بالآخر جوں جوں زمانہ اور جس قدر صدیاں گزرتی جائیں گی اسی نسبت سے اس کی قدر و منزلت بڑھتی جائے گی اور تاریخی حیثیت سے تو ہمیشگی کی لازوال زندگی حاصل ہوگی۔

سالنامہ کی غزلیات تبرکات کے زیر عنوان آپ چند نادر غزلیں ملاحظہ کریں گے، جن میں یادگار شاہان مغلیہ جناب شاہزادہ خضر سلطان، جناب حضور بلگرامی، جناب شاؔد عظیم آبادی اور جناب بیدار کی غزلیں ہیں ــ مرحومین کی یہ غیر مطبوعہ اور قابل قدر و قیمت چیزیں کن کاوشوں سے حاصل ہوئیں اُسے نظر انداز کیجئے اور ان نوادرات کو نگاہ قدر و منزلت سے دیکھئے۔ انکے علاوہ عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی غزل جو آپ ہی کی شامل ہے اسکے بعد دور حاضر کے دوسرے باکمال شعرا کے افکار تازہ سے لطف اندوز ہوجئے ــ پہلی غزل جناب علامہ ابوالعلا حکیم ناطق لکھنوی کی ہے، مملکت سخن میں آپ کے نام نامی سے باوجود عدم شہرت پسندی کے کون واقف نہیں، آپ کے بلند پایہ محقق اور مسلم الثبوت شاعر ہونے کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ عزیز لکھنوی مرحوم ایسے کئی مشاہیر اساتذہ کے مجموعے آپ کی مشاورت اور اصلاح بغیر زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکے پھر منکسرانہ کردار کا یہ عالم کہ ایسی ایسی اصلاحوں پر فخر و مباہات تو بڑی بات ہے، ان کا ذکر ہی مکروہ سمجھا اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے والوں کو بھی اس نوع کے اوچھے تذکروں سے بارہا منع فرمایا۔

دوسری اہم ترین غزلیات میں تاجدار سخن جناب خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر کلکٹر، حضرت مولانا صفی لکھنوی، حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی، مولانا آسی، جناب حافظ غازی پوری اور حضرت جگر مراد آبادی کی غزلیں ہیں جن کا ایک ایک شعر کمال صوری و جمال معنوی کا آئینہ دار اور بیش بہا جواہر پاروں کا مجموعہ ہے۔

نظمیات میں پہلے ہی شاعر انقلاب جناب جوش کی نظم "سچی نگاہیں" محبت کے لطیف مشاہدات کا دلفریب البم ہے۔ اس کے بعد لطف مطالعہ کو دوآتشہ کرنے کے لئے شاعر شباب فطرت واسطی کی نظم رومان آفرینی اور جذبات نگاری کا قابل رشک مرقع ہے اس کے بعد آپ کے کیف و لذات کا قیام ملک کے مایہ ناز نظم نگار حضرت ماہر القادری، حضرت ضیا فتح آبادی ایم اے، حضرت مسیح بنارسی، حضرت مانی جائسی، حضرت بسمل الہ آبادی اور حضرت مولانا ثاقب کانپوری کی روح پرور اور غیر فانی نظموں کے

مطالعہ پر منحصر ہے۔

مضامین زیر نظر سالنامہ میں حصۂ نظم آپ اپنی مثال ہے تو حصۂ نثر بھی اپنی معیاری بلندیوں اور علمی و ادبی رفعتوں کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ جناب پروفیسر سید اعجاز حسین ایم اے کا مضمون بعنوان "جدید اردو نثر کے رجحانات" کافی مطول ہے، عرق ریزی سے لکھا گیا ہے اور بہت ہی پر مغز مضمون ہے۔

جناب عطاء اللہ پالوی نے بھی "اردو زبان کے ناقدان ادب" کے لکھنے میں کافی محنت کافی توجہ اور بہت کچھ حسن عقیدت سے کام لیا ہے۔

مشہور فسانہ نگار پروفیسر مجنوں گورکھپوری ایم اے نے "تہذیب افادی الاقتصادی" لکھ کر ادبی قدردانی کا ثبوت دیا ہے، کاش دوسرے فاضل ادبا جنت نشیں خادمان ادب کے کارناموں کو سراہنے میں بھی وقتاً فوقتاً اپنے اپنے بیش بہا لمحات نذر کرتے رہیں۔

جناب مولانا خیر بہوروی نے "ایک علمی حقیقت کا انکشاف" بہت خوب لکھا ہے، مزید براں آپ نے کئی عکسی تحریریں اور دوسری قابل قدر تحریریں سالنامہ کے لئے مہیا کر کے شاہکار نوازی فرمائی ہے۔

جناب قاضی تلمذ حسین ایم اے کا "تعداد خاتون" یقین ہے کہ اہل علم کی توجہ کو اپنی جانب جذب کرے گا ——— یہ ایک اہم تاریخی مضمون ہونے کے علاوہ دلچسپی اور ایک نوع کی ندرت کا حامل ہے ——— آپ دارالترجمہ حیدرآباد کے رکن خصوصی ہیں، آپ نے زندگی غیر شہرت پسندی اور خاموشی سے علمی خدمات میں صرف کر دی ہے اور شاہکار کے حقیقی ہمدرد و سرپرست ہیں۔

حضرت ماہر القادری کا مضمون "بزم کا عروج و زوال" جمالیت، شعریت اور کیف و لذات کا مجموعہ ہے، آپ یکہ وقت مشہور ادیب ہیں اور کامیاب شاعر بھی۔

ادیب اعظم حضرت نیاز فتحپوری اپنے رسالہ "نگار" میں اس درجہ منہمک رہتے ہیں کہ آپ کا مضمون کسی دوسرے رسالہ میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے ——— ہمیں مسرت ہے کہ "صنمیات ہند" عنایت فرما کر آپ نے شاہکار نوازی کا تحریری ثبوت دیا ہے "صنمیات ہند" کی نسبت صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ یہ آپ کے مخصوص رنگ کا ایک اہم اور تحقیقی مضمون ہے۔

انتظامیہ کمیٹی شاہکار کے رکن رکین جناب مولوی سید رضوان اللہ بی، ایس، سی، ال، بی، ایم، ال، ملے رئیس اعظم گورکھپور نے "فلسفہ سیاسیات کا ایک رخ" ارقام فرما کر اردو ادب میں ایک ایسا قابل قدر اضافہ کیا ہے کہ ادب اردو کو آپ کا ممنون ہونا چاہیے، آپ شاہکار کے بنیادی محرک اور روح رواں ہیں، کاش آپ کو قومی اور ملکی خدمتوں سے ادبی خدمات کیلئے کچھ اور فرصت ملتی رہتی۔

میرے ذمہ شاہکار کی جو اہم ذمہ داریاں ہیں ان کا اندازہ کچھ وہی خوب کر سکتے ہیں جنھوں نے صحافتی دنیا میں کسی رسالہ کو ابتدائی حالت سے قابل رشک بلندیوں تک پہونچانے میں کامیابی حاصل کی ہو، بہرکیف میں نے طے کر لیا ہے کہ اردو کی خدمت کیلئے زندہ رہونگا اور اردو ہی کے لئے تمام قوتیں صرف کرتے کرتے داعی اجل کو لبیک کہہ دونگا ——— اگر یہ خیال نہ ہوتا تو اتنی مصروفیت کے باوجود قارئین شاہکار کی خاطر بہ یک وقت چار چار مضامین کیسے لکھتا۔ خوش ہوں کہ اہل نظر اپنی قدردانیوں سے میری کاوشوں کا صلہ دیتے

ہیں اور شاہکار کو آسمان ترقی پر آفتاب کی مانند ضوفشاں کرنے میں اعانت فرماتے ہیں -

افسانے اس نمبر میں افسانے بھی اس پایہ کے شائع ہو رہے ہیں کہ بعنوان محاسن سالنامہ کا وقار یہاں بھی ممتاز و سربلند ہے ہم جناب وسیم کے ممنون ہیں۔ آپ نے "روزلی" افسانہ اور "چاندی کے شمعدان" ڈرامہ لکھکر سالنامہ کی ادبی دلچسپیوں کو دوبالا کردیا ہے اور ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ دونوں چیزیں اوریجنل معلوم ہوتی ہیں -

مملکت ادب کے عالی مرتبہ ادیب جناب پروفیسر زور ایم اے، پی، ایچ، ڈی کے مختصر افسانہ کی مختصر تعریف ہے کہ ایسی ہی چیزیں موتیوں سے تولنے کے قابل ہوا کرتی ہیں۔

صاحب حدیث حسن فطرت واسطی کا نفسیاتی افسانہ "کمزوری تیرا نام عورت ہے" دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ آپ جس چیز پر قلم اٹھاتے ہیں۔ جذبات انسانی اور کیفیات قلبی کا آئینہ پیش کر دیتے ہیں۔

شاہکار کے آرٹسٹ مسٹر عبدالمجید خاں کی مکمل مصوری اور دلکش نقاشی کی شہادت دینے کیلئے سالنامہ کے سرورق کی تصویریں، پس پشت کے مناظر اور اسکے کل نقش و نگار کافی ہیں -

سالنامہ کی تکمیل کیلئے ہمارا الہ آباد کا سفر بہت کامیاب سفر تھا، سب سے پہلے ہمیں رئیس اعظم، خان بہادر آنریبل جسٹس مولوی محمد اسماعیل بار ایٹ لا، سے نیاز حاصل کرنے اور اس عظیم الشان ہستی کی مکلف میز پر دعوت قبول کرنیکا فخر حاصل ہوا، زیر نظر سالنامہ کیمتعلق آپنے انفاق ذوق کرتے ہوئے جو قابل قدر ہمدردیاں فرمائیں وہ ناقابل فراموش ہیں —— اسکے بعد جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پروفیسر سے ملنے میں جو کیف مسرت حاصل ہوا اسے موصوف کے معزز مہمان جناب مولوی عبدالحق بی اے سکریٹری انجمن ترقی اردو کی ملاقات نے دو آتشہ کردیا۔ جناب ڈاکٹر ولی اللہ سے بڑی پرلطف ملاقات ہوئی - بجائے ملاقات کو کتب خانہ کہوں یا قانون خانے سے تعبیر کروں آپ بے شمار ضخیم کتابوں کے سایہ میں محو تحریر تھے، دو معصوم پیارے پیارے بچے دو قلم اور دو دواتیں لیجاکر لکھنے کا کھیل کھیلنے کیلئے ضد کر رہے تھے کھیل کا سامان دینے سے تو انکار نہ تھا صرف اندیشہ یہ تھا کہ بچے اپنے خوشنما لباس، اور رنگین قالینو کو روشنائی سے اور بھی رنگین نہ کردیں - بہرکیف آپ نے کافی شاہکار نوازی فرمائی -

اسی دن ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ مختصر ملاقات اور خفیف تبادلہ خیالات کے باوجود اندازہ ہوگیا کہ موصوف کی روشن خیالی، اصابت رائے اور مشرقی علوم کا بلند پایہ مذاق بھی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے آپ کو ہمعصروں میں ممتاز کردیا ہے -

آخری روز رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کی رشک ارم کوٹھی میں، ان کے اعلیٰ اخلاق سے لطف اٹھایا اور موصوف کی شہرہ آفاق ادب نوازی سے بہت محظوظ ہوا۔

سالنامہ میں ان اکابر کی تصویریں ہیں جو شاہکار سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اس کی قدر کرتے اور امکانی دردمندی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں — ان تصویروں کی ترتیب میں کوئی التزام نہیں ملحوظ رکھا گیا ہے - —— جناب صاحبزادہ نواب سید علی کبیر صاحب وغیرہ کے مضامین بیحد تاخیر سے موصول ہوئے اسلئے ان پر آئندہ پرچے میں اظہار خیال کیا جائیگا۔

حکیم عارف بلگرامی

ارشادات عالیہ

تاجدار سخن علامہ ابو العلا ناطق لکھنوی

اُف ترا ابہام تبسم اُف تری انگڑائیاں
بڑھ گئیں قلب و جگر کے زخم کی گہرائیاں

ہر خراش دل میں ہے نقش و نگار ہوشاں
یہ جنوں انگیزیاں یہ انجمن آرائیاں

راہ کی دلچسپیوں سے راہ منزل طے ہوئی
کیا فریب حسن نے کیں حوصلہ افزائیاں

اب تصور حسن کا شاید کہ ہو صورت پذیر
بند آنکھوں کو نظر آنے لگیں پرچھائیاں

کچھ تو اطمینان ہے انکو حیات عشق پر
ورنہ اک بیمار سے اور اتنی بے پروائیاں

انتظار دوست میں ناطق ہے عالم حشر کا
آج وصل و ہجر میں ہیں معرکہ آرائیاں

خاص سالنامہ کے لیے

جذباتِ عالیہ

(حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی)

نہ گھبرا بھید اگر اس کا نمایاں ہو نہیں سکتا
اسے یہ بھی تو عرفاں ہے کہ عرفاں ہو نہیں سکتا

میں تنہا آب و رنگِ بزمِ امکاں ہو نہیں سکتا
یہ دل واپس اگر تو اس میں مہماں ہو نہیں سکتا

یہاں ہر جزو میں بھر دی گئی ہیں قوتیں کل کی
وہ ذرہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا

معاذ اللہ کمالِ علمِ ہستی کی یہ غایت ہے
کہ انساں واقفِ انجامِ انساں ہو نہیں سکتا

مجھے حیراں نہ کر ہاں میری صورت سے عیاں ہو جا
میں آئینہ تو بن سکتا ہوں حیراں ہو نہیں سکتا

نہیں اک لفظ ایسا دفترِ کونین میں کوئی
جو میری داستانِ دل کا عنواں ہو نہیں سکتا

الٹ دے دل کو بھی جب دل کے سب پردے الٹ جائیں
اسے بھی کر نمایاں جو نمایاں ہو نہیں سکتا

شکستِ عالمِ گل ہے تو ہو گی بارشِ گل بھی
وہ ہو مایوس جو خاکِ گلستاں ہو نہیں سکتا

وہاں لائی ہے حرصِ آدمیت منفعل کرنے
جہاں صدیوں میں پیدا ایک انساں ہو نہیں سکتا

امیدیں کچھ محبت کی ہیں، کچھ ہیں حسن کے وعدے
ابھی شیرازۂ عالم پریشاں ہو نہیں سکتا

محبت کی بلند انجامیوں کا کیا ٹھکانہ ہے
فرشتہ بھی شریکِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا

نمودِ گل سے خاکِ گل تک اک دنیا بدلتی ہے
شمارِ انقلاباتِ گلستاں ہو نہیں سکتا

مذاقِ ضبط و قیدِ جبر سے مجبور ہوں اتنا
کہ باوصفِ پریشانی پریشاں ہو نہیں سکتا

سنا اے چپکے چپکے دیکھ کے پردے کھینچنے والے
تری حد خودی تک وہ نمایاں ہو نہیں سکتا

خدا اور ناخدا مل کر ڈبو دیں یہ تو ممکن ہے
مری وجہِ تباہی صرف طوفاں ہو نہیں سکتا

دعا جائز، خدا برحق، مگر مانگوں تو کیا مانگوں؟
سمجھتا ہوں کہ میں دنیا بداماں ہو نہیں سکتا

جوانی بھی گئی سیماب فصلِ گلفشانی بھی
میں اب تا دیر محفل میں غزلخواں ہو نہیں سکتا

خاص شاہکار کے لئے

ارشادات آسی

مصور درد حضرت عبدالباری آسی

گوشۂ امن غم دہر سے پانے کیلئے
جان ہی ہم نے فقط جان بچانے کیلئے

مجھ پہ تیار ہیں سب اشک بہانے کیلئے
مشترک درد ہوں میں سارے زمانے کیلئے

تو یونہی خوش ہے تو اے خانہ برانداز چمن
آشیاں اور بنا دینگے جلانے کیلئے

ہائے یہ بیکسی رشک یہ مایوسی غم
ہم ہیں ان کیلئے وہ سارے زمانے کیلئے

گھر گئی حسن خیالات میں صورت تیری
آ گئی تھی نقش دوئی دل سے مٹانے کیلئے

عشق تعظیم طلب ہو کے نہ رہ جائے کہیں
تم نہ اٹھو مجھے محفل سے اٹھانے کیلئے

ہم مٹیں گے تو ہمیشہ کو مٹیں گے آسی
اور ہیں جنکو مٹاتے ہیں بنانے کیلئے

خاص شاہکار کے لئے

جذبات عالیہ

(حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی)

نہ گھبرا بھید اگر اس کا نمایاں ہو نہیں سکتا / اسے یہ بھی تو عرفاں ہے کہ عرفاں ہو نہیں سکتا
میں تنہا آب و رنگ بزم امکاں ہو نہیں سکتا / یہ دل واپس! اگر تو اس میں مہماں ہو نہیں سکتا
یہاں ہر جزو میں بھر دی گئی ہیں قوتیں کل کی / وہ ذرہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا
معاذ اللہ کمال علم ہستی کی یہ غایت ہے / کہ انساں واقف انجام انساں ہو نہیں سکتا
مجھے حیراں نہ کر ہاں میری صورت سے عیاں ہو جا / میں آئینہ تو بن سکتا ہوں حیراں ہو نہیں سکتا
نہیں اک لفظ ایسا دفتر کونین میں کوئی / جو میری داستان دل کا عنواں ہو نہیں سکتا
الٹ دے دل کو بھی جب دل کے سب پردے الٹ جائیں / اسے بھی کر نمایاں، جو نمایاں ہو نہیں سکتا
شکستہ عالم گل ہے تو ہو گی بارش گل بھی / وہ ہو مایوس جو خاک گلستاں ہو نہیں سکتا
وہاں لائی ہے حرص آدمیت منفعل کرنے / جہاں صدیوں میں پیدا ایک انساں ہو نہیں سکتا
امیدیں کچھ محبت کی ہیں، کچھ ہیں حسن کے وعدے / ابھی شیرازہ عالم پریشاں ہو نہیں سکتا
محبت کی بلند انجامیوں کا کیا ٹھکانہ ہے / فرشتہ بھی شریک درد انساں ہو نہیں سکتا
نمود گل سے خاک گل تک اک دنیا بدلتی ہے / شمار انقلابات گلستاں ہو نہیں سکتا
مذاق ضبط و قید جبر سے مجبور ہوں اتنا / کہ باوصف پریشانی، پریشاں ہو نہیں سکتا
سنا، اے چھپ کے جلوے دیکھ پردے کھینچنے والے / تری حد خودی تک وہ نمایاں ہو نہیں سکتا
خدا اور ناخدا مل کر ڈبو دیں یہ تو ممکن ہے / مری وجہ تباہی صرف طوفاں ہو نہیں سکتا
دعا جائز، خدا برحق، مگر مانگوں تو کیا مانگوں؟ / سمجھتا ہوں کہ میں دنیا بداماں ہو نہیں سکتا

خاص نگار کے لئے

جوانی بھی گئی سیماب فصل گلفشانی بھی
میں اب تا دیر محفل میں غزلخواں ہو نہیں سکتا

ارشادات آسی

مصور درد حضرت عبدالباری آسی

گوشہ امن غم دہر سے پانے کیلئے — جان ہی ہم نے فقط جان بچانے کیلئے
مجھ پہ تیار ہیں سب اشک بہانے کیلئے — مشترک درد ہوں سارے زمانے کیلئے
تو یونہی خوش ہے تو اے خانہ برانداز چمن — آشیاں اور بنا دینگے جلانے کیلئے
ہائے یہ بیکسی رشک یہ مایوسی غم — ہم ہیں ان کیلئے وہ سارے زمانے کیلئے
گھر گئی حشر خیالات میں صورت تیری — آئی تھی نقش دوئی دل سے مٹانے کیلئے
عشق تعظیم طلب ہو کے نہ ہو جائے کہیں — تم نہ اٹھو مجھے محفل سے اٹھانے کیلئے

ہم مٹیں گے تو ہمیشہ کو مٹیں گے آسی
اور ہیں جنکو مٹاتے ہیں بنانے کیلئے

خاص شاہکار کے لئے

موجودہ اردو نثر کے رجحانات

(از پروفیسر سید اعجاز حسین - الہ آباد یونیورسٹی)

آج پھر وہی ذہنی کشمکش ہے جو ایک سال پہلے جدید اردو شاعری[1] پر قلم اٹھاتے وقت ہوئی تھی یعنی پھر یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ موجودہ اردو نثر کی آغاز کا تعین کس زمانہ سے کیا جائے۔ اگر اس کا فیصلہ طرز تحریر پر رکھا جائے تو میر امن فورٹ ولیم کالج سے اپنی پیشوائی کی سند میں "باغ و بہار" پیش کرتے ہیں اور ان کے رفیق کار ایک جتھا بنا کر کسی کو آگے بڑھنے نہیں دیتے اگر موضوع کی نوعیت کے اعتبار کو معیار قرار دیا جائے تو اس کو بھی سوچنا پڑے گا کہ غدر کے پہلے جو علمی ذخیرہ وجود میں آچکا تھا اس کو کس طرح نظر انداز کیا جائے اور ذہن شاید کوئی حل نہ پیش کر سکے گا۔

اگر ان دونوں شرطوں کو یعنی طرز نگارش اور تنوع موضوع کو ایک جگہ کرکے ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو البتہ اس فیصلہ میں کافی مدد ملتی ہے یعنی اگر ہم یہ دیکھیں کہ سادگی کے ساتھ عبارت آرائی اور مختلف مضامین کی کثرت و مقبولیت کس زمانہ میں ہوئی اور مستقل طور پر یہ روِیہ کب سے شروع ہوا اور اس زمانہ کو سنگ بنیاد بنا لیں تو ممکن ہے کسی قرین قیاس و قابل قبول نتیجہ پر پہونچ سکیں۔ اس لحاظ سے سرسید اور ان کے رفقا سب سے پہلے ہمارے سامنے آتے ہیں جو تہذیب الاخلاق کی صورت میں ہمیشہ کے لئے ایک خاص کارنامہ چھوڑ گئے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ دور جدید کے بانی یہی لوگ تھے اور اسی عہد سے اس کی ابتدا ہونی چاہئے مگر ذرا سختی سے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ سرسید اور ان کے رفقا کے طرز تحریر میں کہیں کہیں پرانی روش کی جھلک آجاتی ہے۔ مقفیٰ عبارت بھی نظر آتی ہے اور گلابی اردو کا بھی رنگ آجاتا ہے۔ اگر ان باتوں کو آپ قابل غور سمجھتے ہیں تو پھر محمد حسین آزاد کے علاوہ اور کوئی دوسرا اس میدان میں نہیں آتا یہ اور ان کے ہمعصر حالی و شبلی وغیرہ کا زمانہ اردو نثر نویسی کا دور جدید کہا جا سکتا ہے۔ طرز تحریر کے اعتبار سے بھی اور تنوع مضامین کے لحاظ سے بھی ان بزرگوں نے ندرت و کثرت کا انبار لگا دیا اور ایسے راستے دکھا دئے جو اس سے پہلے مشکل سے دکھائی دئے تھے مضمون کے لحاظ سے رمزیہ، تنقید، تاریخ، علم کلام، سوانحعمری وغیرہ سب کچھ آگئے اور طرز بیان کے اعتبار سے صفائی، سادگی، زور، جوش، بیباکی، استدلال، متانت، علمیت، تاثیر اور سب سے بڑھ کر واقعیت۔ کچھ اس انداز سے یہ حضرات لے آئے کہ اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے بعد اردو میں اس پایہ کے نثر نویس آج تک نہ پیدا ہو سکے۔ ان حضرات کو ہم دور جدید کا بانی سمجھ کر مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید نثر کی ابتدا آزاد ہی کے زمانہ سے کیجائے لیکن چونکہ اس وقت ہمارا موضوع موجودہ اردو نثر ہے

[1] مطبوعہ ادبی دنیا لاہور - نیسان الہ آباد

اس لئے بہتر ہوگا کہ ہم مولانا شبلی کے بعد سے اس کا آغاز کریں۔

مولانا کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جو سیاسی و معاشرتی لحاظ سے تمام دنیا پر تیز اثر ڈال رہا تھا جنگ عظیم کئی اعتبار سے صرف یورپ نہیں بلکہ ایشیا و افریقہ سب کو گھائل کئے ہوئے تھی۔ ہندوستان پر بھی خاطر خواہ اثر پڑ رہا تھا نئے خیالات نئے الفاظ۔ نئی طرز معاشرت۔ نیا ادب تیزی کے ساتھ بیک وقت آ رہے تھے اردو فطرتاً اثر لینے پر مجبور تھی جن موضوعات نے اس وقت اردو کے رجحان پر خاص طور سے اثر ڈالا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) صحافت (۲) ناول (۳) مختصر افسانہ (۴) ڈراما (۵) تنقید و تاریخ ادب (۶) علمی تحریریں (۷) خطوط (۸) مضمون نگاری (Essays) (۹) سائنس

صحافت

دنیا سے وابستہ و واقف رہنے کی خواہش اس سے پہلے ہی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو چلی تھی جنگ عظیم کی سرگرمی اور انقلاب کی رفتار نے اس کو اور تیز کر دیا اردو اخباروں کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی روزانہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ، مختلف مدت کے جرائد ظہور میں آئے لیکن بہت کم ان میں ایسے تھے جو زیادہ دن تک زندہ رہ سکے یا قابل قدر ایڈیٹروں کی خدمات حاصل کر سکے۔ ہمارے اخباروں کا مذاق عموماً اتنا نہ بلند ہو سکا جتنا چاہیے تھا۔ اس کمی کی وجہ کچھ مالی دقتیں تھیں اور کچھ حسب ضرورت قابلیت کی کمی تھی۔ مالی دقتوں کی وجہ سے خبر رسانی کے وسائل براہ راست غریبوں کو ہاتھ نہ آ سکے زیادہ تر انگریزی اخباروں کا ترجمہ کرتے رہے اور اس خیال سے کہ خبر باسی نہ ہو۔ ترجمہ کی عجلت نے بے عنوانیوں کو بھی جگہ دی ایسے الفاظ بھی آ گئے مثلاً سنسنی خیز خبر۔

اس میں شک نہیں کہ ان اخباروں نے سیاسی و انقلابی دور سے ایک دنیا کو روشناس کرا دیا وہ لوگ جو اب تک جنگ و جغرافیہ سیاسی حکمت عملی کی تفصیلات سے نابلد تھے اب معلومات کے ساتھ دلچسپی و ہمدردی قوت فیصلہ کے احساس کی جھلک اب اپنے اندر پانے لگے۔ کچھ یہ بھی سمجھ میں آنے لگا کہ دنیا کی قومیں ایک دوسرے سے کس طرح وابستہ ہیں۔ ایک ملک کی بربادی یا عروج سے دوسرے ملکوں پر کیا اثر پڑتا ہے اور کیوں پڑتا ہے۔ قومیں کس طرح ترقی کرتی ہیں کیسے غلام بنتی ہیں۔ ان اخباروں نے لوگوں کی ذہنیت کو ہندوستانی سیاسیات و ملکی انتظام کی طرف مائل کرنے میں کافی اعانت کی متعدد نئے الفاظ و جملے جو لڑائی کے سلسلہ میں آتے تھے فوراً ان کا ترجمہ اردو داں طبقہ تک پہونچا دیتے تھے مثلاً آبدوز کشتیاں، طیارہ، لاسلکی وغیرہ۔

ایڈیٹروں و نامہ نگاروں کے علمی تحریک کی کمی رائے عامہ کو کسی ایک جانب نہ لا سکی بین الاقوامی سیاسیات پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے وہ عموماً فرقہ داری اور محدود قوم پرستی کے جھگڑوں میں پڑ کر رہ گئے۔ ترقی کے نئے راستوں پر لانے کی سعی پیہم کو عمل میں نہ لا سکے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خیالی سماں تو پیدا کر دیا ایک بیداری سی تو آ گئی لوگ بے خبری سے الگ تو ہوئے لیکن یہ نہ معلوم کر سکے کہ کرنا کیا چاہیے۔ ہمارا مستقبل کس طرح سے درست ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ علمی مشغلہ

کسی حد تک یہ تمام کاوشیں آکر ختم ہوگئیں۔ البتہ کچھ ایسے بھی ایڈیٹر اردو صحافت کو نصیب ہوگئے تھے جن کی قابلیت و معلومات، کردار، قوت عمل پر بجا ناز کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی، جالب، سجاد حسین، مولانا محمد علی، عبدالماجد دریاآبادی، شبیر حسین قتیل وغیرہ۔

اخباروں میں سب سے زیادہ جس نے اردو کی ذہنیت پر اثر ڈالا وہ ابوالکلام آزاد کا "الہلال" تھا۔ آزاد کی طرز نگارش عالمانہ تھی۔ عربی و فارسی کے ادق الفاظ اسلوب میں تصنع کے ساتھ ساتھ روانی اور آورد اس طرح سے ایک جگہ آگئے تھے کہ زور و جامعیت کا غلبہ ہوگیا اور پھر اس پر اخبار کے گوناں گوں مسائل کا نئے انداز سے بیان ہوجانا دفعتاً دلکشی کا باعث ہوگیا۔ مولانا کی سحر نگاری نے بہت جلد لوگوں کی ذہنیت پر قبضہ کرلیا کرنے کو تو لوگوں نے تتبع کی کوشش کی مگر اس میدان میں کوئی ٹھہر نہ سکا لیکن اردو ادب میں مشکل پسندی کی لہر پھر دوڑنے لگی اور مٹتا ہوا اثر اب تک نظر آجاتا ہے بقول مولانا سلیمان ندوی کے "کہ الہلال کا جادو جو ہم پر چل چکا ہے اس کا اثر جاتے جاتے جائیگا۔

ہمدرد، زمیندار، ہمدم، مدینہ، سرفراز تھے یا ہیں جنھوں نے ادب ملک اور صحافت کی کافی خدمت کی۔ ان اخباروں کی پالیسی کا تذکرہ کرنا ہمارے موضوع سے بہت کم سروکار رکھتا ہے اس لئے صرف اتنا کہکر ہم آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ جیسے دنیا کے اور اخبارات کبھی ترقی پسند، کبھی فرقہ پسند اور کبھی رجعت پسند ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے اخبار بھی تھے یا ہیں۔ کوئی کسی پارٹی کا نمایندہ ہے کوئی کسی طبقہ سے متوسل ہے کوئی بے لوث بھی ہے غرضکہ مختلف اصول سے کام ہوتا رہتا ہے۔

رسائل صحافت سے ملی ہوئی ایک دوسری ادبی چیز اسی زمانہ میں تیزی کے ساتھ نمودار ہوئی۔ رسائل کا وجود تو عرصے سے قائم تھا اور بعض بعض خوبی سے چل بھی رہے تھے مگر اس عہد میں تعداد اور گوناں گوں دلچسپیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ تعداد کے اعتبار سے پنجاب کا مقابلہ کوئی دوسرا صوبہ نہیں کرسکا۔ دوسرے صوبوں سے بھی رسائل نکلے مگر اتنے نہیں۔ اہل پنجاب نے تصویر، طباعت و اشاعت سب میں نمبر بڑھادیا اور زبان کی قابل رشک خدمت کی۔

رسالوں میں زیادہ تر غلبہ افسانوں کا ہوتا ہے۔ کم حصہ نقد و تبصرہ و علمی مسائل کو دیا جاتا ہے۔ اچھے لکھنے والے ہمیشہ کم ہوتے ہیں اور رسالوں کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہر کس و ناکس کو جس میں ذرا بھی صلاحیت ہے اہل رسالہ مضمون لکھنے پر ایک طرح سے مجبور کرتے ہیں ایسی صورت میں معیار تو بلند نہیں ہوسکا البتہ کچھ لکھنے والے ضرور اچھے پیدا ہوگئے جو ممکن ہے آیندہ کسی خاص شہرت کے مالک ہوسکیں۔ رسالوں کی کثرت سے یہ بھی زبان کو فائدہ پہونچا کہ نئے نئے ادیبوں سے ملک کو روشناس ہونے کا موقع مل گیا اور کلام (خواہ نثر ہو یا نظم) میں اگرچہ خوبی نظر آئی رسالوں کے ذریعہ سے ہمت افزائی بھی ہوسکی ورنہ ممکن تھا کہ کتابی صورت میں کلام شائع ہونے سے پہلے وہ بجائے بام ترقی پر آنے کے اپنے گردوپیش کی ناقدری سے قعر گمنامی میں ہمیشہ کے لئے غرق

ہو جاتے اور ایسی صورت میں اگر کوئی ان کا قدرداں قریب نہیں ملتا تو رسالے دوسرں گوشوں سے جوہری پیدا کر دیتے ہیں

موجودہ دور میں رسالوں نے ایک اور بھی قابل قدر کام شروع کر دیا ہے دوسری زبانوں کے ممتاز ادیبوں کے بعض عمدہ خیالات کا ترجمہ اپنی زبان میں پیش کرتے ہیں جس سے نئے طرز تخیل و تحریر کا اندازہ و اضافہ ہوتا ہے - اس قسم کے خیالات آج کل ہندوستانیوں میں زیادہ ٹیگور کے کلام سے لئے جاتے ہیں جو عموماً ادب لطیف کے نام سے شائع ہوتے رہتے ہیں- اس سے نئے طرز تحریر اور بلندیٔ خیال دونوں کو فائدہ ہونچتا رہتا ہے - کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ جرمن و اطالوی و نیز دوسری زبانوں کے مختلف بحروں کے نمونے ہمارے رسالے دلکشی و ترقی کا سامان سمجھ کر پیش کرتے رہتے ہیں - علمی خبروں کے ضمن میں اکثر علمی معلومات - جغرافیائی حالات تاریخی واقعات اور کبھی کبھی معاشرتی زندگی اور مذہبی مسائل پر بھی بحث ہوتی ہے جو عموماً پُر از معلومات و دلچسپ بھی ہوتی ہیں ایسی چیزوں کا ماخذ بیشتر مغربی ادب ہوتا ہے - "اردو" رسالہ کبھی کبھی بادۂ کہن کے نام سے کچھ پرانے شعراء کا کلام جو زیادہ تر غیر مطبوعہ ہوتا ہے شائع کرتا ہے جس کی حیثیت کم از کم تبرک کی ضرور ہوتی ہے -

ہمارے رسالوں میں افسانہ نگاری کی خصوصیات میں سب سے نمایاں عنصر نفسیاتی تحلیل کا ہے - ہر ہونہار و کامیاب افسانہ نویس اپنی نگاہ نکتہ رس کا ذہنی مرکز فی الحال اسی کو سمجھ رہا ہے - کوشش کرتا ہے کہ کردار کے حرکات و سکنات سے جذبات و ماحول کی ترجمانی کی جائے - دوسری خصوصیت سماجی زندگی کا نقشہ پیش کرنا ہے اس میں بھی زیادہ حصہ غریبوں اور بیکاروں کی حالت کے متعلق ہوتا ہے - دیہات کی زندگی مزدوروں کی مفلسی - سماج کی مختلف دقتیں موجودہ دور میں کافی جگہ پا چکی ہیں - یہاں دونوں خصوصیات کے بانی غالباً منشی پریم چند ہیں انھوں نے جس خوبصورتی و کامیابی کے ساتھ ان چیزوں کو پیش کیا ہے اس پر ابھی کوئی ترقی نہیں ہو سکی - کتابوں کو نظر انداز کر کے اس سلسلہ میں ان رسالوں سے جو لوگ ہم کو اب تک کامیابی کے ساتھ افسانہ کی دنیا میں قدم اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اعظم کریوی، اختر رائے پوری، احمد علی، علی سردار جعفری، احتشام ملی، طالب الہ آبادی، صادق الخیری، فضل حق قریشی، انصار ناصری وغیرہ ہیں -

رسالوں کے تنقیدی عنصر کا جہاں تک تعلق ہے وہ مقدار میں بہت کم ہے اور کامیاب انشا پردازوں کی تعداد میں بھی قلت محسوس ہو رہی ہے - ابتدائی دور میں ایک بڑی حد تک تو مغربی روشنی میں نقد و تبصرہ پیش ہوتا رہا مگر رفتہ رفتہ کسی قدر مزاج میں تبدیلی ہوئی مغرب و مشرق کی طرز معاشرت میں فرق خود ہی محسوس ہونے لگا - تنقید کے بنیادی اصول کو مرکز بنا کر طرز استدلال و طریقہ بیان میں ترمیم کی گئی اور ہماری تہذیب و تمیز ایشیائی کو زاویہ نگاہ سے بھی دیکھنا مناسب یا ضروری سمجھا جانے لگا - اس امتزاج نے کچھ زیادہ کار آمد باتیں نقد و تبصرہ کے میدان میں پیش کر دیں - رسالوں کی بدولت تنقید کا سرمایہ ترقی کے ساتھ بڑھ رہا ہے اور غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ارتقائی دور کامیابی کے ساتھ

طے ہو رہا ہے۔ مگر پھر بھی ابھی تنقید عالیہ کی بہت کمی ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اپنے بزرگوں سے یہ چیز ترکہ میں ہم کو نہیں ملی اگر ملی بھی تو نثر کے بجائے نظم کے بارے۔ تذکرہ نویسوں نے نقد و تبصرہ کے موقع پر اتنی مجمل رائے زنی کی ہے کہ جس کی انتہا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض وقت ان کا ایک جملہ ایسا ہوتا ہے کہ ذرا سوچنے پر شاعر کی مرکزی خصوصیات کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے، مگر تفصیل کی کمی نے اس فن کو نہ ابھرنے کا موقع دیا۔ اور نہ تشکیل کی کوئی صورت پیدا ہو سکی

موجودہ رسالوں میں تنقید کے دو رویے ہیں ایک تو یہ کہ کسی شاعر کے جستہ جستہ اشعار لے کر ان کی معنویت پر بحث کر دی گئی اور حسب استعداد و موقع اس کو نمایاں کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ شعر سے شاعر کا نظریہ بھی ایک قائم کر دیا جاتا ہے جو کبھی کبھی خطرہ سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ بعض وقت اسی شاعر کے دوسرے اشعار سے اس نظریہ کی تردید بھی ہو جاتی ہے۔ زیادہ تر نقاد اسی طرز تنقید کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس طریق کار کے رہبر غالباً ملک کے مشہور ادیب جعفر علی خاں صاحب اثر ہیں جن کو شعر کی معنویت پر مختلف زاویہ سے نگاہ ڈالنے میں کمال حاصل ہے۔ سخن فہمی و متانت ان کی طرز نگارش کے دو خاص جوہر ہیں اور ان کے کامیاب مقلد سید حامد حسن بلگرامی ہیں یہ طرز تنقید اب کسی قدر فرسودہ ہو چلی ہے غالباً زیادہ دن تک مقبول نہ رہ سکے۔

دوسرا رویہ یہ ہے کہ شاعر کے کلام کو پڑھ کر مجموعی اثر و کیفیت کے تحت میں دل و دماغ جو کچھ اس کے متعلق بیان کر سکیں کر دیا جائے مثال کے لئے جا بجا اشعار پیش کر دئے جائیں اور تب کلام کی قدر و قیمت پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی جائے۔ اس پیرایہ بیان میں تمام کلام کی بیک وقت خوبی یا خرابی پیش نظر ہو جانے کا زیادہ موقع ہوتا ہے اور اول الذکر میں عموماً پیش کردہ اشعار ہی پر رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ دوسرے اصول پر عمل کرنے والوں میں ممتاز ہستی۔ نیاز فتحپوری مجنوں گورکھپوری۔ محمد حسین ادیب۔ اختر رائے پوری۔ عبدالماجد دریاآبادی وغیرہ ہیں۔ حال ہی میں پروفیسر فراق نے اپنی کامیاب تنقید نگاری کا ثبوت بہت جلد دو ہی ایک مضمون میں دیا ہے۔ ملک کے اکثر ممتاز رسائل نے ان کی تنقید عالیہ کی داد دی۔ اگر ان کا قلم اس میدان میں بھی کام کرتا رہے تو یقیناً وہ کامیاب نقاد ہو سکتے ہیں۔ اس فہرست میں ان لوگوں کا نام نہیں لکھا گیا جو اس فن پر مستقل کتابیں لکھ چکے ہیں۔ نثر کے مضامین پر جو تنقیدیں ہوتی ہیں وہ عموماً نفس مضمون اور اجزائے ترکیبی کی بحث پر مبنی ہوتی ہیں۔ اسلوب بیان و اصطلاحات اور زندگی سے اس کے تعلقات وغیرہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

موجودہ دور میں ہم کو ان رسالوں کو بھی یاد رکھنا ہے جو کسی ایک شعبہ یا طبقہ کے متعلق اپنے کو وقف کئے ہیں مثلاً طب کے لئے "الحکیم"۔ "الطبیب" "الصحت" وغیرہ حالانکہ ان رسالوں میں ایسے بھی مضامین ہوتے ہیں جو حکیموں کے علاوہ بھی دوسرے لوگوں کے لئے باعث دلچسپی ہو سکیں مگر پھر بھی ان کی اشاعت محدود ہے۔ اسی طرح وہ رسالے بھی ہیں جو بچے اور مستورات کے لئے مخصوص ہیں جیسے بچوں کے لئے "پھول" "بچوں کی دنیا" "پیام تعلیم" "غنچہ" وغیرہ۔



اور عورتوں کے واسطے مستورات، سہیلی، عصمت وغیرہ۔

شعبہ جاتی رسالوں کی فہرست میں ہم ان رسالوں کو بھی اب نہیں بھول سکتے جن کے خاص موضوع سینما اور اس کے متعلقات ہیں۔ مثلاً فلمکار، سر پنچ فلم اڈیشن، سینما وغیرہ ان رسالوں کا معیار ابھی بلند نہیں ہوا۔ تنقیدی مضامین پست ہوتے ہیں۔ معلومات بھی زیادہ نہیں بہم پہونچاتے۔ اسی سلسلہ میں ان رسالوں کا ذکر نہ کرنا ایک سخت گناہ جو خالص تعلیمی ہیں۔ مثلاً "رہنمائے تعلیم" ایجوکیشنل گزٹ وغیرہ ان کا خاص موضوع تعلیم اور سررشتہ تعلیم پر رائے زنی کرنا ہے معلومات کا ذخیرہ بھی کافی بہم پہونچانے کی فکر کرتے ہیں۔ ان رسالوں کی خدمات اپنی جگہ پر نہایت قابل قدر ہیں۔ ان کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ اردو ادب میں وہ لٹریچر فراہم ہو رہا ہے جس کی اہمیت اور فائدہ رسانی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ اپنے ظرف ذوق و جنسیت کے لحاظ سے چیزوں سے دلچسپی لے۔ اور بالخصوص موضوع کو اپنی پسند کا مرکز بنالے یا ان کو دوسری چیزوں پر ترجیح دے۔ جتنا لطف بچوں کو اپنے رسالوں یا کتابوں میں آسکتا ہے اتنا دوسرے رسائل یا کتب سے نہیں آسکتا خواہ وہ ہمارے مذاق کی چیزوں کو دیکھ یا پڑھ سکنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس طریقہ سے ذہنی نشو و نما زیادہ خوبی و تیزی کے ساتھ ہوسکتی ہے بہ نسبت ان کتابوں اور رسالوں کے جو فطرتاً ان کے لئے کم مخصوص ہیں۔

ان رسالوں کی خدمات کے سلسلہ میں ان کے خاص نمبروں کا ذکر نہ کرنا ادبی فروگذاشت سے کم نہیں۔ سالنامے کے علاوہ خاص نمبر کبھی کبھی کسی مخصوص شاعر سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً نگار کا "مومن نمبر" "ظفر نمبر" نیرنگ خیال کا "اقبال نمبر" زمانہ کا "حالی نمبر" ایسے نمبروں میں اچھی خاصی کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ شاعر کے حالات و خصوصیات کلام کے اکثر پہلو روشن ہوجائیں۔ اس طرح پر ایک شخص کا کارنامہ نہ صرف ہم کو ایک جگہ ایک وقت نظر آجاتا ہے بلکہ نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر کسا ہوا مل جاتا ہے۔ عموماً مدیر ایسے موقع پر اپنی تمام کوشش صرف کرکے عمدہ سے عمدہ مضامین لکھنے اور لکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ طباعت و اشاعت کو بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا ان کو دیکھ کر بعض اخبار بھی اپنا کوئی خاص نمبر نکالنے کی کوشش کرنے لگے ہیں مثلاً سرفراز "رجب نمبر" رفیق "اثر نمبر" یہ تقلید کسی لحاظ سے بری نہیں کہی جاسکتی اس وجہ سے کہ کچھ نہ کچھ مواد ایک شخص کے متعلق ان میں بھی ایک جگہ مل جاتا ہے

رسائل و اخبارات کے ان تمام چیزوں پر نظر ڈالنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی نثر نویسی کا موجودہ رجحان ہر جہات ہے اور زبان کی خدمت میں کافی لوگ دلچسپی لے رہے ہیں اب یہ اور بات ہے کہ پڑھنے میں ابھی تک بہت کم لوگوں نے حصہ لیا ہے اور خریدنے میں تو اس سے بھی کہیں زیادہ بے توجہی کا ثبوت دیا جا رہا ہے۔ یہ بے اعتنائی مالی دقتوں سے نہیں بلکہ کفایت شعاری کے غلط معنی اور اپنی قابلیت کے غلط اندازہ پر زیادہ مبنی ہے۔

ناول

صحافت کے میدان سے گزر کر آئیے موجودہ دور کی ناولوں پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ اردو کے گھر میں ایک دروازہ سے 'داستان' کا جنازہ جا رہا تھا اور دوسری طرف سے ناول کی سواری آ رہی تھی' فسانہ آزاد کے بعد کوئی ناول نما داستان بھی قابل ذکر نہیں ملتی۔ دنیا بدل چکی تھی مغربی اثر سے ذہنیت بھی تبدیل ہو گئی تھی' دور از کار خیالات پر وقت صرف کرنے کو دنیا نے تضیع اوقات سمجھ کر' انسانی زندگی کا آئینہ ناول کو بنایا۔ شرر نے چند ہی دنوں میں ایک خرمن اکٹھا کر دیا۔ اور اس کے بعد بکثرت لکھنے اور پڑھنے والے پیدا ہو گئے موجودہ دور تک آنے کے لئے ایک ذرا سی ارتقائی نشو و نما بھی بیان کر دینا چاہئے۔ نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار نے بڑی نبض شناسی سے کام لیا تھا کہ عین ضرورت کے وقت اس میدان میں قلم اٹھایا ابتدائی عہد تھا ان لوگوں سے یہاں ناول کے اصول کے اعتبار سے بہت کچھ خامیاں رہ گئیں شرر نے بہت کچھ کمی پوری کرنے کی کوشش کی مگر باتیں رہ ہی گئیں۔ اس کے بعد منشی سجاد حسین و ڈاکٹر ہادی رسوا و حکیم محمد علی عبرت نے مسیحائی کے لئے کمر باندھی' ان لوگوں نے ایک خاص ترقی یافتہ صورت میں اس صنعت کو ہمارے سامنے پیش کر دیا اور اس میں شک نہیں کہ اب بہت کچھ کمی پوری ہو گئی مگر پھر بھی ایسا کوئی ناول اب تک نہ نظر آیا جو انگریزی ادب کے سامنے رکھا جا سکے۔

ناول نویسی کے میدان میں پریم چند نے بہت سوچ سمجھ کر قلم اٹھایا اور کچھ ایسے ناول جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے قابل قدر اضافہ ہیں۔ منظر نگاری اور سماجی زندگی کی صحیح تصویر۔ قومی احساسات اور اس کے ساتھ افسانویت غالباً اس سے بہتر اب تک اردو ادب نہیں پیش کر سکا۔ ان کے میدان عمل' بازار حسن' چوگان ہستی وغیرہ ایسے ناول ہیں کہ جن کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ اس صنعت میں اردو کا ہر قدم ترقی کے ساتھ اٹھ رہا ہے۔ فیاض علی صاحب فیض آبادی بھی ناول کے میدان میں کامیابی کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اب تک ان کے دو ناول "شمیم" اور "انور" لوگوں کے ہاتھ میں آ چکے ہیں باوجود خرابیوں کے بھی بعض لحاظ سے قابل قدر ہیں نیاز فتحپوری کے دو ناول "شہاب کی سرگذشت" "شاعر کا انجام" پلاٹ اور نفسیاتی تحلیل کے لحاظ سے اردو ناول نگاری میں اضافہ ہیں۔ ان میں پلاٹ کا کوئی خاص اہتمام نہیں رکھا گیا بلکہ معمولی قصہ کو انداز بیان سے دلچسپ بنا دینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ہر نازک موقع پر نفسیاتی تحلیل سے کردار نگاری و جذبات کی تصویر دلکش بنا دی گئی ہے۔

ناول لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے اور آئندہ اس میں اضافہ ہونا بھی مشکل ہی معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ 'مختصر افسانہ' کے سیلاب میں ناول کا ٹھہرنا آسان نہیں۔ اس کی خوبیوں اور فائدہ رسانی نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے جس کا اثر ناول کو اس وقت تک جگہ نہ لینے دیگا جب تک بہت قابلیت و کامیابی کے ساتھ لکھا نہ گیا ہو۔

مختصر افسانہ

موجودہ اردو نثر نویسی کا سب سے زبردست کارنامہ "مختصر افسانہ" ہے اس دور میں جس کثرت اور روز افزوں خوبیوں کے ساتھ یہ صنف آئی ہے کوئی اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ناول اور ڈراما کی طرح مختصر افسانہ کا بھی سرچشمہ مغربی ادب ہے۔ شروع میں انگریزی کے علاوہ فرانسیسی' ترکی اور بعد میں روسی ادب سے بھی یہ افسانے

ترجمہ کی صورت میں آنے لگے۔ ذخیرہ ہونے کے علاوہ لوگوں کے سامنے عمدہ چیزیں برابر آتی رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معیار بلند ہوتا رہا جب یہاں کے لوگوں نے طبع زاد افسانے لکھنے کی کوشش کی تو اصول کی بلندی کا کافی خیال رکھنا پڑا۔

غالباً اردو ادب میں یہ پہلی صنف سخن ہے جس کی بنیاد انگریزی داں طبقہ کے ہاتھوں سے پڑتی ہے اور خوشی یہ ہے کہ نہایت خوبی کے ساتھ تھوڑے ہی دنوں میں اتنا غلبہ ہوگیا ہے کہ آج جتنے اس کے لکھنے والے پیدا ہوگئے ہیں اتنے کسی ایک صنف انشاپردازی کے نہ ملیں گے۔ کثرت تعداد پر زیادہ خوشی نہیں بلکہ لکھنے والوں کی باہمی مسابقت اور ترقی پر مسرت ہے ہر شخص چاہتا ہے کہ جس قدر اچھا افسانہ لکھا جاسکے لکھے اور بہت ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا ہو کچھ لکھنے والے ایسے بھی مل جائیں جو دامن ادب پر بیش بہا نقش معلوم ہوں۔

ناول نے زیادہ تر جذباتی دنیا تک اپنے کو محدود رکھا تھا۔ معاشرتی زندگی کا نقشہ بہت کم آیا تھا۔ اور اگر کہیں کہیں ملتا بھی تھا تو صرف شہری زندگی کا مختصر افسانہ نے اس کمی کو بہت اچھی طرح پوری کردیا نہ صرف دیہات کے مناظر پیش کئے بلکہ غریب طبقہ مثلاً کاشتکار، مزدور، شریف، مفلس جہاں کہیں بھی نظر آئے سب کے حالات اور ان کی زندگی کی کشمکش کو نمایاں کرکے دنیا کو ان کا ہمدرد بنانے کی کامیاب کوششیں کیں۔ موجودہ افسانہ نویسی کی زیادہ توجہ موضوع کے اعتبار سے سماجی زندگی ہے اور مقصد کے لحاظ سے سرمایہ داری کی رعونت و سفاکی اور افلاس کی بیکسی و بربادی کی اصلاح ہے۔ یہاں بھی آپ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو نے پھر اپنی ترقی پسند فطرت کا ثبوت پیش کردیا۔ نبض شناسی سے کام لیا دنیا کی ضرورت اور سیاست کی رفتار کا جائزہ لے کر ادب کی باگ کو اس طرف موڑا جہاں اس سے پہلے قدم نہ گئے تھے خواہ اس کی ضرورت نہ محسوس کرنے کی وجہ سے یہ ہوا تھا یا اس طرف توجہ نہ جانے کی سبب سے یہ کی گئی تھی بہر حال یہ گوشے التفات نظر کے محتاج ضرور تھے جن پر اب توجہ نہ کرنا گناہ عظیم تھا اور صاف صاف یہ کہہ دینا تھا کہ ادب کو عملی زندگی سے کوئی سروکار نہیں اس کی دنیا صرف جذبات و تصور تک محدود ہے اس سے انکار نہیں کہ مختصر افسانوں میں بھی خالص جذباتی افسانے ہیں بلکہ اگر نہ ہوتے تو ہم کو کمی محسوس ہوتی لیکن بہت حسن اور واقعہ کی اصلی صورت لئے ہوئے ہیں ایسے افسانے لکھنے والوں میں مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتحپوری قابل قدر ہیں ان لوگوں کے یہاں بیباکی اور روداد کی ماہیت خاص طور سے نمایاں ہوتی ہیں۔

مختصر افسانہ کا سب سے نیا رجحان بھی قابل ذکر ہے جس میں یہ دکھانے کی فکر کی گئی ہے کہ کردار صرف حسین و خوبصورت ہی ہستی کا نام نہیں بلکہ وہ صورتیں بھی جو بظاہر بدنما اور بھدی ہیں ان میں بھی حرارت ہے ان میں بھی ایسی خصوصیات ہیں جو معرکہ آرائی کا جوہر دکھا سکیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی عنصر لایا جارہا ہے کہ بھدی اور مکروہ چیزیں کس طرح ہماری زندگی پر اثر ڈال رہی ہیں اگر ہم دنیا کو اس کے سامنے نہ پیش کریں گے تو شاید ہمیشہ یہ ہماری زندگی کا جزو بنی رہنگی جدید اردو شاعری میں اگر مہترانی اور جامن والی جاذب نگاہ قابل عشق سمجھی گئیں تو موجودہ اردو نثر نے بھی چمارن اور کہارن

کے حسن کی پرستش میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

موجودہ افسانہ نویس "فن" کے مطالبات کا کافی خیال رکھ کر قلم اٹھاتے ہیں چنانچہ دو چار افسانوں کے بعد آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ نفسیاتی تحلیل پر بہت زیادہ نظر رکھتے ہیں حرکات و سکنات سے جذبات و ارادہ کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ مکالمہ میں ایسے الفاظ لانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تھوڑے سی بات میں زیادہ سے زیادہ مفہوم پیدا ہو سکے عشق و حسن کی داستان کو تخیل کے معیار تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ دنیاوی امور کی نزاکتوں اور انسانی کمزوریوں کا اندازہ کر کے واقعات کی رو کو قدرتی راستہ پر لیجاتے ہیں۔ ان ہی مختصر افسانوں کے سلسلہ میں موجودہ نثر نے ایک اور کڑی کا اضافہ کیا۔ مزاحیہ افسانے اس دور سے پہلے نہیں دیکھے گئے دو چار جملے یا کچھ حصہ تو رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد میں ضرور ملجاتا ہے مگر کوئی مستقل افسانہ نہیں ہاتھ آتا۔ اودھ پنچ کے مشہور مدیر منشی سجاد حسین نے مزاحیہ نگاری کو معراج کمال پر پہونچا دیا تھا۔ اخبار میں، تنقید میں، روزمرہ کی زندگی میں غرض ہر تحریر و تقریر میں انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے مذاق کا پایہ بہت بلند کر دیا تھا۔ بڑے لطیف پیرایہ میں اظہار خیال کرتے تھے ظرافت و مزاح دست و گریباں تھے۔ اس لئے علمیت کے ساتھ تفنن طبع کو ہوتے تھے خالی باتیں ہی باتیں ہوتیں تو دلگی ہو کر رہ جاتیں۔ سجاد حسین نے اردو دنیا کے لئے مزاحیہ ناول نگاری کا بھی نمونہ پیش کر دیا تھا۔ "حاجی بغلول" اس معرکہ میں آپ اپنی نظیر ہے۔ علمیت، فن، مذاق کی پختگی و لطافت سب کے سب نہایت خوبی سے اس ناول میں منشی سجاد حسین نے ایک جگہ کر کے ہم کو راستہ بتا دیا تھا مگر عرصہ تک خاموشی رہی پھر ایسی ناول وجود میں نہ آئی۔ اودھ پنچ بھی شور کرتا رہا قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں شاید مزاحیہ انداز میں طولانی موضوع پر قلم اٹھانا دشوار تھا اس وجہ سے کوئی قابل ذکر ناول تو نہ لکھی جا سکی مگر مختصر افسانہ نے اس کا علاج کر دیا۔ متعدد افسانے لکھے گئے بعض لوگوں نے اپنا موضوع ہی 'مزاحیہ' بنا لیا مثلاً عظیم بیگ چغتائی۔ پطرس شوکت وغیرہ ان لوگوں کے افسانوں کے مجموعے چھپ بھی چکے ہیں۔ بعض بعض قابل قدر بھی ہیں مگر بلندی مذاق، پختگی، متانت، لطافت اور افسانویت کے لحاظ سے زیادہ قصے پست ہیں محض ہنس دینے کی چیزیں ہیں سبق آموز اور زندہ رہنے والی کم ہیں۔

اس کا ذکر بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ شاعری میں عورتوں کی زیادہ دلچسپی غزل تک رہی کہنے کو تو مرثیہ، نوحہ، رباعی، قصیدہ نظمیں سب ہی کچھ صنف نازک نے کہا اور اب تک توجہ کر رہی ہے لیکن اپنی جولانگاہ زیادہ غزل ہی کے میدان کو بنا رکھا۔ گویا چمن نظم میں غزل ہی ایسی چیز تھی جو عورتوں کو بھی دلکش نظر آئی۔ آج نثر کی دنیا میں اگر کوئی صنف اتنی خوش قسمت ہے کہ جسکو مستورات بھی سرفراز کر سکیں تو وہ مختصر افسانہ ہے۔ یہیں آ کر کبھی کبھی مردوں کے دوش بدوش ان کو دیکھا جاتا ہے طاہرہ دیوی شیرازی کے مجموعہ کو اگر فرض کہکر نظر انداز کرنے کی کوشش کی بھی جائے تو حجاب اسمٰعیل کے "صنوبر کے سائے" کو کہاں لے جائے گا۔

ڈراما

ناول و مختصر افسانہ کی طرح ڈراما بھی انگریزی ادب کا مرہون منت ہے۔ اسی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی کوشش کرتا رہا اسی کی سرپرستی میں پروان چڑھتا رہا لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی آنکھ سے نہ دیکھ سکا اس کے لب و لہجہ میں گفتگو کرنا نہ آیا۔ اردو ڈراما اپنے ابتدائی عہد میں نہایت سست رفتاری سے کام کرتا رہا مگر جیسے جیسے تھیٹر کا رواج ہندوستان میں زیادہ ہوتا گیا ویسے ہی اس نے بھی تیزی سے قدم بڑھائے۔ متعدد کتابیں وجود میں آگئیں جن میں زیادہ تر شکسپیر کے مشہور ڈراموں کا ترجمہ تھیں ان ترجمہ کرنے والوں میں عبداللہ، جوالا پرشاد برق، مرزا نظیر بیگ، بیتاب اور احسن لکھنوی زیادہ مشہور ہوئے ترجمے عموماً رنگین زبان میں ہوتے تھے۔ مترجمین اشعار زیادہ تر خود کہتے تھے لیکن پلاٹ میں تصرف بھی کر دیتے تھے زبان کے لحاظ سے یہ ترجمے برے نہ تھے۔ ترجمے کے علاوہ تصنیفات بھی بازار میں آگئیں مگر قابل ذکر نہیں کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے لے کر مصنفین اپنا کام چلا لیتے تھے۔ ادب کے لحاظ سے ان کتابوں کا کوئی مرتبہ نہ تھا زبان کی خرابی دیکھ کر مرزا رسوا سے نہ رہا گیا انھوں نے ایک منظوم ڈرامہ مرقع لیلے مجنوں تیار کر دیا جس کی زبان تو نہایت عمدہ ہے مگر پلاٹ اور کردار نگاری کے علاوہ مذاق بھی پست ہے۔ مولانا شرر نے بھی ڈرامے شہید وفا اور میوہ تلخ لکھے مگر ان کا بھی کوئی مرتبہ نہیں عمل و بیان کا پہلو کافی کمزور ہے۔ اس میدان میں آغا حشر کاشمیری کے آجانے سے بہت کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے اردو ڈراموں میں سب سے پہلے لب و لہجہ کو بلند کرنے کی فکر کی انداز بیان میں زور اور مکالمہ میں جوش و متانت کا عنصر نہایت ہوشیاری سے داخل کر کے سطح کو دفعتاً بلند کر دیا خود بھی ڈرامے لکھے اور شکسپیر کے بعض کارناموں کے ترجمے بھی کئے۔ زبان میں فارسیت و چستی زیادہ ہے مگر اثر جتنا دیرپا ہونا چاہئے نہیں ہوتا اس لئے کہ غم و مسرت، نصیحت عبرت جس کے بھی مناظر پیش کرتے ہیں انتہائی حد تک پہونچا دیتے ہیں الفاظ محسوسات کو آخری حد تک کھینچ کر لے جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد دفعتاً چھوڑ دیتے ہیں جو اس وجہ سے جلد پھر اپنے مقام پر آجاتے ہیں کہ وہ خود وہاں اس تیزی کے ساتھ نہیں گئے بلکہ لائے گئے تھے۔ اگر حشر جذبات کو "تیر نیمکش" بنا کر احساس کا شکار کرتے تو کہیں زیادہ دیر تک ہم لطف لے لے کر مناظر کی یاد تازہ رکھتے

بہر حال آغا حشر کا احسان ہے کہ انھوں نے کئی میل اردو ڈراما کو آگے بڑھا دیا۔ ان کے پہلے ہمارے ڈرامے زیادہ تر منظوم ہوا کرتے تھے نثر میں گفتگو بھی قریب قریب حرام تھی آغا حشر نے فطرت پسندی کا خیال کر کے نثر کو بھی اظہار خیال کا آلہ کار بنایا جس سے نظم کی بھی دلکشی زیادہ ہو گئی۔ اس وجہ سے کہ ہر وقت شعر سنتے سنتے کان کر ہو جاتے تھے دل کو الجھن اس لئے ہوتی تھی کہ نثر کی جگہ بھی لوگ شعر ہی میں گفتگو کرتے اب اپنی اپنی جگہ پر دونوں ملے تو اچھے معلوم ہوئے۔

آغا حشر نے اردو کو پلاٹ بھی اچھے دئے اور چونکہ خود بہت اچھے اداکار بھی تھے اس لئے عمل و کردار نگاری کا بھی کافی خیال رکھا۔ نفسیات کی نزاکتوں کا لحاظ رکھ کر موقع و محل پیش کئے ہیں۔

آغا حشر کے زمانے ہی میں تھیٹروں کا زوال شروع ہو گیا تھا لہذا ڈراما کی بھی قلت محسوس ہونے لگی اس کمی کو پورا کرنا اردو کا انگریزی داں طبقہ اپنا فرض سمجھتا رہا اور یہ بھی سوچتا تھا کہ جو کچھ ابھی تک ہمارے یہاں آیا ہے وہ فن کے اعتبار سے بھی

بہت ناقص ہے۔ اب جن لوگوں نے ڈراما پر قلم اٹھایا ان میں کافی تعداد ایسی تھی جو شکسپیر وغیرہ کے کارناموں کو تنقیدی نظر سے دیکھ چکی تھی اور ڈرامہ کے اصول و ضوابط اس کے دماغ میں بڑی حد تک محفوظ تھے۔ یہ لوگ عرصہ تک اپنے کارناموں کو رسالوں کے ذریعہ سے پیش کرتے رہے۔ رسالوں میں اب تک جو کچھ نکل رہا ہے اس میں عموماً ایک ایکٹ کا ڈراما ہوتا ہے کم ایسے ہوتے ہیں جو اس سے زیادہ ہوں مگر خواہ قامت میں کم ہوں مگر قیمت میں اپنے پیشرو ڈرامہ نویسوں کے کارنامے سے بہتر ہیں موجودہ دور کے ڈرامہ لکھنے والوں کو اصول فن کے ساتھ ساتھ احتیاج زمان کا بھی خیال ہے نفسیاتی تحلیل سے واقف ہونے کا ثبوت دیتے ہیں تو سماجی زندگی کی مشکلات کا حل پیش کرتے ہوئے پلاٹ کی تنوع کا بھی کافی خیال ہے۔ لیکن زبان سے زیادہ طرز بیان پر توجہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ ڈرامے زبان کی غلطیوں سے پاک نہیں کہے جا سکتے۔

اردو ڈراما پر ہمارے ممتاز اہل قلم نے ابتدا سے بہت کم توجہ کی جس کے مختلف وجوہ تھے۔ اول تو اس غلط فہمی سے کہ ڈراما محض گانے بجانے کی چیز ہے جو مذہب کی آنکھوں میں ایک معیوب شے تھی اور دوسرے یہ کہ شروع سے آج تک اس کی زندگی کاروباری دنیا کے ہاتھ میں رہی جس کو ادب سے زیادہ دولت عزیز ہے۔ دور اول میں پارسی تھیٹر کمپنیوں نے جو کچھ لکھا یا لکھوایا وہ صرف اس لئے کہ روپیہ حاصل کیا جائے اور آج بھی جو ڈرامے کتابوں کی صورت میں نظر آتے ہیں ان میں سے زیادہ تر سینما کمپنیوں کی زرپاشی کے نتائج ہیں اچھے لکھنے والے مل بھی جاتے ہیں اور عمدہ ڈراما لکھنا بھی جانتے ہیں مگر ان کا تصنیف سے پہلے پبلک کے مذاق اور روپیہ کی جھنکار کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اسی لحاظ سے ڈراما کی ترمیم کا حکم دیتا ہے۔ مالک کمپنی بھی زیادہ تر ڈائرکٹروں کے ہاتھ میں ہے وہ خود اپنے کو سب سے زیادہ ادیب۔ سب سے زیادہ عالم اور مستند سمجھتے ہیں خود ہی ڈراما لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی نادر تصنیف کے آگے کسی اور کے ڈراما کی قدر کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ اسی سے تو آرزو ایسا قابل اور تجربہ کار ڈرامہ نویس صرف منشی ہو کر رہ جاتا ہے۔ آج بھی ہمارے یہاں اس صنف میں اتنی خرابیاں باقی ہیں کہ کسی غیر فانی کارنامہ کا ذکر تو کیا کوئی ایسی چیز بھی نہیں مل سکتی جو پورے اوصاف سے متصف ہو ہاں امتیاز علی تاج کا ڈراما "انارکلی" البتہ قابل قدر ہے اور واقعی اس قابل تھا کہ بجا طور پر اس نے ملک سے خراج تحسین وصول کر لیا۔ لیکن اس سے پیاس نہیں بجھتی۔ ابھی بہت کمی ہے ہم کو دور تک نظر ڈالنا ہے کافی سے زیادہ محنت کرنا ہے تب اردو اس قابل ہو گی کہ انگریزی ڈراما کے سامنے منھ کر سکے۔

غالباً عبد الماجد صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے پرانی روش کو نیا راستہ دکھانے کی کوشش کی۔ ان کا ڈراما "زود پشیمان" بہت کچھ جدید تحریک کی معیار پر آجاتا ہے۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اس میدان میں بھی کچھ نہ کچھ کام کرتے ہیں "راج دلاری" اور "مراری دادا" بعض حیثیتوں سے ان کے اچھے ڈرامے ہیں۔ کردار ناقص مگر پلاٹ بہتر ہیں روزمرہ کی زندگی کا وہ حصہ جو عموماً لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں ان کو موصوف نے خوبی سے دکھا دیا ہے۔

احمد شجاع کا ذکر ڈرامے کے سلسلہ میں نہ کرنا گناہ ہے آپ نے ایک خاص مذاق کے ساتھ ڈرامے لکھنا شروع کئے جو مقبول خاص و عام ہوئے آپ کے یہاں جذبات کی شدت اختصار پسندی اور طرز تخیل خاص چیز یں ہیں اب تک آپ متعدد ڈرامے لکھ چکے ہیں مثلاً۔ "باپ کا گناہ"۔ "بھارت کا لال"۔ "جانباز"۔ "آخری فرعون" وغیرہ کچھ بنگالی ڈراموں کے ترجمے بھی آپ نے نہایت خوبی سے کئے ہیں جیسے حسن کی قیمت' تارا وغیرہ۔

احمد شجاع صاحب نے جدید تحریک میں ڈرامے کے لئے اپنے رسالہ ہزار داستان سے اردو کی قابل قدر خدمت کی ہے۔ خود ڈرامے لکھے اور اپنے ہونہار ساتھیوں سے بھی ترقی کے ساتھ ڈرامے لکھوائے۔

جامعہ ملیہ نے بھی خاص توجہ ڈرامائی ادب کی طرف کی ہے۔ وہاں کے قابل قدر مصنفوں نے اکثر اچھے ڈرامے لکھے ہیں۔ یہاں کے ڈراموں کا موضوع عموماً سیاسی اور معاشرتی ہوتا ہے۔ انداز بیان میں پاکیزہ ہے۔ غالباً جتنی تعداد میں یہاں ڈرامے لکھے گئے ہیں اردو کے کسی ایک ادارہ میں نہیں لکھے گئے۔ خاص خاص ان میں سے یہ ہیں پردہ غفلت۔ ہمزاد صید زبون۔ نقش آخر۔

محمد عمر نورالہی کی خدمات بھی اس سلسلہ میں کسی سے کم نہیں ڈرامائی ادب سے دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ سب سے پہلے آپ نے اردو میں فن ڈرامہ پر ایک ضخیم کتاب ٹاٹک ساگر لکھی اس کے علاوہ کچھ ڈرامے بھی لکھے جو طرز جدید کی اشاعت میں معاون ہوئے۔

اس وقت اردو کے سربرآوردہ ڈراما لکھنے یا ترجمہ کرنے والوں میں خاص حضرات یہ ہیں پروفیسر اشتیاق حسین صاحب سینٹ اسٹفنس کالج دہلی۔ فضل الرحمٰن صاحب۔ محمد مجیب صاحب بی اے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب شاہد احمد صاحب۔ عنایت اللہ۔ مجنوں گورکھپوری۔ فضل حق قریشی۔ ہمارے مشہور افسانہ نویس سدرشن نے اس میدان میں بھی جلد شہرت کر لی ہے۔ ان کا ایک ڈراما "مان کی پرتگیا" ہندوستان کے باہر جاپان میں کھیلا جا چکا ہے۔

موجودہ حالت میں ڈراما کا مستقبل اچھا نظر آتا ہے۔ توجہ کرنے والوں میں کافی ایسے حضرات ہیں جن کی قابلیت انشاپردازی' انگریزی ادب کی واقفیت' ڈرامائی ادب کی ترقی کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ حیدرآباد اور پنجاب کی سرپرستی میں یہ صنف ادب کافی مزے میں چل رہا ہے۔ یو۔ پی میں بھی لوگ کچھ نہ کچھ توجہ کر رہے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی نے بی۔ اے کے نصاب میں بھی داخل کر لیا ہے۔ صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ دور اندیشی کی راہ سے اپنے ریسرچ اسکالر سے اس فن پر ریسرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایک کتاب حال ہی میں بادشاہ حسین صاحب نے اردو میں ڈراما نگاری لکھ کر اچھی خاصی فن کی تاریخ و تنقید ایک جگہ کر دی ہے۔

تنقید و تاریخ

موجودہ نثر نے تنقید و تاریخ ادب پر بھی کافی روشنی ڈالنے کی فکر کی ہے۔ رسالوں کی تنقید نگاری کا ذکر ابھی کیا جا چکا مگر اتنا کہنا باقی رہ گیا کہ فن تنقید کو منضبط کرنا اور تنقیدی مضامین کو کتابی صورت میں پیش

کرنا بھی اس دور کا خاص کارنامہ ہے۔ نقد و تبصرہ کے اصول مولانا شبلی نے شعر العجم کے سلسلہ میں بتا کر منضبط طریقہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا تھا۔ ان کے بعد کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔ روح تنقید مصنفہ پروفیسر محی الدین قادری زور۔ نقد الادب مصنفہ افسر میرٹھی۔ افسانہ نگاری اور ہمارے افسانے مصنفہ وقار عظیم۔ افسانہ، مصنفہ مجنوں گورکھپوری۔ اصول فن کے علاوہ جو تنقیدی مضامین پر مستقل قابل قدر کتابیں ہیں ان میں چند کے نام یہ ہیں شعر الہند مصنفہ عبد السلام ندوی۔ ہماری شاعری مصنفہ سید مسعود حسین رضوی۔ اردو کے اسالیب بیان مصنفہ غلام محی الدین زور۔ جدید اردو شاعری مصنفہ سروری۔ چند تنقیدی مضامین مصنفہ سید حامد حسن بلگرامی۔ سیر مضحکات و طنزیات مصنفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ اردو کا پہلا ناول نگار مصنفہ اویس احمد ادیب۔ تنقیدی مقالات مصنفہ پروفیسر زور۔ Tendencies of Modern Urdu Poetry مصنفہ موہن سنگھ دیوانہ Influence of English literature on Urdu literature. مصنفہ ڈاکٹر عبد اللطیف Ghalib پر بھی ایک کتاب اسی مصنف نے لکھی ہے۔ ان کتابوں میں موضوع اور نفس مضمون یا شعر اور شاعری یا انشا پرداز کے خیالات سے بحث کی گئی ہے۔ انداز بیان عموماً ادبی و علمی ہے مغرب کے قائم کردہ اصول سے مدد لیجاتی ہے اور جو باتیں ابتک کم نظر آئی تھیں ان کو نمایاں کرنے کی کوشش کیجاتی ہے اس طرح سے معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور آئندہ مصنفین مستفیض بھی ہونے کا موقع پاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اردو نثر کا یہ موجودہ رویہ بھی ضرورت اور نبض شناسی کے لحاظ سے قابل ستائش ہے کہ ادب و زبان کی کئی ایک قابل قدر تاریخیں وجود میں آگئیں۔ "آب حیات" اس قسم کی پہلی کتاب تھی جس نے تذکروں سے دور ہو کر تاریخی انداز میں زبان کی ارتقا، شباب، ترقی کا خاکہ دنیا کے سامنے پیش کیا گویا محمد حسین آزاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کے لئے یہ شاہراہ کھولی۔ ورنہ اس سے پہلے شعرا کے متعلق انفرادی حیثیت کی نہ کوئی تنقید ملتی ہے اور نہ زبان و ادب کی نشو و نما کا کہیں سے باقاعدہ پتہ چل سکتا ہے۔ اس کتاب کے بعد عرصہ تک یہ سناٹا رہا۔ زبان و زاویہ نگاہ کی تبدیلی نے اس کی کمی محسوس کی اور دوسری کتابیں تاریخ و تنقید کی ادب کے پردے پر ظاہر ہوئیں جن میں تاریخی انداز سے زبان کی ترقی و تنزل پر بحث کی گئی، مختلف دور کے کارنامے بیان کئے گئے، شعرا کی انفرادی خصوصیت پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ ان کی وفات و پیدائش کی تاریخ بھی جہاں تک ہوسکا ہے تحقیق کے ساتھ قلم بند کی گئی ہے۔ اردو کی ہر دلعزیزی و اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی اردو ادب کی تاریخیں لکھی گئیں مثلاً History of the Urdu Literature مصنفہ رام بابو سکسینہ اور دوسرے گراہم بیلی کی A history of Urdu literature رام بابو کی تاریخ کا اردو میں ترجمہ بھی محمد عسکری صاحب نے کردیا جو بعض اعتبار سے اپنے اصل سے بہتر ہے۔

"گل رعنا" مصنفہ عبد الحئی اردو زبان اور ادب مصنفہ پروفیسر سید ضامن علی صاحب جس میں تاریخ کے علاوہ ایک اور

بڑی قابلِ قدر ہے کہ مصنف نے عہدِ قدیم سے لے کر آج تک کی اکثر اردو کتابوں کی صنف وار فہرست مع اسمِ مصنف و تاریخ و پتہ وغیرہ کے آخر میں شامل کر دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسی میں کچھ اردو کی ترقی کے لئے تجاویز بھی ہیں۔ مختصر تاریخ ادبِ اردو مصنفہ سید اعجاز حسین لکچرر یونیورسٹی الہ آباد۔ اردوئے قدیم مصنفہ قادری۔ دکن میں اردو۔ نصیر ہاشمی پنجاب میں اردو مصنفہ پروفیسر محمود شیرانی۔ سیر المصنفین (اس کو اردو نثر نگاروں کی تاریخ سمجھنا چاہئے) مصنفہ محمد یحییٰ تنہا اربابِ نثرِ اردو وغیرہ۔

اردو کے تذکرے بہت پرانے سہی مگر ان کو پھر سے زندہ کرنا اسی دور کا کام تھا کافی تعداد ایسے تذکروں کی تھی جو اب سے پہلے گم ہو چکے تھے نہ بازار میں ملتے تھے اور نہ کتب خانوں میں۔ انجمن ترقی اردو اس لحاظ سے بھی قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر کچھ دیوان اور قریب قریب سب تذکرے پھر سے شائع کئے

ترجمے اردو نثر کا یہ دور اس لحاظ سے بھی بہت ممتاز ہے کہ دار الترجمہ حیدرآباد نے ہر کار آمد اور اہم شعبہ علم کی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے زبان کو مالا مال کر دیا۔ اس سے پہلے سائنس و فلسفہ کی کتابیں اردو میں بہت کم تھیں مگر اس دار الترجمہ نے نہ صرف وہ تمام کتابیں سائنس و فلسفہ کی اردو میں کر دیں جو عموماً بی اے اور ایم اے کے نصاب میں داخل ہیں بلکہ ان سے بلند پایہ اور عام دلچسپی کی بھی تصانیف کا اردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ اس محکمہ کی توجہ صرف ان ہی دو چیزوں تک محدود نہیں رہی بلکہ تاریخ، جغرافیہ، سیاست، معاشیات۔ نجوم۔ ریاضی وغیرہ ہر شعبہ کی مفید کتابوں کو اس نے اردو کا جامہ پہنا دیا ہے۔

فرہنگ اس زمانہ میں متعدد لغت لکھی گئیں جو بعض وقت اپنی نوعیت کے اعتبار سے بھی دلچسپ و اہم ہیں۔ مثلاً "قاموس المشاہیر" مصنفہ نظامی بدایونی جس میں دنیا کے سربرآوردہ لوگوں کا حال ہے "مجمع الامثال" جس میں تمام ضرب المثلیں ایک جا کر کے مفہوم بتایا ہے اور "مترادف الفاظ" یہ دونوں فرہنگ راے راج الیشور راؤ متخلص بہ اصغر کی لکھی ہوئی ہیں۔ فرہنگ اصطلاحات وغیرہ کے علاوہ معنی و مطلب کی لغتیں بھی کئی ایک وجود میں آگئیں مثلاً فیروز اللغات۔ لغات کشوری۔ نور اللغات اور کئی انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں مثلاً ہرا کمل ڈکشنری وغیرہ

اسی سلسلہ کی ایک کتاب اور بھی قابلِ ذکر ہے وضع اصطلاحات جو سلیم پانی پتی نے اس لئے لکھی تھی کہ اردو میں کس طرح نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کچھ اصول دئے ہیں اور کچھ تجویزیں ہیں جو بڑی حد تک قابلِ عمل ہیں۔

سوانح عمری موجودہ دور میں سوانح عمریوں پر بھی پہلے سے زیادہ توجہ کی گئی اب سے پہلے بہت کم حالاتِ زندگی قلمبند کرنے کا رواج تھا۔ غالباً مولانا حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے باقاعدہ سوانح عمری لکھنے کی ابتدا کی،

"یادگار غالب" "حیات جاوید" "حیات سعدی" یہ تین کتابیں اس صنف کی اردو میں حالی کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے اس طرف توجہ کی اور سیرۃ النبی، حیات مولانا روم، المامون، الفاروق۔ النعمان وغیرہ لکھ کر اس فن کو اور ترقی دینے کی کوشش کی۔ موجودہ دور نے اس سلسلہ کو قائم ہی نہیں رکھا بلکہ بڑھانے کی بھی کوشش کی۔ بعض خودنوشت حالات بھی کتابوں کی صورت میں آنے لگے۔ ہم ان کا ذکر نہیں کرتے جو ترجمہ کے ذریعہ سے یہاں آئیں مثلاً مہاتما گاندھی کی سرگزشت جس کو تلاش حق سمجھا گیا۔ جواہرلال نہرو کی سوانح عمری کو ترجمہ کرکے اس کو اپنی کہانی بتایا گیا بلکہ ہم اصل کتابوں کا ذکر کر رہے ہیں جیسے حسن نظامی کی "آپ بیتی" بعض ایسے بھی اس زمانے میں بزرگ ہیں جنھوں نے متعدد کتابیں سوانح عمری کی لکھ ڈالی ہیں مثلاً اولاد حیدر صاحب فوق نے رسول خدا اور ان کی ذریات کی زندگی ایک طرف سے قلمبند کرنے کا شرف حاصل کر لیا ہے۔ دارالمصنفین کے بعض اراکین مثلاً مولانا سلیمان ندوی، واسلم جیراج پوری وغیرہ نے بھی مذہبی سوانح عمریاں لکھیں مولانا سلیمان ندوی تو چند قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ عمر خیام کی بھی قابل قدر سوانح عمری تصنیف کر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ دنیاوی لوگوں کے بھی حالات اور لوگوں نے لکھنا شروع کئے اور متعدد کتابیں وجود میں آگئیں دو چار کے نام سن لیجئے۔ حیات کرامت (جسٹس کرامت حسین کی سوانح عمری مصنفہ حامد علی بیرسٹر) حیات رشید (پیارے صاحب رشید کی سوانح عمری) تذکرہ محسن (محسن الملک کی زندگی کے حالات مصنفہ محمد امین زبیری) حیات دبیر۔ یادگار انیس۔ سیرت محمد علی۔ حیات مصطفیٰ کمال۔ حیات امان اللہ خاں وغیرہ یہ فہرست اور بڑھائی جا سکتی ہے مگر نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔ تعداد تو اچھی خاصی نظر آجائے گی لیکن فن کے اعتبار سے دنیا کی مستند سوانح عمریوں کے برابر ان میں سے شاید کوئی بھی نہ آسکے۔ اول تو بہت کم ایسی ہیں جن میں پوست کندہ حالات بے کم و کاست آگئے ہوں۔ دوسرے یہ کہ طرز تحریر بھی اتنی دلکش نہیں ہو سکی کہ کارنامہ دلوں پر دیر تک قبضہ کئے رہے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ سوانح عمری خود اس قابل نہ تھی کہ لکھی جائے مگر لکھنے والوں نے جوش عقیدت میں احوال قلم بند کر ہی ڈالا۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ اس فن میں بیباکی، دلکشی، راست بازی، خلوص اور سب سے زیادہ انداز بیان و حالات کی دلکشی اور تاثیر کا مظاہرہ کیا جائے تاکہ اس صنف کو بلندی اور دیرپائی نصیب ہو۔ سوانح عمری کا سب سے زبردست مقصد یہ ہے کہ ممدوح کی ذات دنیا کے لئے باعث درس ہو آئندہ نسلیں اس سے رہبری حاصل کر سکیں انقلاب عروج و زوال کی تصویریں جو ایک خاص ہستی کے دامن زندگی پر نقش ہوں اہل نظر کے لئے خضر راہ بن جائیں ہماری روزمرہ کی زندگی اثر قبول کر سکے۔ اردو میں ابھی ان باتوں کی کمی ہے مگر انگریزی ادب کی مدد سے اور ان ترجموں کی امداد سے جو صحیح معنوں میں سوانح عمری کہی جا سکتی ہیں وہ دن دور نہیں کہ ہمارے مصنف بھی ایسی سوانح عمریاں لکھنے پر قادر ہو جائیں جو باعث اطمینان و فخر ہوں۔

خطوط

خطوط کے متعلق بھی کچھ عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا اس لئے کہ اس صنف کو بھی دور جدید کافی فروغ دے رہا ہے۔ غالب نے کچھ ایسے انداز سے خط لکھے کہ ناممکن تھا دنیا اثر نہ لیتی روزمرہ کی زندگی اس قدر دلچسپ بنانا آسان کام نہ تھا مرزا غالب نے طرز تخاطب اور انداز بیان اس خوبی سے ایک جگہ کر دیا کہ ان کے خطوط اردو ادب کے لئے مایہ ناز اندوختہ ہو گئے ایک نئی اور درخشاں چیز پیدا ہو گی ان کے بعد سے اور لوگوں کے بھی خطوط کتابی صورت میں نظر آنے لگے مثلاً "خطوط سرسید" "مکاتب امیر مینائی" "خطوط اکبر الہ آبادی" مگر ہمارے نزدیک غالب کے خطوط پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا البتہ حال ہی میں نیاز فتحپوری کے خطوں کا مجموعہ "مکتوبات نیاز" کے نام سے شائع ہوا ہے جو کئی اعتبار سے قابل قدر ہے۔ نیاز کا انداز بیان جس قدر موثر ہے وہ ظاہر ہے بیان کرنا تحصیل حاصل ہے مگر اس کے علاوہ بیباکی، شگفتگی، کیفیت، برجستگی۔ خیالات کی بلندی ایسی چیزیں ہیں جو ہمارے نزدیک ادبی دنیا میں ایک قابل قدر اضافہ کرتی ہیں۔ ان مکتوبات میں ایسے خطوط بھی ہیں جن کو (LOVE LETTERS) "خطوط محبت" کہہ سکیں۔ حسن و عشق کی واردات اس پر لطف طریقہ سے بیان ہوگئی ہے کہ کثافت خود بخود کنارہ کش ہو جاتی ہے۔ لطیف عریانی جنت تخیل بن جاتی ہے۔ شریف احمد برلی کے خطوط "نیستاں" اور "کلیم" میں اب تک شائع ہوئے ہیں وہ کافی امید افزا ہیں۔ یہ خطوط تمام تر عاشقانہ ہیں مگر ان میں جذبات کے نہایت پرکیف اور متین پہلو سادگی کے بیان ہوتے رہتے ہیں۔ پڑھنے والا ایک میٹھا میٹھا درد اپنے دل میں محسوس کرتا رہتا ہے۔

اس سلسلہ میں لیلی کے خطوط کا بھی ذکر ضروری ہے جس میں قاضی عبدالغفار خاں نے ایک طوائف کی حسن فروشی اور خریداروں کی روداد پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ خطوں کا مجموعہ اپنے انداز بیان اور تماش بینی کے داخلی پہلو پر روشنی ڈالنے کے لحاظ سے بالکل نیا ہے۔ خریداروں کی بے چینی۔ چالاکی، مبالغہ پسندی۔ چاپلوسی، ظاہرداری۔ طوائف کی زبان سے سن کر کچھ عبرت حاصل ہوتی ہے اور کچھ عورت کی مردم شناسی کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر "مصور ایں تصویر مرد است نہ کہ شیر" کا مضمون ہے۔ عورت اور پھر بھی پیشہ ور اپنی تعریف اور مردوں کی برائی و زیادتی فرض منصبی تھا کیوں نہ کرتی خطوط ایک رخے ہیں اور دس بارہ خطوط کے بعد دلچسپی بھی مشکل سے قائم رکھ سکتے ہیں اس لئے کہ وہی شکوہ شکایت وہی جور بیجا وہی ستم ظریفی کے گلے اور اپنی صاف گوئی و خلوص اور مردم بیزاری کی حکایت آتے رہتے ہیں اور بجائے دلچسپی کے الجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ بہر حال مجموعہ اردو ادب میں طرز بیان و تخیل کے اعتبار سے قابل قدر ہے اسی طرح ایم اسلم کا ناول "نرگس" خطوط ہی میں لکھا گیا ہے۔

ڈائری

خطوط سے ملی ہوئی ایک چیز اور اس زمانہ میں آپ کو نظر آئے گی اور یہ بھی انگریزی ادب کا کرشمہ ہے۔ صنف کے اعتبار سے نئی چیز ہے اس لئے کہ دور جدید سے پہلے ڈائری نظر نہیں آتی۔ اودھ پنچ نے مولانا اودھ پنچ کی نوٹ بک' کا سلسلہ ضرور شروع کیا تھا وہ اب تک قائم ہے اس وجہ سے اس کو بھی ہم دور جدید میں شامل کر لیتے ہیں

ڈائری میں نہایت مختصر طور پر کسی خاص واقعہ کی طرف پرلطف اشارہ کردیا جاتا ہے کوئی بحث یا دلیل بہت کم پیش کیجاتی ہے سمجھنے والے سمجھ کر لطف اٹھا لیتے ہیں اس لئے کہ بہت لطیف اشارے ہیں حشم ساقی کے اس قسم کی تحریریں جملے بہت جامع و مانع ہوتے ہیں اور انداز بیان بھی کافی دلکش ہوتا ہے - دو چار ڈائری حال ہی میں شائع بھی ہوئی ہیں مثلاً سیاح کی ڈائری - مجنوں کی ڈائری - صوفی کی ڈائری - شیطان کی ڈائری - خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ بھی اسی قبیلہ کی چیز ہے - ابھی حال ہی میں ماہر القادری صاحب کی ایک مکمل کتاب اسی عنوان کی شائع ہوئی جس کا نام ہی روزنامچہ ہے - تمام پیشہ وروں کے متعلق (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) دو چار صفحے لکھے گئے ہیں - مگر مضامین عموماً غیر دلچسپ ہیں -

ESSAY یا مضمون

دورِ جدید نے ان ہی اوصاف تک اپنے دامن کو محدود نہیں رکھا جہاں تک سوچیے گا کوئی نہ کوئی چیز ادھر نکل ہی آئے گی مگر فی الحال ہم گملوں پر اکتفا کرتے ہیں کلیوں کو آئندہ کیلئے اٹھا رکھتے ہیں ان ہی گملوں میں وہ چیز بھی آتی ہے جس کو انگریزی میں Essay اور اردو میں "مضمون" کہتے ہیں جس میں مختلف مسائل پر مختصر مگر جامع الفاظ میں مضمون آرائی کیجاتی ہے - تفصیلات کو نظر انداز کرکے نفس مضمون پر روشنی ڈالی جاتی ہے مگر اس انداز سے کہ تھوڑی ہی دیر میں پڑھنے والا مضمون دلچسپی کے ساتھ ختم کرسکے -

انگریزی میں تو اس کا رواج بہت ہے متعدد مایہ ناز کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر اردو میں ابھی اس کی کمی ہے حالانکہ دورِ جدید نے کچھ قدم آگے بڑھائے ہیں مگر ابھی پھر بھی منزل سے بہت دور ہے - اردو میں سب سے پہلے یہ چیز ہم کو تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے کتابی صورت میں ملتی ہے - سرسید اور ان کے رفقائے کار نے مختلف موضوع پر قلم اٹھا کر اردو میں مضمون نگاری کی شان پیدا کردی اس کے بعد آزاد نے مختلف عنوان کے مضامین لکھ کر یکجا کردئے اور آج ہم کو نیرنگ خیال کی صورت میں نظر آتی ہے - مولانا حالی - و شبلی نے بھی متعدد مضامین کارآمد اور اہم لکھے جن کو ہم مضمون یا Essay کہہ سکتے ہیں -

دورِ جدید میں اس قسم کے لکھنے والوں میں دو تین حضرات نمایاں ہمارے سامنے آتے ہیں - مولانا حسن نظامی عبدالماجد دریابادی چکبست لکھنوی - نیاز فتحپوری - ان سبھوں کا طرز تحریر جداگانہ اور اپنی جگہ پر دلکش ہے - مولانا حسن نظامی کا موضوع زیادہ تر دنیا کی بہت معمولی چیز ہوتی ہے مثلاً "تنکا" پیسہ وغیرہ اور اسی کی اہمیت کو صوفیانہ انداز سے بیان کرکے اتنا بلند کردیتے ہیں کہ یہ چیز تھوڑی دیر کے لئے سبق آموز ہوجاتی ہے مولوی عبدالماجد دریابادی کا موضوع عموماً علمی ہوتا ہے اور ان کے تبحر کا پتہ دیتا ہے - چکبست کا موضوع معاشرتی اور علمی ہے متانت و سنجیدگی ان کے عبارت کی جان ہے دلیل اور جستجو مضمون کی روح رواں - یہ بزرگ کبھی کبھی چیزوں کی تفصیلات پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں -

نیاز فتحپوری کے "ملاحظات" ہمارے نزدیک خاص توجہ کے مستحق ہیں ان میں موصوف کی بے باکی، طنز، شوخی

کے علاوہ جملوں کی معنویت بہت قابل قدر ہے۔ زیادہ تر جملے ایسے ہیں جو غالب کے اشعار کی طرح الفاظ سے زیادہ مفہوم پیدا کر دیتے ہیں۔ کافی تعداد میں جملے ایسے مل جائیں گے جو خود اپنی جگہ پر ایک مضمون ہیں۔ نیاز کا موضوع وسیع ہے۔ حسن و عشق کی داستان، سیاسی رجحانات، معاشرتی قیود، مذہبی مسائل، عام معلومات سبھی زیب قرطاس ہو جاتے ہیں۔ ان مضامین میں آپ کو پارہ اور اس کے ہمکمل ہونے کا بھی کافی ثبوت مل جائے گا۔

مضامین فرحت کئی جلدوں میں ہیں۔ مختلف عنوانات پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے خامہ فرسائی کی ہے اپنے مزاحیہ انداز میں بہت کچھ لکھ ڈالا ہے۔ رنگینی و شگفتگی اور اثر کے لحاظ سے پورا مجموعہ قابل قدر ہے۔

مضامین شرر پانچ جلدوں میں ہیں اور بعض جلدوں کے بھی حصے ہیں مولانا شرر نے یہ مضامین لکھ کر ہماری معلومات میں کافی اضافہ کر دیا ہے تنوع مضامین کے لحاظ سے یہ جلدیں بے نظیر ہیں۔ تاریخی، جغرافیائی، معاشرتی، جذباتی، مذہبی، علمی، سیاسی وغیرہ ہر قسم کے مضامین ان جلدوں میں موجود ہیں۔ طرز نگارش وہی ہے جو مولانا ناول میں صرف کرتے ہیں۔ جتنے الفاظ ہیں اتنا ہی مفہوم ہوتا ہے۔ حالانکہ مضمون (ESSAY) میں ضرورت ہے کہ جامعیت و معنویت دونوں بہت ہوں مولانا کے یہاں زور و چستی عبارت اس حد تک نہیں جتنا مضمون (ESSAY) کا مطالبہ ہے بہرحال مولانا کی یہ خدمت بھی ہمارے لئے قابل قدر ہے۔ وسیع معلومات اور ہمہ گیری کے ساتھ ایسے لکھنے والے اردو میں کہاں ملتے ہیں۔

مضامین رشید بھی جامعہ ملیہ سے شائع ہو گئے ہیں یہ وہی مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

موجودہ نثر کے صنف وار تفصیل ترقی، تنزل، خامی، کو دیکھ لینے کے بعد جی چاہتا ہے کہ رجحانات کے مجموعی اثر و روش پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

شاعری کی طرح موجودہ نثر کا بھی رجحان حقیقت نگاری و صاف گوئی کی طرف ہے جو کچھ لکھنا ہوتا ہے وہ زیادہ تر براہ راست اور صاف صاف ظاہر کیا جاتا ہے الفاظ کے انبار اور طرز بیان کی پیچیدگی میں مضمون کے اثر کو زائل نہیں ہونے دیا جاتا۔ تمہید و تقریب کا سلسلہ بھی اتنا کم ہو گیا ہے کہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے مضمون نویس جلد سے جلد اصل مضمون پر آجاتا ہے۔

اسے زمانہ کی رفتار سمجھئے یا اردو کی ترقی کہ موجودہ دور میں ادق مضامین اور معنی خیز امور کو بھی سلجھا کر بیان کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔

بجائے عبارت میں رنگینی پیدا کرنے کے زور واقعیت اور اثر کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے عموماً لکھنے والے عبارت میں زور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں کبھی کبھی نئی ترکیبیں اور نامانوس الفاظ سے بھی کام لینا پڑتا ہے

جو بعض وقت زبان کے اعتبار سے صحیح نہیں ہوتیں۔

منظر نگاری کے موقع پر بھی نہیں کہ شاعرانہ اندازِ بیان ترک کر کے اصلیت کو قلم بند کیا جائے بلکہ فطرت و آبادی اور دوسرے مختلف عنوانات مثلاً اسٹیشن۔ تار گھر۔ نیلام گھر وغیرہ کے مناظر سادگی مگر پُر اثر طریقہ پر بیان کرنا پسند کیا جاتا ہے۔ موضوع و مسائل پر بحث کرتے وقت اس کی ماہیت اور فطری ارتقا کو دلیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش عام ہو چکی ہے۔ جذبات و عقیدہ مندی کی دنیا سے بہت کم مدد لی جاتی ہے۔ غالباً یہ اثر سائنس اور انگریزی ادب کا ممنون ہے۔ نفسیاتی تحلیل و جامعیت کی روح ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔

ظرافت کا رواج ترقی پذیر ہے مگر صرف موضوع کے لحاظ سے نہیں۔ الفاظ و بیان کے دائرے سے نکل کر معنی و مفہوم کے لطیف پہلو سے مزاحیہ ماحول پیدا کرتے ہوئے لکھنے والے آگے قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔ موجودہ نثر کا رجحان جب اصلیت کی طرف ہو تو اسی سے ملی ہوئی سرحد بیباکی و آزادی کی بھی نظر پڑی۔ بعض انشا پرداز ادھر بھی جا پڑے۔ مذہب اور رسمی قیود سے علیحدہ ہو کر ان چیزوں پر روشنی ڈالی جو اس سے پہلے سخت معیوب سمجھی جاتی تھیں۔ مثلاً طوائف کے پیشہ کو کاروباری لحاظ سے اس مرتبہ پر پہونچانا جس پر پروفیسر۔ ایڈیٹر۔ مصور۔ وکیل وغیرہ کا کارنامہ دنیا لیجانا چاہتی ہے۔ اس قسم کے مضامین زیادہ تر آپ کو رسالوں میں ملیں گے۔ نیرنگ خیال کے سالنامہ دسمبر ۱۹۳۵ء میں جمیل مظہری کا ایک مضمون اس موضوع پر نہایت دلچسپ ہے۔ نگار، دکامراں وغیرہ میں اکثر اس قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی نظر آئے گا کہ دورِ جدید میں لکھنے والوں کی جوش پسند طبیعت نے کبھی کبھی الفاظ و جملوں کو زوردار بنانے کے لئے زبان و قواعد کا خیال نہیں رکھا۔ اگلے زمانہ میں کمزوری اگر طرزِ ادا میں تھی یعنی زوردار جملے کم ہوتے تھے تو اس دور میں لوگوں نے زبان و ادب کا خیال کم رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا احساس ہوتا جا رہا ہے ممکن ہے کہ دس پانچ سال میں یہ کمی بھی پوری ہو جائے۔

دورِ جدید سے پہلے اردو میں ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جس نے بہت کم نئے الفاظ کا اضافہ کیا اب ضرورت یا وسعت کے لحاظ سے بہت کافی اس قسم کے فقرے و الفاظ آ گئے جو اصطلاحات سے الگ ہو کر روزمرہ کی زندگی میں کام آتے ہیں مثلاً زاویہ نگاہ، برقانا، شاہکار، کردار (character یعنی افرادِ تمثیل) وغیرہ

آخر میں اردو زبان کی یہ موجودہ تحریک سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے کہ قومی زبان کی تلاش و بحث مباحثہ نے ہمارے نثر نگاروں کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک وہ طبقہ ہے جو اس پر رضامند نہیں کہ زبان آسان استعمال کی جائے وہ فارسی عربی کے ادق الفاظ کو اردو میں لانا اس لئے ضروری سمجھتا ہے کہ بغیر اس کے زبان میں زور اور علمیت کا عنصر نہ پیدا ہو سکے گا۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو سیاسی امور کے مصالح پر زبان میں آسان الفاظ استعمال کرنا

ضروری سمجھتا ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ زبان عام فہم ہونا چاہئیے ہر کس و ناکس سمجھ سکے۔ یہ طبقہ ہندی کے ٹھیٹ الفاظ لانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ فارسی عربی الفاظ کے ساتھ ان کی ترکیبوں کو بھی حذف کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو بین بین چلنا چاہتا ہے اس کا کہنا یہ ہے کہ زبان ایسی ہو جو علمی بھی ہو اور عام فہم بھی۔ اتنا معیار بڑھانا بھی اچھا نہیں کہ اردو فرشتوں کی زبان ہو کر رہ جائے اور اتنا گھٹانا بھی ٹھیک نہیں کہ علمی مضامین ہماری زبان میں آنے سے گریز کرنے لگیں۔

موپاساں کا ایک شاہکار　　　　سالانہ نمبر کیلئے

روزلی

مترجمہ وسیم علوی بی اے۔ (فاضل)

اس معاملہ میں یہ ایک سربستہ راز تھا جس کا علم نہ تو اہالیٔ جوری اور صدر عدالت کو ہو سکا اور نہ مدعی عامہ خود اس سے واقف تھا۔

موراندیش روزلی [illegible] کے ایک بڑے کارخانہ میں ملازم تھی۔ وہ حاملہ ہوگئی تھی اور جب اس کا حمل پورا ہوگیا تھا تو رات ہی رات — جبکہ اس کے مالکوں کو ذرا بھی علم نہ تھا — اس نے اپنے نوزائیدہ بچہ کو مار ڈالا تھا اور باغ ہی میں ایک جگہ کسی گوشہ میں اسے دفن کردیا تھا — یہ تھی مقدمہ کی روداد —

اسی قسم کی اطفال کشی عام طور پر اور لڑکیوں نے بھی جو کارخانوں میں ملازم تھیں کی تھیں۔ لیکن روزلی کے اس مقدمہ میں ایک خاص بات تھی جس کی توضیح نہ ہو سکی۔ پولیس نے اس کی خانہ تلاشی لی تھی۔ اور ایک بچے کے لئے سارے سامان برآمد ہوئے جنھیں خود روزلی نے فراہم کئے تھے اور گذشتہ مسلسل راتوں کو کاٹ کر سئے تھے۔ عدالت میں وہ بنیا بھی شہادت دینے آیا تھا جہاں سے روزلی ان سامانوں اور موم بتیوں کو خود اپنی مزدوری کے پیسوں سے خرید کر لائی تھی ......

عدالت کے روبرو ایک بڑا مجمع تھا اور جوق درجوق مرد اور عورتیں مقدمہ کی روداد اور فیصلہ سننے کی منتظر تھیں —

مدعا علیہا ایک نوجوان حسین دوشیزہ تھی جو تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ سلیقہ مند بھی تھی۔ اس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی اور عدالت کے کسی سوال پر وہ کوئی جواب نہ دیتی جس کی وجہ سے خود عدالت کو اور سارے تماشائیوں کو یقین ہو چلا تھا کہ ملزمہ نے ضرور ایک مایوسی اور وحشت کے عالم میں اس فعل قبیح کا ارتکاب کیا ہے۔ ورنہ وہ اس معصوم بچہ کو آخر کیوں مار ڈالتی اور اس کی باقاعدہ پرورش کیوں نہ کرتی؟ —

جج نے پھر آخری بار کوشش کی کہ ملزمہ کچھ اپنی زبان سے بولے یا جرم کا اقبال کرے۔ اور نہایت نرمی سے اس کی خاطر جمعی کی کہ وہ اور سارے اہالیٔ جوری اسے سزائے موت نہ دیں گے اور ممکن ہے کہ اس پر مہربانی بھی کریں۔

تب ملزمہ نے بولنے کا ارادہ کیا اور چاہا کہ حقیقت کا انکشاف کردے۔

"ہاں! پہلے یہ تو بتاؤ کہ اس بچہ کا باپ کون ہے؟" — جج نے سوال کیا۔

اس وقت تک روزلی نے اس کا نام بتانے سے انکار کردیا تھا۔ لیکن پھر اپنے ان مالکوں پر جنھوں نے اس پر الزام قائم کیا تھا ایک نظر ڈال کر یک بیک بولی —

"یوسف — ولیم کا بھتیجہ"

اس جواب پر ایک طرف سے کچھ لوگ اپنی کرسیوں پر سے اُٹھ کر بیک آواز چلا اٹھے "بالکل جھوٹ ہے غلط کہتی ہے"۔
جج نے مجمع کو خاموش کیا اور پھر روزلی کی طرف مخاطب ہوا "اچھا! بتاؤ پھر یہ سب واقعہ کیسے ہوا؟"
وہ اپنے قلب کی تیز حرکت سن رہی تھی۔ اس نے اپنے جذبات اور دماغی کشمکش پر قابو پاکر بے باکانہ یوں کہنا شروع کیا
—"ہاں یہی یوسف جب پارسال چھٹی پر آیا"— "تو پھر کیا ہوا؟"— اور یہ یوسف کیا کام کرتا ہے؟
"حضور!"— روزلی بولی— "وہ اسی کارخانہ کا ایک مالک ہے۔ اور گرمیوں میں گھر ہی پر دو مہینہ رہتا ہے جب وہ شروع شروع محبت بھری نگاہوں سے مجھے بغور دیکھتا تو میں اسکا کوئی خیال نہ کرتی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ مجھ سے اظہار محبت کرنے لگا۔ وہ میرے حسن کی تعریف کرتا۔ مجھے سبز باغ دکھاتا اور طرح طرح کی باتیں کرکے مجھے پھسلاتا۔
بالآخر میں اس کی باتوں میں آگئی۔ وہ مجھ سے برابر کہا کرتا— تم کتنی خوبصورت ہو۔ مجھے تم سے بڑی محبت ہے۔ شاید مشیت نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ہی پیدا کیا ہے— اور تب— میں بھی اس کی طرف مائل ہونے لگی۔ آخر میں کیا کر سکتی تھی؟ وہ مجھ سے تنہائی میں یہ سب پیار و محبت کی باتیں کرتا اور میں انھیں سننے پر مجبور تھی .... کیونکہ .... میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ نہ کوئی میرا مونس ہے نہ غمخوار۔ نہ میرے باپ ہیں نہ ماں۔ نہ بھائی۔ نہ بہن— کوئی بھی نہیں— ایسی بے بسی کے عالم میں جب وہ مجھ سے نہایت (برادرانہ) خلوص اور محبت سے باتیں کرتا تو میں سمجھنے لگتی گویا میرا بھائی ہی گفتگو کر رہا ہے۔
پھر اس نے ایک شام کو مجھ سے دریا کی سیر کرنے کو کہا تاکہ ہم دونوں وہاں آپس میں گفتگو کر سکیں اور کوئی مخل نہ ہو سکے۔ میں اسکے ساتھ گئی— پھر مجھے مطلق خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ وہ مجھے اپنے پہلو میں لئے ہوئے تھا۔ دراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ ----- نہیں!۔ نہیں! ----- میں کچھ نہ کر سکی۔ مجھے تکلیف سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں لڑ رہی تھی— اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا— نہیں!— میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں— ایک غریب و بے بس لڑکی— کچھ نہ کر سکی اور اس نے اپنی ہوس پوری کر لی ----- یوں تین ہفتے سے زائد گذر گئے جبتک وہاں قیام تھا۔
میں ضرور روئے زمین کے چپہ چپہ پر— دنیا کے گوشہ گوشہ میں— اسکا تعاقب کرتی— اس کی جستجو کرتی مگر وہ چلا گیا تھا— میں نہیں جانتی تھی کہ میں ---ہوں۔ مجھے اس مہینہ تک اس کا مطلق علم نہ تھا جبکہ ...
یہ کہہ کر روزلی زار و قطار رونے لگی۔ اور کچھ دیر تک عدالت کو ٹھہرنا پڑا تاکہ اسے خاطر جمعی حاصل ہو جائے۔
تب جج نے نہایت ملائمت سے اسے مخاطب کرکے استفسار کیا— "اچھا تو پھر کیا ہوا؟"
وہ پھر گویا ہوئی— جب مجھے اپنی اس حالت کا احساس ہوا۔ تو میں مریم سے ملنے گئی جو وہاں— عدالت کے روبرو— کھڑی ہے۔ میں نے اس سے صلاح لی کہ آخر اب کیا ہوگا۔ اور تب اسی روز سے ہم راتوں کو میں ایک بچہ کے لئے سی ٹانک کر کپڑے

مرتب کرنے لگی ۔ مجھے اب دوسرے مکان کی تلاش تھی اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ اب وہاں میرا رہنا ممکن نہیں ــــ لوگ مجھے اب وہاں سے نکال دیں گے ــــ لیکن میں وہیں اسی مکان میں آخری وقت تک ٹھہرنا چاہتی تھی اس لئے کہ میرے پاس کوئی رقم نہ تھی اور جو کچھ تھی بھی اسے میں پس انداز کرنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے اب ہونے والے بچہ کی ضروریات بھی پوری کرنی تھیں "۔

"تو کیا تمہارا قصد اس بچہ کو مار ڈالنے کا نہ تھا" ؟ ــــ

"نہیں ــــ حضور! ــــ ہرگز نہیں" ــــ روزلی نے جواب دیا ــــ

"تو پھر تم نے اسے کیوں مار ڈالا" ؟ ــــ بولو ــــ جواب دو ؟ ــــ

"حضور! واقعہ یہ ہے ــــ کہ ــــ یہ تو میرے بھی قیاس سے بالاتر ہے ــــ میں باورچی خانہ میں طشتریوں کو دھو کر صاف کر رہی تھی اور مریم اور اس کے شوہر ــــ جو یہیں عدالت کے روبرو کھڑے ہیں ــــ دونوں محو خواب تھے ۔ میں اٹھ کر بدقت برآمدہ تک گئی اور وہیں فرش پر لیٹ رہی ۔ اور شاید دو تین گھنٹے پڑی رہی کہ ــــ مجھے اس قدر درد ہوا کہ میں نہیں کہہ سکتی اور تب ــــ میں نے "اسے" اپنی پوری طاقت سے باہر کی طرف کھینچ لیا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا وہ (بچہ) پیدا ہو گیا ۔ اور میں نے اسے گود میں اٹھا لیا" ــــ آہ! ــــ

مگر یقین جانئے کہ میں خوش تھی اور میں نے یہ سب مریم ہی کے کہنے پر عمل کیا تھا ۔ میں نے بچہ کو اپنے بستر ہی پر لٹا دیا ۔ میں شدید درد و تکلیف کی وجہ سے مری جا رہی تھی ۔ کاش میں اس وقت مر گئی ہوتی! ــــ درد میرے لئے ناقابل برداشت ہوا جاتا تھا ۔ میں اپنے گھٹنوں پر گر پڑی اور پیٹھ کے بل فرش پر لیٹ گئی ۔ لیکن مجھے پھر شدید درد اٹھا ۔ شاید گھنٹہ دو گھنٹہ تک میں وہاں بالکل تن تنہا پڑی تھی ۔ اور اتنے میں ایک اور بچہ پیدا ہوا ۔ اسے بھی میں نے پہلے بچہ کی طرح گود میں لے لیا اور بستر پر لٹا دیا ــــ ہاں! ــــ دو بچے میرے پاس ہی پڑے تھے ــــ بتائیے ؟ ــــ کیا یہ میرے لئے ممکن تھا کہ میں ــــ جو صرف مہینہ میں بیس روپے کماتی تھی ــــ ان دونوں بچوں کی کفیل ہو سکتی تھی ؟ ــــ آپ ہی کہئے یہ کیسے ممکن ہے ــــ اگر ایک بچہ ہوتا ۔ تو خیر بھلے برے کسی طرح انتظام ہو جاتا ــــ لیکن دو بچوں کے لئے ــــ قطعی ناممکن ــــ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا ۔ میرے ہوش و حواس درست نہ تھے ۔ میں کیا جانتی تھی ؟ کیا میرے لئے کوئی تدبیر تھی ؟ ــــ ایسی صورت میں ــــ بتائیے! آخر میں کیا کر سکتی تھی ــــ ایسے موقع پر ــــ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میرا آخری وقت آ گیا ہے ۔

میں نے تکیہ کو ان دونوں بچوں کے اوپر رکھ دیا ــــ بے خبری کے عالم میں (مجھے اس کا خیال نہ تھا) ــــ کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے ؟ ــــ آخر میں دونوں کی داشت کیسے کر سکتی تھی ــــ تکیہ پر سر رکھ کر میں کرب و بے چینی کے عالم میں پیہم کروٹیں بدلتی رہی یہاں تک کہ شب کی ظلمت دور ہو گئی ۔ صبح کی روشنی پھیلنے لگی اور روشندان سے ہو کر اندر آ ئی ۔

دونوں بچے تکیہ کے نیچے مردہ پڑے تھے ۔ ان دونوں کو میں نے گود میں لئے زینہ سے ہو کر نیچے باغیچہ میں اتری ۔ مالی کی کدال لی اور تھوڑی سی زمین کھود کر انھیں دفن کر دیا ۔ میں نے دونوں کے لئے دو جگہ گہرے سوراخ کھود رکھے تھے اور

انھیں الگ الگ دفن کیا تھا تاکہ یہ دونوں معصوم بچے ۔۔۔ (اگر ان میں قوت گویائی آجائے) ۔۔۔ تو ۔۔۔ اپنی ماں کے متعلق گفتگو نہ کرسکیں ۔۔۔ میں بھلا ان سب چیزوں کے متعلق کیا جانتی تھی؟"۔۔۔

"پھر ۔۔۔ میں اپنے بستر پر واپس آگئی۔ میں اس قدر تھک رہ گئی تھی کہ اٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ مریم اور اس کے شوہر نے ڈاکٹر کو بلایا اور وہ مجھے دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا ۔۔۔ حضور! یہ ہے اصل واقعہ ۔۔۔ اور حقیقت جو میں نے عدالت کے روبرو سچ سچ کہدی ۔۔۔ اب آپ جو چاہئے میرے حق میں فیصلہ کیجئے ۔۔۔ میں تیار ہوں"۔۔۔

تقریباً آدھے اہالی جوری دم بخود تھے اور اس انکشاف حقیقت پر ۔۔۔ آنسو ضبط کئے ہوئے تھے۔ عدالت کے کمرہ میں جو عورتیں تھیں وہ بھی سسکیاں بھر رہی تھیں۔

جج نے روزلی سے پوچھا۔ "تم نے دوسرے بچہ کو کہاں سپرد خاک کیا ہے؟" "وہی جو آپ کے سامنے ہے"۔۔۔ اس نے جواب دیا ۔۔۔

اچھا یہ بچہ! ۔۔۔ "یہ تو بنفشہ کے پھولوں کے پاس پڑا تھا"

"آہ! ۔۔۔ "تو دوسرا کنوئیں کے کنارے نسرین کے قریب دفن ہے" ۔۔۔ اور ۔۔۔ پھر ۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کی ندی بہ نکلی اور وہ ایسی دردناک سسکیاں بھرنے لگی کہ کوئی بھی ضبط نہ کرسکا اور بے اختیار سب کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

دوراندیش روزلی کو عدالت نے رہا کردیا۔

غیر مطبوعہ — خاص شاہکار کیلئے

صنمیاتِ ہند

از حضرت علامہ نیاز فتحپوری

اس سے قبل ہند علم الاصنام پر دو تقریریں کر چکا ہوں، پہلی تقریر میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ہندوؤں کی اصنامی روایات اور ان کے ماخذ کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد ایک شخص کس نتیجہ پر پہونچتا ہے اور دوسری تقریر میں رامائن و مہابھارت پر جو صنمیات ہند میں خاص مرتبہ کی چیزیں ہیں، ایک نقابی تبصرہ کیا گیا تھا آج کی صحبت میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوؤں کے اصنامی روایات کتنے عنوانات اور ادوار کے ماتحت تقسیم کیجا سکتی ہیں اور ہر عنوان یا دور میں کس روایت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے

سب سے پہلا دور ہندوستانی صنم پرستی کا وہ ہے جسے ویدوں کا زمانہ کہتے ہیں، دوسرا عہد پرانوں دیوتاؤں کا ہے" اور تیسرا دوسرے درجہ کے دیوتاؤں اور دیویوں کا۔

چونکہ انسان کو آنکھ کھولتے ہی جو چیزیں نظر آئیں وہ آسمان و زمین تھے، اس لئے قدرتاً وہ انھیں سے زیادہ متاثر ہوا ہے اور سب سے پہلے انھیں کے سمجھنے کی اس نے کوشش کی۔ چنانچہ ویدک زمانہ کے سب سے قدیم اور اہم دیوتا وہی ہیں جن کو انھیں دو چیزوں کی مرموز یعنی (SYMBOLISED) صورتیں سمجھنا چاہئے۔ اور جن کا نام اس نے دیوس اور پرتھوی رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ آریہ قوم کی قدیم ترین دیویاں بھی دو ہیں۔ اور بعض جگہ ان کو کائنات کا خالق و محافظ بتایا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خالق اکبر اور قادر مطلق ہونے کی صفتیں کبھی ان سے منسوب نہیں کی گئیں۔ خدائے بزرگ کا تصور جیسا کہ ویدوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، انھوں نے برہما یا برہم کے پیکر میں کیا اور اس کی جو صفات بیان کیجاتی ہیں وہ وہی ہیں جو کسی بڑی سے بڑی موحد قوم کے روایات میں پائی جاتی ہیں۔

جب قدیم آریہ جماعت نے آسمان و زمین کے یہ دو نام متعین کر لئے تو انھوں نے دیکھا کہ آسمان میں سب سے زیادہ مفید و کارآمد چیز جس پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے، آفتاب ہے اور زمین میں آگ، اسی طرح فضا میں ہوا کی اہمیت ان پر ثابت ہوئی تو دیوس اور پرتھوی کا غیر محدود تخیل تنگ کر کے ان میں سے ان تینوں کی پیدائش قرار دیکر علیحدہ علیحدہ نام سے موسوم کیا یعنی آفتاب کو سوریا، آگ کو اگنی اور ہوا کو وایو یا اندر کے نام سے پکارنے لگے۔

ان دیوتاؤں کو ہر چند انھوں نے غیر فانی سمجھا اور سمجھنا چاہئے تھا کیونکہ روز اور ہمیشہ انھیں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن قدیم آریہ قوم کے علوئے ذہن کا کمال سمجھنا چاہئے کہ مخلوقات سے علیحدہ انھیں کبھی قرار نہیں دیا اور از خود پیدا ہونے والے خدا کے مرتبہ سے انھیں ہمیشہ نیچے ہی رکھا۔

ویدوں میں ان تینوں دیوتاؤں کا بکثرت ذکر پایا جاتا ہے اور ہر ایک کے متعلق علیحدہ علیحدہ نغمہ ہائے عبادت

درج کئے گئے ہیں۔ گایتری جو ویدوں کا سب سے زیادہ مشہور و مقدس منتر ہے اور جس کو یاد کئے بغیر کوئی برہمن برہمن ہو ہی نہیں سکتا۔ سوریا دیوتا ہی کی تعریف میں ہے — اندر دیوتا ہواؤں اور بادلوں کا دیوتا ہے اور ویدوں میں نسبتاً اس کا ذکر زیادہ پایا جاتا ہے اور اس کی عظمت و جلال کے بہت سے فسانے ان میں درج ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں گرمی کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے اس لئے جب مہینوں کی جھلسا دینے والی گرمی کے بعد بارش کی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتی ہیں تو لوگوں میں جان پڑ جاتی ہے اور کسان کھیتی کے کاروبار میں لگ کر خوش خوش نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی اندر دیوتا کی تعریف ویدوں میں بکثرت نظر آتی ہے۔

اندر کے بعد اگنی دیوتا کا مرتبہ ہے اور اس کی تعریف سے بھی ویدوں کا لٹریچر مالا مال ہے، چونکہ انسانی معاشرت کیلئے آگ کا وجود نہایت ضروری ہے اس لئے یہ دیوتا نوع انسانی کا محافظ اور گھریلو زندگی کا امن و سکون اسی سے متعلق سمجھا جاتا ہے ان تینوں دیوتاؤں کے ماتحت اور بھی بہت سے دیوتا اور دیویاں پائی جاتی ہیں، لیکن ان کو کوئی علٰحدہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔

پرانوں میں بہ نسبت ویدوں کے بہت زیادہ دیوتا کا ذکر نظر آتا ہے لیکن اصل دیوتا تین ہی ہیں جو تری مورتی کے نام سے مشہور ہیں۔ یعنی برہما، وشنو اور شیو۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ تینوں مل کر ایک ہی دیوتا قرار پاتے ہیں اور یہ تینوں الفاظ گویا ایک ہی خدا کی تین علٰحدہ صفات ہیں۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق اکبر اور علت العلل کی حیثیت جس سے تمام کائنات وجود میں آئی اور جو زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے برہما کی ہے۔ لیکن بعض بیانات سے وشنو کا بھی یہی مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔

برہما کو خالق، وشنو کو محافظ، اور شیو کو فنا کرنے والا دیوتا کہتے ہیں، لیکن میری رائے میں یہ تینوں صفاتی نام ہیں ایک ہی خدا کے جو پیدا کرنے کے بعد ایک وقت خاص تک زندہ رکھتا ہے اور پھر فنا کر دیتا ہے۔ ویدوں میں برہما اور وشنو کا ذکر تو پایا جاتا ہے لیکن شیو کا نہیں، بعض اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ویدوں میں جس کا ذکر رودر کے نام سے کیا گیا ہے وہ یہی شیو ہیں۔

برہما کی ماتحت، دیویوں میں صرف ایک دیوی سرسوتی کا نام نظر آتا ہے جو برہما کی بیوی بتائی جاتی ہے اور علوم و فنون کی ترقی اس سے متعلق ہے، اسی طرح وشنو کی بھی صرف ایک ہی معاون دیوی ہے جس کا نام لکشمی ہے۔ یہ وشنو کی بیوی ہے اور حسن و محبت اور خوشحالی کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔ شیو سے البتہ بہت سے اوتار پیدا ہوئے جن میں بعض حیوانات سے متعلق تھے مثلاً مچھلی کا اوتار، سور کا اوتار، شیر کا اوتار، سانپ کا اوتار، لیکن وشنو کے تمام اوتاروں میں سب سے زیادہ مشہور رام چندر جی اور کرشن جی ہوئے ہیں۔

رام چندر جی کی جو سیرت رامائن میں پیش کی گئی ہے اور جن صفات بلند سے انھیں متصف کیا گیا ہے، وہ حقیقتاً نہ صرف دنیائے انسانیت بلکہ عالم ملکوت میں بھی ایک آئیڈیل حیثیت رکھتی ہے، اسی طرح جب کرشن جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے علم الاصنام میں جس وقت انسانی عنصر کا شمول شروع ہوا ہے تو ان

کا ذہن کتنا ترقی یافتہ ہو چکا تھا اور انسان و انسانیت کا جو تصور انھوں نے قائم کیا تھا وہ کتنا پاکیزہ و بلند تھا۔ کرشن جی کی سیرت میں رادھا جی کا وجود بہت نمایاں چیز ہے جس نے نہ صرف ہندی لٹریچر بلکہ موسیقی کو بھی نہایت رنگین و دلکش بنا دیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ کرشن جی کی عاشقانہ زندگی میں بعض ایسی باتیں بھی نظر آتی ہیں جو اخلاق کے معیار سے گری ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکن اول تو ان کا آج کے اخلاق کے نقطہ نظر سے دیکھنا ہی تنقیدی بے اصولی ہے اور دوسرے یہ کہ ممکن ہے اس سے مقصود ایک آئیڈیل نسوانی کیرکٹر پیش کرنا ہو۔ اور جس طرح بعض مرتبہ محض بیک گراؤنڈ کی شوخی سے اصل نقش کو ابھارنا مقصود ہوتا ہے اسی طرح کرشن جی کا ضمنی کیرکٹر شامل کرکے رادھا جی کی خصوصیات نسائی کو پیش کیا ہو۔ کرشن جی کی سیرت کے سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ قیمتی ہم کو نظر آتی ہے وہ ان کے فلسفیانہ ارشادات ہیں جن میں زندگی کے کسی پہلو کو ترک نہیں کیا گیا ہے اور جن کے ذریعہ سے اخلاق کی بلند تعلیم دی گئی ہے۔ پرانوں کے زمانہ کے اوتاروں میں علاوہ رام چندر جی اور کرشن جی کے اوتار پاربتی اور درگا بھی خاص درجہ کی دیویاں سمجھی جاتی ہیں جو شیو کی بیویاں تھیں۔ اوما ہر چند عقل و فراست کی دیوی سمجھی جاتی ہے لیکن درگا اور پاربتی کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ پاربتی کے بہت سے اور نام بھی ہیں اور ہر نام کے لحاظ سے مخصوص خدمات اس کے سپرد ہیں۔ بھوانی ہونے کی حیثیت سے وہ استقرار حمل کی دیوی ہے۔ مہا دیوی ہونے کے لحاظ سے وہ مہادیو کی سکتی ہے۔ کالی کی حیثیت سے وہ گویا ڈیانا ہے۔ درگا بھی خاص مرتبہ کی دیوی ہے جس کی پوجا دسہرہ کے زمانہ میں عام طور پر ہر جگہ کی جاتی ہے اور مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔

درجہ دوم کے اوتاروں میں جن کا مرتبہ پرانوں کے اوتاروں سے گرا ہوا ہے وہ ہیں جنھیں رشیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یوں تو بلحاظ تخلیق وہ برہما جی کے دل و دماغ سے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن بلحاظ خدمات وہ اتنے زیادہ اہم نہیں ہیں۔ ان "الوہیت زادوں" میں جن کا نام "برہم رشی" بھی ہے نو کا ذکر پرانوں میں پایا جاتا ہے۔ مہابھارت میں البتہ صرف چھ کا بیان ہے۔

اسی درجہ میں وہ دیوتا بھی شامل ہیں جو نصف الوہیت رکھتے ہیں اور ان کا بیان رامائن و مہابھارت میں پایا جاتا ہے۔ رامائن کے ان نیم دیوتاؤں میں سگریو اور ہنومان بہت مشہور ہیں جنھوں نے بندروں کی سیاست میں راون کے خلاف رام چندر جی کی مدد کی تھی۔

مہابھارت میں بھی اس نوع کے دیوتا متعدد پائے جاتے ہیں جن میں بھیم اور ارجن اور یدھشٹر کے نام سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ ہندو علم الاصنام میں ایک حصہ ان دیوتاؤں کا بھی ہے جو اجرام فلکی سے متعلق ہیں۔ مثلاً آدتی جو سوریا یعنی آفتاب کا دوسرا نام ہے۔ یا چاند جسے سوم یا چندر کہتے ہیں اسی طرح منگل۔ بدھ۔ برہسپت۔ شکر اور سنی سب کا شمار دیوتاؤں میں ہے۔

دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ایک جماعت عفریتوں کی بھی مانی جاتی ہے جو دیوتاؤں کی مخالفت کرتے رہتے ہیں اور پرانوں میں ان کا ذکر جابجا پایا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض حیوانات و نباتات اور چند دریا بھی ان کے یہاں مقدس مانے جاتے ہیں

اور علم الاصنام ہی میں ان کا شمار ہے، جانوروں میں ہاتھی کا تقدس اس لئے ہے کہ وہ اندر کی سواری میں رہتا تھا۔ بیل شیو کی سواری کی وجہ سے۔ شیر درگا کا مرکب ہونے کی وجہ سے اور مینڈھا اگنی کی سواری کے سبب سے مقدس مانا گیا ہے۔ چڑیوں میں مس۔ طاؤس۔ گدھ اور اُلو کے تقدس کا سبب بھی یہی ہے کہ کسی نہ کسی دیوتا کی سواری یا معیت کا فخر انھیں حاصل ہوا تھا گائے کا تقدس اس لئے نہیں ہے کہ اس پر کسی دیوتا نے سواری کی بلکہ صرف اس بنا پر کہ برہما نے اسے برہمنوں کے ساتھ ساتھ پیدا کیا تھا۔

درختوں میں برگد۔ پیپل اور بیل اس لئے مقدس سمجھے جاتے ہیں کہ شیو ان کو بہت پسند کرتے تھے اور تلسی کے متعلق روایت بیان کیجاتی ہے کہ یہ ایک عورت تھی جس نے ایک زمانہ تک پوجا کرنے کے بعد وشنو سے شادی کی خواہش کی، لکشمی یہ سن کر بہت برہم ہوئی اور اسے درخت میں تبدیل کر دیا۔ لیکن وشنو نے اپنے پرستاروں سے کہا کہ گھبراؤ نہیں، جہاں تلسی درخت ہوگا میں اس کے پاس ہی رہونگا۔ چنانچہ وشنویوں کا تلسی کی پرستش اسی وجہ سے ہے۔ ہندوؤں میں یوں تو تمام دریاؤں کا احترام کیا جاتا ہے۔ لیکن مخصوص طور پر گنگا بہت زیادہ مقدس سمجھی جاتی ہے کیونکہ وہ شیو کی لٹ سے نکلی ہے۔

یہ تھا نہایت ہی مختصر سا بیان ہندوؤں کے ان مخصوص دیویوں دیوتاؤں اور مقدس چیزوں کا جو سب ملکر یہاں کے علم الاصنام کو مجموعی حیثیت سے ایک علیحدہ علم و فن کی حیثیت دیتے ہیں۔ میں نے ان روایات کو نظر انداز کر دیا ہے جو دیوتاؤں اور اوتاروں کے ساتھ ان کے پرستاروں کے جذبات کی توجیہہ مستقبل میں پیش کی جاتی ہیں۔ کیونکہ اول تو ان میں باہمدگر بہت اختلاف پایا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ ایک مختصر سی تقریر میں اس کی گنجائش بھی نہ تھی۔ لیکن جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ ہندوؤں کا اصنامی لٹریچر فی الحقیقت صرف شاعرانہ بیان ہے ان جذبات کا جو ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد آریہ قوم میں یہاں کے ماحول سے پیدا ہوئے اور ترقی تمدن کے سلسلہ میں ان کو برابر متاثر کرتے رہے۔ ورنہ حقیقی مذہب ان کا سوائے خالص وحدانیت کے اور کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ آج بھی جبکہ ہندوستان اختلاف مسالک کے لحاظ سے مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو چکا ہے محض ہندو ہونے کے نقطہ نظر سے سب ایک ہیں۔

ایک جماعت صرف رام کی پرستش کرتی ہے، دوسری کرشن جی کی پوجا کرتی ہے۔ کوئی شیو پرست ہے اور کوئی وشنوی کوئی گنیش کو مانتی ہے اور کوئی مہادیو کو لیکن یہ ہیں سب ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں اور ان میں باہمدگر کوئی ایسا اختلاف نہیں پایا جاتا جو ان کے اجتماعی شیرازہ کو منتشر کرنے والا ہو۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہندو مذہب کا مقصود صرف متحدہ معاشر و متحدہ تہذیب کا پیدا کرنا ہے اور وہ اس سے مطلق بحث نہیں کرتا کہ کون کس کا ماننے والا ہے ان کا فلسفہ عبادت صرف یہ ہے کہ ذہن و خیال کو کسی ایک مرکز پر لا کر اپنے اخلاق میں تبدیلی پیدا کیجائے۔ خواہ یہ مرکزیت مہادیو کی مورتی سے پیدا ہو یا گنیش کے بت سے۔ ان کی نگاہ ذریعہ و آلہ پر نہیں ہے بلکہ اس چیز پر ہے جو اصل مقصود ہے وہ راہوں کے اختلاف پر آپس میں جنگ نہیں

کرتے کیونکہ انھیں معلوم ہے یہ سب ایک ہی منزل پر جاکر ختم ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں معبودوں کی کثرت اس لئے نہیں ہے کہ وہ واقعی خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک گردانتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ بظاہر قدرت کی بوقلمونی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لئے خود ان کی پرستاریاں کس قدر بیتاب ہیں۔ اور اقتضا فطرت کے سانچے میں ڈھل جانے کی کتنی زبردست اہلیت ان میں پائی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان صوفیہ کے یہاں بھی یہی چیز ہمہ اوست کے رنگ میں نظر آتی ہے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں میں تصوف اور مذہب دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں اس لئے ہمارے صوفیہ کا یہ رنگ کوئی مسلمہ اجتماعی کیفیت نہیں رکھتا اور ہندوؤں کا ہر ہر فرد خواہ وہ کسی مسلک سے متعلق ہو صرف اس فلسفہ کا تابع ہے کہ۔

"ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد"

نوٹ :۔ مولانا نیاز فتحپوری نے یہ مقالہ جو ستمبر ۱۹۳۷ء کو دہلی سے نشر ہو چکا ہے شاہکار کیلئے عنایت فرمایا۔ مدیر۔

بغداد خاتون

(از جناب قاضی محمد حسین صاحب ایم اے ۔ دارالترجمہ حیدرآباد دکن)

جس طرح بعض وقت گھوڑا قابو سے باہر ہو کر رواں ہو جاتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی قلم بھی بے اختیار ہو کر رواں ہو جاتا ہے ۔ موجودہ مضمون کچھ اسی قسم کی روانئ قلم کا نتیجہ ہے ۔ اس کا محرک کانفرنس گرٹ کا ایک فقرہ ہوا جس کا ذکر آگے آتا ہے، اس فقرے سے میرا ذہن بغداد خاتون کے واقعہ کی طرف منتقل ہوا، چاہا کہ اس واقعہ کو مختصراً قلمبند کر دوں مگر جب قلم اٹھایا تو دوسرے مماثل و معاون خیالات نے بھی ہجوم کیا، ان جملہ خیالات کا احصا تو دشوار تھا مگر جن چند خیالات کو ضبط تحریر میں لانا چاہا وہ بھی ایک سلک میں منظم نہ ہو سکے مقطعات کی صورت پیدا ہو گئی ۔ اب یہ درحقیقت دو مضمون ہو گیا شمارہ (۱)، (۲) و (۳) یورپی اور شمارہ (۳) (۴)، (۵)، (۶) و (۷) مشرقی اور اس جزو دوم میں بھی شمارہ (۳) و (۴) بمنزلہ تمہید ۔ اندریں صورت عنوان بے ربط سا ہو گیا ۔ ممکن تھا کہ عنوان بدل دیا جاتا مگر مسز سمپسن کے مراحل اور بغداد خاتون کے وقائع میں تقابل تام پایا جاتا ہے ۔ اور اس طرح مضمون میں ایک طرح کا تسلسل اور نتیجے (۸) میں ماحصل کل موجود ہے، لہذا عنوان کو بدستور رہنے دیا ۔

یہ مضمون مارچ میں لکھا گیا تھا اور خیال تھا کہ مئی میں شائع ہو سکے گا کہ وہ ایک مناسب موقع تھا مگر بعض مجبوریوں سے مضمون پر نظر ثانی نہ ہو سکی، اب شاہ اڈورڈ کے معاملہ کی وقتی دلچسپی تو زائل ہو گئی البتہ تاریخی دلچسپی قائم ہے اور قائم رہے گی نتیجہ حاصلہ اپنی جگہ برقرار ہے ۔

(۱)

۱۵۳۲ء میں تخت انگلستان پر ہنری ہشتم متمکن تھا، ارگان کی شہزادی کیتھرائن اس کی زوجیت میں تھی، عقد کو تئیس برس گزر چکے تھے ۔ ہنری کی عیش پرست طبیعت اب ایک عورت این بولین کی طرف مائل ہو گئی این بولین نے داشتہ بن کر رہنے سے انکار کر دیا، اور کیتھرائن کی موجودگی میں ہنری کا دوسرا عقد قانون کلیسا مروجہ یورپ کے خلاف تھا، مگر سوال مذہب کا نہیں تھا، عشق کا تھا، عشق کا حکم ہوا کہ ۔

اگر تو عاشق عشقی و عشق را جویا ۔۔۔ بگیر خنجر تیز و ببر گلوے حیا
بداں کہ سد عظیم است در روش ناموس ۔۔۔ حدیث بیغرض است ایں قبول کن بصفا

ہنری نے کیتھرائن کو طلاق دینے کا عزم کر لیا، لیکن اس وقت کلیسائے انگلستان پوپ کے تابع تھا طلاق

کے لئے پوپ کی منظوری درکار تھی، اور اس منظوری کا ملنا دشوار تھا' ہنری اگرچہ بڑی عظمت و سطوت کا بادشاہ تھا' مگر کیتھرین بھی کوئی معمولی عورت نہ تھی - اسپین کے مشہور بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازبیلا کی بیٹی اور شہنشاہ وقت چارلس پنجم[1] کی خالہ تھی شہنشاہ کو ناخوش کرنا پوپ کے لئے آسان نہ تھا، پوپ نے معاملہ کو لیت و لعل میں ڈالا' ہنری نے اپنا غصہ اپنے وزیر وولزی پر اتارا کہ اسی کی سوء تدبیر نے کام کو بگاڑا' وولزی نہ صرف دنیاوی اعتبار سے بہت ہی با اقتدار و کامیاب وزیر تھا بلکہ کلیسا میں بھی کارڈنل کا درجہ رکھتا تھا اور توقع تھی کہ پوپ ہو جائے گا لیکن ہنری کے دست تطاول کے سامنے یہ سب ہیچ تھا' ہنری نے وولزی کے تمام خدمات کو فراموش کر دیا' اسے نہایت درجہ ذلیل کیا اور اسی ذلت میں وولزی کا انتقال ہو گیا[2] - وولزی کو معزول کر کے ہنری نے بہ یک قلم کلیسائے انگلستان سے پوپ کے اقتدار کو منسوخ کر دیا' خود کلیسا کا سر گردہ بن گیا - اب کیا تھا

قطرۂ خورشید را حکم چکیدن دہم　　تشنہ لب عشق را ذوق چشیدن دہم

کیتھرین کو طلاق دے دی اور این بولین سے عقد کر لیا' این بولین کی تاجپوشی بڑی طمطراق سے ہوئی، مطیع و منقاد پارلیمنٹ نے اپنے متواتر قوانین سے یہ سب کچھ منظور کر لیا لیکن کسے معلوم تھا کہ :-

عشق بیش از تیغ تیزی کردہ است　　بے قیامت رستخیزی کردہ است

عقد کو تین برس ہی ہوئے تھے کہ ہنری کی طبیعت این بولین کی طرف سے ہٹ گئی - زنا کا الزام لگا کر اسے قتل کرا دیا (۱۵۳۶ء) چند ہی روز کے اندر اندر جین سیمور سے عقد کیا' اس عورت کا ۱۵۳۷ء میں انتقال ہو گیا ۱۵۴۰ء میں ہنری نے سیاسی اغراض کی بنا پر ڈیوک کلیوس کی بہن این سے نسبت قرار دی' وہ سیاسی اغراض تو فوت ہو گئے مگر ہنری نے اپنی اطلاع کی بنا پر این کی نسبت یہ تصور قائم کر لیا تھا کہ وہ بہت ہی حسین ہے اس لئے ہنری اپنی رائے پر قائم رہا اور این سے عقد کر لیا - این جب انگلستان آئی تو ہنری کو معلوم ہوا کہ :-

با کہ باختہ ام عشق در شب دیجور

ہنری نے کلیسا کے تمام احکام و قوانین کے علی الرغم اسے بلا تامل طلاق دیدی اسی سال (۱۵۴۰ء) میں

---

[1] ۹۶۲ء میں "مقدس رومی شہنشاہی" کی بنا پڑی' جرمنی کے سات حکمراں (جن میں کلیسائی حکمراں بھی شامل تھے) شہنشاہ کا انتخاب کرتے تھے ۱۵۱۹ء میں اسپین کا بادشاہ چارلس اول چارلس پنجم کے لقب سے "رومی شہنشاہ" منتخب ہو گیا تھا' ۱۵۵۶ء میں اس نے انخلاع کیا - یہ "رومی شہنشاہی" بعد میں اسٹریا کے حکمرانوں کیلئے تقریباً موروثی ہو گئی تھی ۱۸۰۶ء میں نپولین نے بالواسطہ اس کا خاتمہ کر دیا -

[2] وولزی معزولی کے بعد انگلستان ہی میں مقیم تھا - ایک شبہ کی بنا پر بحکم ہنری ہشتم اسے گرفتار کر کے لندن لایا جا رہا تھا' راستے میں اسکا انتقال ہو گیا - اگر وہ لندن تک پہنچ گیا ہوتا تو یا قتل ہوتا یا قید -

کیتھرائن ہاورڈ سے نکاح کیا اور دو سال بعد (۱۵۴۲ء میں) اسے بھی این بولین کی طرح بالزام زنا قتل کرا دیا۔ چھٹا عقد ۱۵۴۳ء میں کیتھرائن پار سے کیا۔ اس عورت نے ہنری کو دنیا سے پار اتار دیا۔

یہ تھی داستان چار سو برس قبل کے ایک بادشاہ انگلستان کے باہم مناکحات کی، دو بیبیوں کو قتل کرا دیا، دو کو طلاق دیدی، نہ وزارت کو یہ ہمت ہوئی کہ کچھ خلاف کہہ سکے نہ کلیسا کو یہ جرأت ہوئی کہ کوئی مذہبی تعرض کرے جس کی طرف سے ذرہ برابر بھی بدگمانی ہوئی اگر قتل نہیں تو ذلیل و معزول ضرور ہوا، تا آنکہ کلیسا پر سے پوپ کی سیادت بھی باطل کر دی گئی۔ اس زمانے میں پوپ نہ صرف مذہبی تسلط بلکہ دنیاوی اقتدار کے بھی دعویدار تھے، مغربی یورپ کے کسی بادشاہ کی تخت نشینی اس وقت تک مسلم نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک پوپ کی طرف سے اس کی منظوری نہ ملے، اس بیسویں صدی میں مصطفےٰ کمال پاشا کا خلافت کو منسوخ کر دینا اس سے بدرجہا زیادہ آسان تھا کہ سولہویں صدی میں کلیسائے انگلستان کے تعلق کو پوپ سے منقطع کر دینا لیکن یہ انقطاع وقوع میں صرف اس لئے آیا کہ ہنری ہشتم کو ایک عورت سے الفت ہو گئی تھی، اور کلیسا اس عورت کے ہنری ہشتم کی بیوی بننے میں مانع تھا۔

(۲)

انگلستان میں شاہان ٹیوڈر کا دور مطلق العنانی کے لئے مشہور ہے، ٹیوڈر کے بعد ۱۶۰۳ء میں خاندان اسٹوارٹ کی باری آئی، اور یہ سارا دور بادشاہ اور پارلیمنٹ کی کشمکش میں گزرا تا آنکہ ۱۶۸۸ء میں پارلیمنٹ کے نامزدہ ولیم اور میری تخت انگلستان پر بٹھا دئے گئے۔ انگلستان نے دستوریت کی جانب اس سے آگے قدم نہیں بڑھائے مگر فرانس میں ۱۷۸۹ء میں انقلاب کے شعلے بلند ہوئے، ۱۷۹۲ء میں بادشاہ کو قتل کر دیا گیا، تمام امیروں (یعنی زمینداروں) کی گردنیں اڑا دی گئیں اور جمہوریت کا اعلان ہو گیا۔ نپولین اسی جمہوریت کا پروردہ تھا، پہلے (۱۷۹۹ء میں) قنصل اور اس کے بعد (۱۸۰۴ء میں) شہنشاہ ہوا۔ ۱۷۹۶ء میں جب اس کے نمود کا ہنوز آغاز تھا، اس نے جوزیفائن سے عقد کیا تھا اور اس پر بہت فریفتہ تھا مگر نپولین سے جوزیفائن کے کوئی لڑکا نہیں ہوا۔ شہنشاہ بنکر یہ خیال ہوا کہ کوئی وارث تاج و تخت ہونا چاہئے اور پھر یہ آرزو بھی ہوئی کہ کسی شاہی خاندان سے قرابت ہونا چاہئے۔ بلا دسواس جوزیفائن کو طلاق دیدی اور شہنشاہ آسٹریا کی لڑکی سے عقد کر لیا نہ کسی وزیر نے کان ہلائے، نہ کلیسا نے ناک بھوں چڑھائی۔

(۳)

واقعہ ہنری سے پورے چار سو تین برس گزر جانے کے بعد ۱۹۳۶ء میں تخت انگلستان پر شاہ اڈورڈ ہشتم جلوہ فرما تھے، شاہ نے ہنوز کوئی عقد نہیں کیا تھا، ہر نئے بادشاہ کی تخت نشینی پر اس کے صرف خاص کے لئے ایک معین رقم پارلیمنٹ سے منظور ہوتی ہے۔ شاہ اڈورڈ کے لئے جب یہ تخمینہ پیش ہونے والا تھا تو شاہ نے لکھا تھا کہ تعین اخراجات میں میری ہونیوالی ملکہ کا بھی خیال رکھا جائے، اس پر پارلیمنٹ کے ایک رکن نے مزاحیہ طور پر یہ کہا تھا کہ آیا شاہ نے اس کا کوئی

یقین بھی دلایا ہے کہ وہ عقد کریں گے۔ شاہ کی طرف سے ارادۂ عقد کا کوئی اظہار کیا، اشارہ بھی نہیں ہوا تھا، تا آنکہ نومبر ۱۹۳۶ء میں ساری دنیا اس خبر سے دفعۃً حیرت میں پڑ گئی کہ شاہ مسز سمپسن سے عقد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ مسز سمپسن ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئیں، اخبارات کے لئے مسز سمپسن کے سوا دوسرا کوئی مبحث باقی نہیں رہ گیا تھا، جس کسی کو مسز سمپسن کے متعلق ایک معمولی سی بات بھی معلوم ہوتی اخبارات اسے موتیوں کے تول خرید کرتے، مسز سمپسن کی ایک سوانحعمری اوائل دسمبر میں امریکہ میں شائع ہوئی اور ۲۸ دسمبر تک اس کے سترہ اڈیشن نکل گئے۔ یہ ایک کتاب کا حال ہے ایسی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ غرض ایک طرف مسز سمپسن دنیا کی دلچسپی کا محور بنی ہوئی تھیں، دوسری طرف سیاسی، دستوری، قانونی، مذہبی بلکہ تجارتی و اقتصادی اور سب سے بڑھ کر روایتی کوئی نقطۂ نظر ایسا نہ تھا جس کے لحاظ سے اس عقد کے مناقب و مثالب پر سرگرم بحثیں نہ ہوئی ہوں، مخالفت کی بنائیں تین تھیں (۱) بادشاہ کا کسی عام عورت سے عقد کرنا روایات شاہی کے خلاف ہے۔ (۲) مسز سمپسن، امریکہ کے رہنے والی ہیں معلوم نہیں اس عقد کے سیاسی اثرات کیا ہوں۔ (۳) مسز سمپسن دو مرتبہ طلاق حاصل کر چکی ہیں اور مطلقہ عورت کے ساتھ عقد کو کلیسا تسلیم نہیں کرتا۔

ان تینوں میں وزنی اعتراض بھی آخری اعتراض تھا، بٹرنورڈ کے اسقف نے اپنے وعظ میں سنا دیا کہ بادشاہ مذہب کے احکام ظاہری کا بھی لحاظ نہیں کرتے اور کینٹربری کے اسقف اعظم نے خاموشی سے فرما دیا کہ وہ خطبۂ نکاح نہیں پڑھ سکتے۔ اس دو لاکھ سالانہ کھانے والے لاٹ پادری کا کہنا یہ تھا کہ کلیسا مطلقہ عورت کے ساتھ نکاح کو جائز نہیں رکھتا۔ اس کا جواب انگلستان کے مشہور و مقبول اہل قلم مسٹر جی، ایچ، ولس نے کیا خوب دیا کہ "مسز سمپسن کو ان کے شوہروں نے طلاق نہیں دی تھی بلکہ مسز سمپسن نے اپنے شوہروں کو طلاق دی تھی" دراصل انجیل میں حضرت مسیحؑ کا یہ قول منقول ہے کہ جو بغیر زنا کے عورت کو چھوڑتا ہے وہ زنا کرتا ہے اور جو چھوڑی ہوئی سے نکاح کرتا ہے وہ بھی زنا کرتا ہے پس مسٹر ولس کا کہنا صحیح تھا کہ الزام زنا مسز سمپسن پر عائد نہیں ہوتا۔ لیکن ان نکتہ آفرینیوں کی مطلق ضرورت نہ تھی شریعت موسوی ہو یا عیسوی:۔

بالطف سا حرش ید بیضائی رسد پیش لبش سخن بہ مسیحائی رسد

بادشاہ کی طبیعت مسز سمپسن کی جانب سے ہٹتی نہ تھی۔ وزارت کے متواتر جلسے ہوئے، مشورے ہوئے، آخر الامر، وزیر اعظم نے بادشاہ کو آگاہ کر دیا کہ یہ عقد نہیں ہو سکتا۔

کیا ہوا؟

ہنری ہشتم نے جب سے کلیسائے روما سے انقطاع کیا، اس وقت سے شاہ انگلستان "امام مذہب اور حامی دین" ہوتا ہے۔ کینٹربری کے اسقف اعظم کا تقرر اسی کے حکم سے ہوتا ہے ورنہ بادشاہ کے "خدام" ہوتے ہیں۔ کیا

بادشاہ نے بدفورڈ کے اسقف کو معزول کر دیا؟ کینٹربری کے اسقف اعظم کو منصب سے ہٹا دینے کی دھمکی دی؟ وزیر اعظم کو پابجولاں ٹاور میں بھیج دیا؟ یہ کچھ نہ ہوا۔ بادشاہ کے سامنے دو صورتیں صاف طور سے پیش کر دی گئیں تخت انگلستان سے دست بردار ہوں یا مسز سمپسن سے۔ بادشاہ اور بادشاہ کے بعض ہوا خواہوں نے بہت چاہا کہ کوئی درمیانی صورت نکل آئے مگر وزارت نے نہ چاہا اور اس لئے کوئی درمیانی صورت نہ نکلی امتحان سخت تھا' شاہی بلکہ شہنشاہی اور وہ بھی برطانوی شہنشاہی جس کے حدود میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا' اس شہنشاہی سے دست بردار ہونا تھا' دوسری طرف دل کی وسیع سلطنت تھی اور اس سلطنت کے بھی دستور و آئین تھے

باعقیق لب و لعل بدخشاں کم گیر — باگل عارض و لالہ نعماں کم گیر
وصل آں حوری چہرہ گرت دست دہد — با جنت کن و ملک سلیماں کم گیر

آخر الامر شدید کشمکش کے بعد بادشاہ نے اس رائے پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا جو شمس الدین کرت[۱] سات سو برس قبل قائم کر چکے تھے:-

آں بہ کہ خردمند کنارے گیرد — یا گوشۂ قلعہ حصارے گیرد
مے میخورد و لعل بتاں می بوسد — تا عالم شوریدہ قرارے گیرد

وسط دسمبر کی ایک رات کے وسط نے یہ دیکھا کہ شاہ اڈورڈ ہشتم "ایک موٹر پر سوار ہو کر ساحل کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر کسی نامعلوم مقام کو۔ بعد کو یہ خبر ملی کہ آسٹریا میں لارڈ راتھ چائیلڈ کے ایک قصر میں سکونت پذیر ہو گئے ہیں اور مدت معینہ کی ایام شماری کر رہے ہیں۔ وہ وقت بھی آگیا۔ مسز سمپسن سے عقد ہو گیا حسب مراد دل زندگی بسر ہونے لگی:-

خرم کسے کہ دامن یارے گرفتہ است — وز عالم زمانہ کنارے گرفتہ است

(۴)

اب مغرب سے مشرق کی طرف آئیے! شاہ اڈورڈ کا یہ انخلاع نہ صرف ایک غیر معمولی اہمیت کا واقعہ تھا بلکہ تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتا تھا اور آئندہ عجائب تاریخی میں شمار ہوگا اور اس کے اثرات

---

[۱] ہرات کو مغلوں نے اس طرح تباہ کیا کہ اس میں کسی سانس لینے والے کو زندہ نہیں چھوڑا' خواہ انسان ہو یا حیوان کچھ دنوں بعد جب پھر شہر صورت پذیر ہوا تو شمس الدین کرت نے (جو غور کے شیبانی خاندان سے تھا) وہاں قدم جمائے اور ۶۴۹ھ (1251) میں منکو قاآن نے اسے اپنی جانب سے ہرات، سیستان، بلخ اور متصلہ علاقوں کا والی مقرر کر دیا۔
شمس الدین کا زمانہ ۶۴۶ھ (۱۲۴۸) سے ۶۸۷ھ (۱۲۸۸) تک رہا۔

بہت دور رس[1] ہوں گے گو یہ آئندہ کی باتیں ہیں جس زمانے میں یہ مسئلہ باعث ہیجان عالم بنا ہوا تھا اس زمانے میں کوئی اخبار ایسا نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا جس میں اس مسئلہ پر بحث نہ ہوئی ہو۔ کانفرنس گزٹ (علیگڑھ) اگرچہ بالکل غیر سیاسی اخبار ہے مگر اس میں بھی ایک لیڈنگ آرٹیکل شائع ہوا اور اس لیڈنگ آرٹیکل میں صورت حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے بہ حتم محکم لگایا گیا کہ "اگر کوئی مشرقی بادشاہ ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا" یعنی تخت سے دست بردار ہو جاتا۔ یہ حکم اپنی جگہ پر صحیح لیکن یہ ایک سطحی امر ہے، زیر سطح نظر کیجئے تو حقیقی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تخت سے دست برداری کی صورت کیوں پیش آئی؟ میں نے کچھ دیر سوچا مگر مجھے اپنی بغایت محدود تاریخ دانی کی حد تک کوئی مثال ایسی یاد نہ آئی کہ کسی مشرقی بادشاہ نے کسی عورت سے عقد کرنا چاہا ہو، وزارت مانع ہوئی ہو اور بادشاہ نے تخت سے دست برداری کر دی ہو۔

اتفاق زمانہ سے اس وقت افغانستان، عراق اور مصر میں شاہ ظاہر، ملک غازی اور سلطان فاروق نوعمر بادشاہ حکمراں ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو ایسی صورت پیش آجائے تو اس دور دستوریت میں وہ کیا کرینگا یا کر سکے گا، اس پر قیاس آرائی بیکار ہے مگر ازمنہ سابقہ پر جہاں تک نظر کیجاتی ہے حالات و واقعات کم و بیش ویسے ہی ملتے ہیں جیسے ہنری ہشتم کے حالات و واقعات ہیں۔

جہانگیر (۱۰۱۴ء/۱۶۰۵ء - ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) اور نور جہاں کی داستان زبان زد خاص و عام ہے، جہانگیر کی حمایت میں جو چاہے کہئے مگر ایام شہزادگی میں مہر النساء کی الفت، تخت نشینی کے بعد شیر افگن خاں کا قتل، مہر النساء کا اس وقت تک شاہی محل میں رکھا جانا کہ وہ بادشاہ کے ساتھ نکاح پر راضی نہ ہوگئی، ایسے واقعات ہیں جو زبان حال سے سب کچھ کہہ رہے ہیں۔

جہانگیر کے واقعہ کو شہرت عام بلکہ تشہیر تام حاصل ہے مگر جہانگیر اس معاملہ میں منفرد نہیں تھا، اس نے محض وہی کیا جو اس سے قبل کے بادشاہ کرتے آئے تھے۔ اس قسم کے تمام واقعات یکجا کر کے کوئی کتاب مرتب کرنا منظور نہیں ہے، صرف بعض مشہور واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، شہرت کے اعتبار سے جہانگیر کے واقعہ سے دوسرے درجہ میں علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء - ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء) اور راجہ چتوڑ کی رانی پدمنی کا واقعہ ہے۔ جن لوگوں نے افسانہ گوئی کی ہے انھوں نے چتوڑ پر علاء الدین کے حملے اور اس کی فتح (۷۰۳ھ/۱۳۰۳ء) کا سبب محض پدمنی کے عشق کو قرار دیا ہے مگر تاریخ نویسوں نے بھی اس حد تک تسلیم کیا ہے کہ علاء الدین پدمنی کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور چتوڑ کی فتح اول کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ اس خیال کے موثق ہیں، راجہ چتوڑ بادشاہ کی قید میں تھا، بادشاہ نے راجہ سے یہ کہا کہ اگر وہ اپنے اہل و عیال کو بلالے

[1] کلیسا نے مطلقہ عورت کے ساتھ عقد کے قیود کو ڈھیل کرنے پر غور شروع کر دیا ہے۔ وزارت عظمیٰ سے مسٹر بالڈون کا "ارل بالڈون" بن کر علیحدہ ہو جانا خالی از معنی نہیں ہے۔

تو اس کو رہائی مل جائے گی۔ مکنون خاطر یہ تھا کہ پدمنی ہاتھ آجائے گی، راجہ نے اپنے اہل و عیال کو پیغام بھیجا، وہاں سے کئی سو راجپوت سپاہی ڈولیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے، یہاں رانی کی آمد سمجھی گئی، یہ راجپوت راجہ کو قید سے چھڑا کر نکال لے گئے۔ چتوڑ پر دوسرا حملہ ہوا جب کوئی مفر نظر نہ آیا تو پدمنی اور راجہ کے خاندان کی بعض دوسری عورتیں چتا بنا کر آگ میں کود پڑیں اور جل کر راکھ ہو گئیں۔ علاء الدین کو بعد فتح پدمنی کے بجائے مشت خاکستر ہاتھ آئی۔ واقعہ اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ایک جابر فرمانروا نے ایک عورت پر قبضہ کرنا چاہا اور اس کے حصول کے لئے سخت ترین فوجی مہم بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔

علاء الدین کے بعد اس کے بیٹے خضر خاں کا واقعہ اپنی نوعیت میں خاص ہے، امیر خسروؒ نے "دولرانی خضر خاں" لکھ کر اس واقعہ کو نہ صرف سند دوام عطا کر دی ہے بلکہ اسے اس قدر دلدوز اور درد انگیز بنا دیا ہے کہ قلب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے ماحصل یہ ہے کہ ۶۹۷ھ میں گجرات فتح ہوا اور راجہ کرن والئی گجرات کی رانی کنولا دیوی گرفتار ہو کر دہلی آئی اور حرم شاہی میں داخل کی گئی، کنولا دیوی کی ایک شیر خوار لڑکی دول دیوی (دولرانی) گجرات میں چھوٹ گئی تھی۔ آٹھ برس بعد وہ لڑکی کنولا دیوی کی درخواست پر علاء الدین کے حکم سے دیو گڑھ سے دہلی لائی گئی، علاء الدین کے بڑے لڑکے خضر خاں کو اس لڑکی سے محبت ہو گئی اور یہ محبت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی، انجام کار ۷۱۳ھ میں خضر خاں کا عقد اس لڑکی سے ہو گیا۔ علاء الدین اپنے آخر زمانہ میں خضر خاں سے بدظن ہو گیا اور اسے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ اسی دوران میں علاء الدین کا انتقال ہو گیا۔ ملک نائب[1] نے علاء الدین کے ہفت سالہ لڑکے شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھا کر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ خضر خاں اور شادی خاں دونوں بھائیوں کی آنکھیں نکلوالیں، اور شہزادہ مبارک خاں کے قتل کی فکر میں ہوا مگر مبارک خاں بچ گیا اور خود ملک نائب قتل ہو گیا۔ مبارک خاں نے شہاب الدین عمر کو بھی اندھا کر کے خضر خاں اور شادی خاں کے ساتھ گوالیار میں قید کر دیا۔ اور قطب الدین مبارک شاہ کے لقب سے خود فرمانروا بن گیا۔

اپنی فرمانروائی کے دوسرے سال مبارک شاہ نے خضر خاں کو یہ پیغام بھیجا کہ دول رانی کو اس کے سپرد کر دے خضر خاں نے صاف انکار کر دیا اور کہدیا کہ پہلے میرا سر کاٹ لیجئے اس کے بعد دول رانی کو لے لیجئے گا:-

چو با من ہمسر است ایں یار جانی　　سرم دور کن زاں پس تو دانی

مبارک شاہ اس غیر متوقع جواب سے سخت برافروختہ ہوا اور اسی وقت کوتوال کو طلب کر کے حکم دیا کہ بلا تاخیر گوالیار جائے

---

[1] ملک نائب علاء الدین کے محبوب غلام کافور کا خطاب تھا۔ علاء الدین نے اسے درجہ وزارت پر پہنچا دیا تھا، مگر اس کافر نعمت نے علاء الدین کے خاندان کو تباہ کر کے خود بادشاہ بن جانا چاہا۔

اور خضر خاں کا سر کاٹ لائے خضر خاں کے ساتھ شادی خاں اور شہاب الدین عمر بھی قتل ہوئے - یہ واقعہ ۷۱۸ھ (۱۳۱۸ء) میں پیش آیا' دولرانی کے متعلق مختلف روایات ہیں' ایک روایت یہ ہے کہ اس نے قتل کے وقت خضر خاں کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا تھا' زخمی ہوئی اور مر گئی' دوسری روایت یہ ہے کہ دہلی بھیجی گئی اور مبارک شاہ اور خسرو شاہ[علہ] کے حرم میں رہی -

بہر طور بادشاہ وقت کی مرضی دولرانی کو حاصل کرنے کی ہوئی اور اس کے لئے اس نے خود اپنے بھائی کے قتل میں بھی تامل نہیں کیا' اگر دوسری روایت صحیح ہے تو دولرانی اس کو مل گئی اور اگر پہلی روایت صحیح ہے تو علاء الدین کی طرح اسے بھی اپنی مطلوبہ سے محروم رہنا پڑا - یہ جو کچھ بھی ہو مگر شاہی اقتدار کا تماشا تو دنیا نے دیکھ لیا -

دو منسوبہ میں جہانگیر کا ذکر اوپر ہو چکا' اب جہانگیر کے باپ کا حال سنئے' ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ[علہ] میں ایک شخص عبد الواسع کی بیوی کا واقعہ ان الفاظ میں لکھا ہے'

"ایں زن شوہر دار چوں بغایت جمیلہ و در تمامی قبیلہ شکیلہ بے عدیلہ بود روزے نظر شاہنشاہی بر او افتادہ' پیغام نسبت بشیخ فرستادند و شوہر آں جمیلہ را اُمید وار بہا دادند - بنا بر آنکہ تورہ بادشاہاں مغول اینست کہ بر زنے کہ بخواہش نظر اندازند بر شوہر لازم است کہ آں را طلاق دہد چنانچہ واقعہ سلطان ابو سعید و میر چوپان و پسرش دمشق خواجہ مشہور است - عبد الواسع ارض اقتد و اسعہ خوانده

خدا اے جہاں را جہاں تنگ نیست

سہ طلاق دگو شہ دامن حلیلہ خود بست دو شہر بیدر از ملک دکن رفتہ غائب گشت و آں عفیفہ داخل حرم محترم شد -

ملا عبد القادر بدایونی نے جن "میر چوپان" کا نام لیا ہے انھیں "میر چوپان" کی دختر "بغداد خاتون" تھیں - سلطان ابو سعید کے ساتھ "بغداد خاتون" کے تعلق اور اس کے اثرات و نتائج کو زیر قلم لانے کے قبل ضروری ہے کہ سلطان ابو سعید اور امیر چوپان کی حیثیت کو سمجھ لیا جائے :-

(۵)

۶۱۶ھ (۱۲۱۹ء) میں چنگیز خاں نے حدود ممالک اسلامیہ کے اندر قدم رکھا اور ۶۵۸ھ (۱۲۵۹ء) میں چنگیز خاں کے پوتے

علہ ملک خسرو ایک ہندو غلام تھا مبارک شاہ کو اس سے بغایت عشق ہو گیا تھا' اور وہ مبارک شاہ پر بدرجہ اتم حاوی تھا' ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) میں مبارک شاہ اسی کے ہاتھ سے قتل ہوا - ملک خسرو ناصر الدین خسرو شاہ کے لقب کے ساتھ بادشاہ بن گیا مگر تین ماہ بعد ملک غازی کے مقابلہ میں مارا گیا اور ملک غازی غیاث الدین تغلق شاہ کے نام سے بادشاہ ہوا

علہ جلد دوم صفحہ ۶۱ مطبوعہ کالج پریس - کلکتہ ۱۸۶۸ء

ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ اور خلافت عباسیہ (بغداد) کو ختم کیا، ہلاکو خاں کے بیٹے تکودار خاں نے دین اسلام قبول کیا اور اباقا خاں کے بعد ۶۸۱ھ/۱۲۸۲ میں تخت خانی پر متمکن اور "سلطان احمد" کے لقب سے ملقب ہوا۔ مگر ارغون خاں بن اباقا خاں نے اس کی مخالفت میں خروج کیا اور ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ میں سلطان احمد کو قتل کر کے تخت خانی کا مالک ہو گیا، ارغون خاں کے بعد ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ میں کیخاتو ابن اباقا خاں نے مسند خانی پر قدم رکھا مگر ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ میں بایدو خاں کے مقابلہ میں شکست کھا کر ہلاک ہوا اور خود بایدو بھی اسی سال امیر نوروز سے شکست کھا کر مارا گیا، اب زمام سلطنت ہلاکو خاں کے پرپوتے غازان خاں (ابن ارغون خاں ابن اباقا خاں ابن ہلاکو خاں) کے ہاتھ میں آئی، غازان خاں تخت نشینی سے قبل ہی امیر نوروز کی ترغیب سے دین اسلام قبول کر چکا تھا۔ تخت نشینی کے بعد "سلطان محمود" کے لقب سے ملقب ہوا۔ ۷۰۳ھ/۱۳۰۴ میں غازان خاں کا بھائی اولجایتو خاں الملقب بہ "سلطان محمد خدا بندہ" بادشاہ ہوا، ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ میں اولجایتو خاں کے بعد اس کا بیٹا سلطان علاء الدین ابو سعید بہادر خاں تخت سلطنت پر جلوہ آرا ہوا، ہلاکو خاں کے اخلاف میں ابو سعید پہلا بادشاہ تھا جو پیدائشی مسلمان تھا۔ یہ ایک صدی کے تغیرات ہیں، ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ میں چنگیز خاں جن ممالک اسلامی کی تخریب کے لئے اٹھا تھا ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ میں ان ممالک میں چنگیز خاں ہی کی اولاد کی ایک شاخ کے زیر فرمان پوری طرح سے اسلامی حکومت قائم اور نشان کفر محو ہو چکی تھی۔

غرض سلطان ابو سعید بہادر خاں ایک اسلامی فرمانروا تھا تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف بارہ برس کی تھی اور تینتیس برس کی عمر میں ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ میں اس کا انتقال ہو گیا، بیس برس حکمرانی کی۔

جس طرح وقتاً فوقتاً چتر شاہی مختلف خاندانوں پر سایہ فگن ہوتا رہتا ہے اسی طرح قلمدان وزارت بھی مختلف خاندانوں میں گشت کرتا رہتا ہے، اور گاہ گاہ ایسا بھی ہوتا رہتا ہے کہ وزارت کے بغیر بھی بعض افراد یا بعض خاندان مہمات سلطنت پر اس طرح حاوی ہو جاتے ہیں کہ سیاہ و سفید کے مالک بنجاتے ہیں، جب منکو قاآن کے زیر سیادت ہلاکو خاں، خراسان و ایران وغیرہ کا فرمانروا مقرر ہوا تو عملاً یہ ممالک خان اعظم کے اقتدار سے آزاد ہو گئے اور یہ فرمانروائی ہلاکو خاں کے اخلاف کے لئے مستقل ہو گئی۔ ہلاکو خاں کے نہضت کے ساتھ ہی ساتھ خاندان "صاحب دیوان" کا عروج شروع ہوا، خواجہ علاء الدین اور خواجہ شمس الدین دونوں بھائی تاریخ میں جو شہرت رکھتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں، جس طرح ان کا عروج ہوا اسی طرح ان کا زوال بھی ہوا، اسی دوران میں کچھ دنوں مجد الملک کا ستارہ بھی عروج پر رہا۔ غازان کے زمانے میں امیر نوروز کو قوت حاصل ہوئی اور پھر امیر چوپان کی باری آئی۔ ابو سعید بہادر خاں کے زمانے میں فرمانروائی درحقیقت امیر چوپان اور اس کے خاندان ہی کی تھی، بہادر خاں کا نام ہی نام تھا، بہادر خاں نے اگرچہ اس خاندان کو تباہ کر دیا مگر بہادر خاں کے بعد امیر چوپان کے بیٹے حسن کوچک کے مبادرات و مہمات سے اس خاندان نے پھر عروج حاصل کیا، لیکن یہ قصہ ہمارے مبحث سے باہر ہے

(۶)

آمدم برسرِ مطلب، آٹھویں صدی ہجری کے عشرہ ثانی میں خراسان سے شام تک کے جملہ ممالک ابوسعید بہادر خاں کے زیرِ نگیں تھے، نصرۃ الدین صاین وزارت پر فائز تھا مگر امیر چوپان تمامی رتق و فتق شاہی پر حاوی تھا۔ امیر چوپان کی ایک لڑکی تھی "بغداد خاتون" نام حسن و جمال میں بے نظیر اور غنج و دلال میں بے عدیل، امیر چوپان نے ۷۲۳ھ (۱۳۲۳ء) میں اس لڑکی کا عقد امیر حسن ایلکانی[عله] سے کر دیا تھا۔ دو برس بعد ۷۲۵ھ (۱۳۲۴ء) میں سلطان ابوسعید کو اس لڑکی سے تعلق خاطر ہو گیا۔ عنان صبر و شکیب ہاتھ سے جاتی رہی!

چو دل در سرِ نرگس مست رفت　　اگر شاہ اگر بندہ از دست رفت

"عشق" اور "شعر" میں دولت اشتراک ہے، جذبۂ عشق نے کتنوں کو شاعر بنا دیا ہے اور اس عالم خاص میں شعر خوانی تو لازمی ہے سلطان ابوسعید نے شورش اندرون سے مجبور ہو کر ایک غزل کہی جس کا مقطع ہے!

بیا المصر دلم تا دمشق جان بینی　　کہ آرزوے دلم در ہوائے بغداد است

یہ شعر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے۔ اس شعر میں "بغداد" کی تلمیح کے علاوہ "مصر" اور دمشق بھی تلمیح سے خالی نہیں ہیں آخر بیقراری دل سے مجبور ہو کر سلطان نے اپنے ایک محرم خاص کے ذریعہ سے امیر چوپان پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا، سلطان کو بالطبع توقع بھی تھی کہ چنگیز خاں سے جو "یاسا" قرار دیا ہے امیر چوپان اس سے انحراف نہ کرے گا۔ جیسا کہ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے، "یاسا یہ تھا کہ جو عورت خان کی مطلوبہ ہو اس کے شوہر پر لازم ہے کہ اسے طلاق دے کر خان کے حرم میں بھیجدے۔ لیکن خلاف توقع امیر چوپان کا جواب سلطان کے منشا رِ دلی کے موافق نہ ہوا سلطان نے خاص اس باب میں تو مزید سلسلہ جنبانی نہیں کی مگر امیر چوپان کی طرف سے دل میں غبار آ گیا۔

یہ واقعہ گرمیوں کے آخر میں بمقام ییلاق اوجان پیش آیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد موسم سرما کا آغاز ہو گیا امیر چوپان نے یہ خیال کر کے کہ محب اور محبوب میں اگر دوری ہو جائے تو ممکن ہے یہ آتش فتنہ افسردہ ہو جائے۔ امیر حسن کو مع بغداد خاتون کے قراباغ اران کو روانہ کر دیا اور سلطان کو طوعاً و کرہاً بحیلہ قشلاق[عله] بغداد لے گیا لیکن یہ تدبیر الٹی پڑی،

عله امیر حسن ایلکانی "امیر حسن بزرگ" کے نام سے مشہور ہے، اس کا سلسلہ نسب ہلاکو خاں سے ملتا ہے، سلطان ابوسعید بہادر خاں کے بعد اس نے مختلف دعویداران سلطنت کی تائید کی مگر درحقیقت خود اپنے لئے شاہی کی سعی کی اور بالآخر بغداد کے خاندان جلایر کا بانی ہوا جس نے بغداد میں ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) سے ۸۱۴ھ (۱۴۱۱ء) تک حکمرانی کی۔ امیر بزرگ کا حریف و مقابل امیر حسن کوچک (ابن امیر چوپان) تھا اور سلطان ابوسعید کے بعد ان دونوں نے مختلف شہر۔ ادوں کو برائے نام "خان" بنا کر خوب ہی معرکہ آرائیاں کیں۔

عله خانانِ مغول موسم سرما بسر کرنے کیلئے اکثر گرم حصہ ملک میں چلے جاتے تھے، اور اسے انکی اصطلاح میں "قشلاق" کہتے تھے۔

آتش عشق فرو ہونے کے بجائے اور تیز ہوگئی۔

صائن وزیر (ملک نصرۃ الدین عادل) کو جب یہ پتہ چلا کہ بادشاہ کا مزاج امیر چوپان کی طرف سے متغیر ہوگیا ہے تو اس نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ کو اور زیادہ بدظن کرنا چاہا۔ ایک روز موقع پاکر عرض کیا کہ سلطنت کے تمام حاصلات و اختیارات پر چوپانیوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ان کے سامنے وزرا، امرا، ارکان دولت کی کچھ پیش نہیں چلتی۔ چونکہ غبار پہلے ہی سے موجود تھا، یہ بات دل میں جم گئی۔ تنہائی پسندی طبیعت پر غالب آگئی۔ بادشاہ بہت کم خرگاہ سے برآمد ہوتا تھا اور بہت کم کسی کو باریابی کا موقع دیتا تھا، امیر چوپان نے جب بادشاہ کا یہ حال دیکھا تو ایک روز تنہائی میں عرض کیا کہ اس وسعت مملکت اور اس جاہ و اقتدار کے باوجود اضمحلال خاطر خداوندی کا سبب کیا ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا ——— کہ میں نے تمام ملک کا انتظام و اختیار تمہارے ہاتھ میں دیدیا ہے، تمھیں چاہئے تھا کہ ایسا انتظام کرتے کہ مجھے بےفکری حاصل ہوتی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھے ایک دن بھی بے فکری نصیب نہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے دمشق خواجہ کے متعلق بھی شکایت کی۔ دمشق خواجہ امیر چوپان کا بیٹا اور بادشاہ کے مہمات خاصہ کا کارپرداز تھا، امیر چوپان بہت متفکر بادشاہ کے حضور سے واپس ہوا، دمشق خواجہ کو بلاکر کہا کہ مجھے توقع تھی کہ تم بادشاہ کے مہمات کا انتظام اس طرح کروگے کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو میں تمھاری وجہ محفوظ رہوں نہ یہ کہ تمھارے سبب سے مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں، دمشق خواجہ نے جواب دیا کہ میں نے خدمت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے مگر چند روز سے دیکھتا ہوں کہ بادشاہ کی طبیعت میری طرف سے بدل رہی ہے اور اس کی وجہ صائن وزیر کی خباثت کے سوا کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی

نظر بحالات امیر چوپان نے یہ سوچا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ بادشاہ کے حضور سے چند روز دور رہے اور صائن وزیر کو بھی اپنے ہمراہ لیتا جائے اور موقع پاکر قتل کرادے۔ چنانچہ سرما کے گزر جانے اور موسم بہار کے آنے پر امیر چوپان نے خراسان کے نظم و نسق کا بہانہ کرکے بادشاہ سے اجازت لے لی اور صائن وزیر اور متعدد امرا کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ دمشق خواجہ کو بدستور سلطان کے مہمات ذاتی کے انصرام کے لئے چھوڑ گیا۔ امیر چوپان ادھر خراسان کو روانہ ہوا ادھر بادشاہ نے سلطانیہ کا قصد کردیا۔ خراسان پہنچ کر امیر چوپان نے اپنے بیٹے حسن کو غزنین پر فوج کشی کا حکم دیا، حسن کامیاب واپس آیا۔ دوسری طرف دمشق خواجہ تمام جزیات و کلیات امور سلطانی پر اس طرح حاوی ہوگیا کہ ابوسعید کے لئے سلطنت کا صرف نام رہ گیا۔ یہ امر بادشاہ پر بہت گراں گزرا، خلوت میں بعض مقربوں سے اپنے خیال کا کچھ اظہار کیا، ان میں سے ایک شخص نے گوش گزار کیا کہ دمشق خواجہ، اولجاتیو خاں کی ایک لونڈی سے (جو قلعہ سلطانیہ میں رہتی ہے) عشقبازی کرتا ہے، سلطان نے کہا کہ دمشق خواجہ جب قلعہ میں اپنی محبوبہ کے پاس جائے تو مجھے آگاہ کرو۔ آخر ایک روز ایسا ہوا کہ دمشق خواجہ قلعہ میں اپنی محبوبہ کے پاس گیا اور سلطان کو اسی وقت خبر ہوگئی۔ سلطان نے اس کے قتل کا حکم صادر کردیا لیکن

کسی کی یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ دمشق خواجہ کے قتل کا اقدام کرے۔ اتفاقاً اسی روز کردستان سے چند ڈاکوؤں کے سر کاٹ کر آئے۔ سلطان نے فرمایا کہ اعلان کر دیا جائے کہ یہ سر امیر چوپان اور اس کے ہمراہیوں کے ہیں جنھیں امرائے سلطان نے خراسان میں قتل کر دیا ہے۔ دمشق خواجہ یہ سن کر حواس باختہ ہو گیا۔ دس آدمیوں کے ساتھ قلعہ سے بھاگا۔ مصر خواجہ اور آقا لو نے بحکم سلطانی تعاقب کیا۔ آخر گرفتار ہو کر مصر خواجہ کے ہاتھ سے قتل ہوا اور اس کا تمام مال و اسباب بھی بحکم سلطانی لٹ گیا۔ یہ واقعہ ۶ شوال ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) کو پیش آیا۔

دمشق خواجہ کی مہم سے فارغ ہو کر ابو سعید نے خود امیر چوپان کے خاتمہ کی فکر کی۔ اپنے ایک معتمد کو اپنی نشانی دے کر امرائے خراسان کے پاس روانہ کیا کہ چوپان اور اس کے ہمراہیوں کو گرفتار کرانے اور قتل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں، اسی قسم کے احکام تمام مملکت میں روانہ کیے گئے کہ چوپانیوں کا نشان تک باقی نہ چھوڑیں۔ خود ابو سعید سلطانیہ سے قزوین کو روانہ ہو گیا اور ہر جانب سے فراہمی لشکر کا حکم دیا۔

سلطان کا قاصد بمقام بادغیس امیر چوپان کے لشکر میں پہنچا، پوشیدہ طور پر امرا کو سلطان کا نشان واجب الاذعان دکھایا، لیکن امرا نے فوری طور پر چوپان کی مخالفت کو محال سمجھا۔ سب مل کر اس کے پاس گئے، دمشق خواجہ کے قتل کے معاملہ میں اپنی شرکت سے برأت کا اظہار کیا اور چوپان کے ساتھ موافقت اور اتحاد میں مبالغہ دکھایا، امیر چوپان نے دمشق خواجہ کے مارے جانے پر نوحہ کیا، جب یہ مجلس ختم ہوئی تو امیر چوپان کے بڑے لڑکے امیر حسن نے کہا کہ اب سلطان ابو سعید کی اور ہماری موافقت نہیں ہو سکتی اور امرا کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ جو شخص سلطان سے کچھ بھی تعلق رکھتا ہو اسے قتل کر دیں۔ سلاطین چغتائیہ سے مدد لے کر خراسان پر قابض ہو جائیں۔ اگر سلطان ابو سعید ادھر آئے تو اس کا مقابلہ کریں اور نہ آوے تو جب ہمیں خود قوت حاصل ہو جائے عراق میں چل کر اس سے بدلا لیں۔ چوپان نے اس صلاح کو قبول نہ کیا اور اپنی قوت پر اعتماد کر کے کہا کہ اس وقت ایران میں کون ہے جو میرا مقابلہ کرے۔" وزیر ضائن کو طلب کر کے اپنے سامنے قتل کرا دیا اور ستر ہزار سواروں کے ساتھ عراق و آذربیجان کی طرف روانہ ہوا، تمام امیروں اور سرداروں سے عہد لیا کہ اس کی مخالفت نہ کریں گے، سمنان پہنچ کر شیخ رکن الدین علاء الدولہ[1] سمنانی کی خانقاہ میں پھر اس عہد کی تجدید کی، امیر چوپان نے شیخ سے استدعا کی کہ بادشاہ سے ملاقات فرمائیں اور

[1] ابو المکارم رکن الدین علاء الدولہ احمد بن البیابانکی ملوک سمنان کی نسل سے تھے۔ ارغون خان کے زمانے میں ملازمت پیشہ تھے اور ان کے والد ملک شرف الدین مرتبہ وزارت پر فائز رہ چکے تھے، ایک جنگ میں شیخ رکن الدین پر جذبہ طاری ہوا، ملازمت ترک کر کے عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے اور بہت درجہ عالی حاصل کیا۔ ۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء) میں ہشتر سال کی عمر میں وصال ہوا۔ آپ کی تصنیف سے ایک کتاب مکاشفات ہے۔

جانبین کے تعلقات سابقہ کو بحال کرادیں' اور جن لوگوں نے دمشق خواجہ کے قتل میں سعی کی تھی انھیں بادشاہ امیر چوپان کے حوالہ کردے۔ شیخ نے تکلیف فرمائی' بادشاہ نے ہر طرح اعزاز و اکرام کیا مگر اصل مقصد حاصل نہ ہوا' شیخ نے واپس آکر صورت حالات بیان کردی اور اس کے ساتھ یہ صلاح بھی دی کہ امیر چوپان بادشاہ کے خلاف فوج کشی نہ کرے' مگر امیر چوپان نے اپنے غرور میں کچھ خیال نہ کیا' سمنان سے روانہ ہوگیا' جب مقام قوبامیں پہنچا اور لشکر شاہی صرف ایک دن کے فاصلہ پر رہ گیا تو چند امرا تیس ہزار سواروں کے ساتھ امیر چوپان کو چھوڑ کر شاہی لشکر سے جا ملے امیر چوپان متوحش ہوگیا' باقی امرا پر بھی اسے اعتماد نہ رہا چند اشخاص کے ساتھ سراسیمہ خراسان کی طرف بھاگا' پہلے چاہا تھا کہ خان مغول کے حضور میں حاضر ہو مگر بعد کو ہرات میں ملک غیاث الدین کرت کے پاس جانا چاہا۔ بعض رفقا اس خیال کے مانع ہوئے کہ غیاث الدین سے وفا کی امید نہیں مگر امیر چوپان نے ان کی رائے نہ مانی آخر وہی ہوا جو ان ہمراہیوں کا خیال تھا۔ ملک غیاث الدین نے اول ہر طرح خاطر داری کی مگر سلطان ابوسعید کے طمع دلانے پر امیر چوپان کو ہلاک کردیا۔ یہ واقعہ محرم ۷۲۸ھ میں پیش آیا۔

امیر چوپان کے نو بیٹے تھے' دمشق خواجہ کے قتل کا واقعہ اوپر گزرا' سب سے بڑا بیٹا امیر حسن امیر چوپان کی شکست کے بعد مازندران اور خوارزم ہوتا ہوا خان اوزبک کے پاس پہنچا' خان نے اس کی قدر افزائی کی اور جنگ چرکس میں روانہ کردیا' امیر حسن وہاں زخمی ہوا اور بعد واپسی انتقال کرگیا۔ تیسرا بیٹا تیمور تاش تھا وہ روم کو بھاگ گیا اور وہاں سے بہت کثیر مال و دولت لے کر مصر کے فرمانروا ملک ناصر کے پاس حاضر ہوا۔ ناصر نے اس کی قدر کی مگر یہ دیکھ کر کہ لوگ اس کے گرویدہ ہوتے جارہے ہیں اس کو قتل کرادیا اور اس کا سر سلطان ابوسعید کے پاس بھیج دیا۔ اسی تیمور تاش کا بیٹا امیر حسن کوچک تھا جس نے ابوسعید کے بعد بہت فتنہ برپا کیا اور ایک مدت تک امیر حسن بزرگ کا مدمقابل رہا۔ چوتھا بیٹا امیر محمود تھا وہ سلطان کی فوج کے ہاتھ آگیا اور قتل ہوا' یہ چاروں لڑکے اسی بیوی سے تھے جس بیوی سے بغداد خاتون تھی' پانچواں لڑکا امیر چوپان کی زندگی ہی میں شہید ہوچکا تھا' چار لڑکے اور تھے جو مدوجزر زمانے کے شکار رہے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن سلطان کی کیفیت یہ تھی کہ :-

دل ہماں' درد ہماں' عہد ہماں' یاد ہماں ہر کسے روے بہ کارے و غمِ یار ہماں

امیر چوپان لشکر سلطانی کے سامنے سے منہزم ہوکر خراسان کی طرف بھاگا' ادھر سلطان نے قاضی مبارک شاہ کو حکم دیا کہ امیر شیخ حسن کے پاس جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو بغداد خاتون کو طلاق دے کر لے آئے۔ شیخ حسن نے صورت حالات پر نظر کرتے ہوئے بخوف جان بغداد خاتون کی مفارقت گوارا کی اور بعد انقضائے عدت بغداد خاتون سلطان کے حبالہ نکاح میں آئی۔ امیر چوپان کے ہلاک ہونے کے قبل یہ نکاح ہوچکا تھا اور بغداد خاتون ہی کی وجہ سے یہ ہوا کہ امیر چوپان کی وصیت کے موجب اس کی نعش تدفین کے لئے مدینہ منورہ

بھیجی گئی اور سلطان نے چالیس ہزار دینار مصارف کے لئے عطا کئے۔

نورجہاں کے مانند بغداد خاتون کو بھی امور ملکی ومالی میں دخل حاصل ہوگیا اور بعینہ اسی طرح بعض ارکان کے لئے وجہ پرخاش بھی مہیا ہوگئی تھی۔ ۷۳۲ھ (۱۳۳۱ء) میں سلطان کو یہ باور کرا دیا گیا کہ بغداد خاتون خفیہ طور پر امیر شیخ حسن سے مراسلت رکھتی ہے۔ شیخ حسن کے قتل کا حکم صادر ہوگیا مگر شیخ حسن کی والدہ کی سفارش پر (جو سلطان کی پھوپی تھیں) حکم قتل منسوخ ہوا اور شیخ حسن کو قلعہ کماخ میں مقید کر دیا گیا۔ بغداد خاتون بھی سلطان کی نظروں سے گر گئی۔ لیکن جب اس اتہام کا غلط ہونا ثابت ہوگیا تو بغداد خاتون کو پھر منزلت سابقہ حاصل ہوگئی اور امیر شیخ حسن کو روم کی حکومت تفویض ہوئی۔

سلطان ابوسعید کا انتقال ۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء) میں بتیس سال کی عمر میں ہوا۔ ابوسعید کے بعد ارپاخاں فرمانروا ہوا، مگر بغداد خاتون اس کی کچھ حقیقت نہ سمجھتی تھی۔ ارپاخان نے اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے سلطان ابوسعید کو زہر دے کر مار ڈالا ہے، اور اسی علت میں اسے قتل کرا دیا۔

زہر دینے کے گمان کی وجہ اس طرح پیدا ہوئی کہ ۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء) میں ابوسعید کو سپاہ قبچاق کے حملہ آوری کی خبر ملی۔ گرمی نہایت شدید تھی اور اسی شدت گرما میں وہ اران کو روانہ ہوگیا، طبیعت خراب ہوگئی مگر دو ہفتے میں صحت ہوگئی حمام میں گیا اور پھر بیمار پڑا اور انتقال کر گیا۔ بعض اطبا نے سلطان کی موت کو زہر کا اثر بتایا ہے۔ میر خوند نے بحوالہ ظفرنامہ لکھا ہے کہ سلطان نے اپنے آخر زمانے میں دلشاد خاتون[۱] بنت دمشق خواجہ سے عقد کر لیا تھا اور بغداد خاتون کے ساتھ کم التفاتی برتتا تھا اور یہی باعث ہوا کہ بغداد خاتون نے سلطان کو زہر دے دیا لیکن اس پر یہ اعتراض وارد

---

[۱] دلشاد خاتون نے سلطان ابوسعید کے بعد امیر شیخ حسن بزرگ سے نکاح کیا اور سلطنت بغداد میں شیخ حسن کی شریک بلکہ شریک غالب رہی۔ شیخ حسن کے بعد سلطان اویس کے زمانے میں بھی مہمات سلطنت میں اسے بہت دخل حاصل رہا خواجہ سلمان ساوجی اس کے مداحوں میں تھا۔ اس کی نسبت سلمان کا یہ شعر تذکروں میں خاص طور پر منقول ہے۔

ہزار بار بروزے شکستہ از تمکین		شکوہ مقنعۂ او کلاہ گوشہ سنجر

حافظ کے ممدوح شاہ شجاع (کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش) کے بھائی محمود سے دلشاد خاتون کی لڑکی منسوب تھی۔ محمود کو جب شجاع کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو اس نے سلطان بغداد سے استعانت کی۔ شجاع نے محمود کو ایک خط لکھا جس کے آخری شعر یہ ہیں۔

تو رسم عرس پدر گیر اسے برادر من		کہ شوہریت نیاید ز دختر دلشاد
مکن مکن کہ پشیماں شوی بآخر کار		ز مکر روبہ بے زور لشکر بغداد

اس معرکہ میں محمود کو فتح حاصل ہوگئی مگر بعد کو پھر شکست ہوئی۔

ہوتا ہے کہ پھوپھی (بغداد خاتون) اور بھتیجی (دلشاد خاتون) کو ایک ساتھ عقد میں رکھنا کیونکر ہو سکتا تھا' میر خوند نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اگر دلشاد خاتون کے ساتھ سلطان کا عقد ہوا تھا تو لازم ہے کہ سلطان نے بغداد خاتون کو طلاق دے دی ہو۔

(۷)

آپ نے دیکھ لیا کہ مشرقی بادشاہ نے کیا کیا؟ ہنری اور نپولین نے وہی کیا جو ابوسعید اور دوسرے مشرقی فرمانرواان سے قبل کر چکے تھے۔ اڈورڈ ہشتم نے جو کچھ کیا وہ بظاہر ضابطہ و آئین کا کام معلوم ہوتا ہے مگر بباطن بے بسی ولاچاری کا نام ہے' مشرق میں شاہانہ اقتدار کی مثالیں تو بہت کثیر ہیں مگر شاہانہ بے اقتداری کی مثالیں کم ہیں تاہم دو حوادث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

جہانگیر کو نور جہاں سے جو عشق تھا وہ معلوم مگر جب مہابت خاں نے جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا تو سارا طنطنہ تیموری رکھا رہ گیا اور جہانگیر سے نور جہاں کے خلاف وہ سب کچھ کہلا دیا جو نہ کہنا چاہئے تھا' یہ ضرور ہے کہ جہانگیر نے جو کچھ کہا یا کیا وہ بناوٹ سے کہا اور کیا' اس نے موقع شناسی سے بہت اچھا کام لیا مگر لاچاری و بے بسی ہی کا دل خوش کن نام موقع شناسی ہے۔

اسی خاندانِ تیموریہ کے ایک شہزادے مرزا جہاندار عرف مرزا جواں بخت بھی تھے۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں دہلی سے بعزم لکھنؤ روانہ ہوئے' اقتدار حقیقی اگرچہ خاندان تیموریہ سے رخصت ہو چکا تھا مگر ظاہری آن بان و رسم اسم ہنوز باقی تھے۔ شہزادہ جب لکھنؤ کے قریب پہنچے تو نواب آصف الدولہ اور وارن ہسٹنگز (جو اس وقت لکھنؤ میں موجود تھے) استقبال کو نکلے' صاحب عالم ہاتھی پر سوار ہوئے نواب آصف الدولہ خواصی میں بیٹھ کر مورچھل ہلانے لگے اور وارن ہسٹنگز گھوڑے پر سوار کرچ کھینچے ہوئے جلو سواری میں چلے۔ اس شان سے صاحب عالم شہر میں آئے اور مقیم ہوئے مگر جب صاحب عالم کو ایک طوائف سے عشق ہوا اور اسے گھر میں رکھنا چاہا تو نواب نے صاحب عالم کو بنارس رخصت کر دیا اور صاحب عالم خاموشی سے چلے گئے۔ صرف اس لئے کہ صاحب عالم بے اختیار تھے اور نواب با اختیار۔[علہ]

(۸)

ابوسعید اور ہنری ہشتم نے جو کچھ کیا اسے مطلق العنانی کے نام سے مطعون کیا جائے گا اور مسٹر بالڈون نے جو کچھ کیا اسے دستوریت کے نام سے سراہا جائے گا۔ حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ مشرق ہو یا مغرب' ازمنہ تاریک ہو یا ازمنہ

علہ یہ واقعہ تفصیل کیساتھ "سوانحات سلاطین اودھ" مصنفہ سید کمال الدین حیدر میں مذکور ہے۔ جلد اول ص۱۰۱ مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۶ء

روشن، شاہی حکومت ہو یا جمہوری، دنیا میں قوت اور صرف قوت کی حکمرانی ہے، اس سے بحث نہیں کہ وہ قوت کس کے ہاتھ میں ہے اور کس کے ذریعہ سے نافذ ہوتی ہے۔ جب تک اقتدار بادشاہ کے ہاتھ میں تھا اس وقت تک وزیر کی بڑی عزت افزائی اور زیادہ سے زیادہ یہ تھی کہ بادشاہ وزیر سے مشورہ کرے۔ جب اقتدار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر وزیر کے ہاتھ میں آگیا تو دستور و آئین کے ماہرین کاملین کا متفقہ فتویٰ یہ ہو گیا کہ بادشاہ کے لئے اتنا کافی ہے کہ اہم امور میں وزیر اس سے مشورہ کرے۔

انسان فریب خوردہ انسان الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسا ہوا ہے وہ حریت، سویت و اخوت کا وعظ سنتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا میں عملاً بھی ان تصورات کا نفاذ ہو سکتا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ شرمندہ معانی نہ ہونے والے الفاظ اسے حریت سے اور زیادہ محروم کرنے، سویت سے اور زیادہ دور لیجانے، اخوت سے اور زیادہ بیگانہ بنانے کے لئے کہے جاتے ہیں۔ یہ بر خود غلط انسان دستوریت اور جمہوریت کے دلنواز نغمے سنتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ گیت گانے والے دنیا کو بہشت بنا دیں گے مگر نہیں جانتا کہ یہ انسان صورت شیطان اس کے لئے دوزخ کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔

کون ہٹلر ہے اور کون ابو سعید بلکہ کون تیمور اور کون ہلاکو ہے جو اس بیسویں صدی کے عشرہ رابع کے ہامان صفت وزیروں اور فرعون خصلت ڈکٹیٹروں کی خود سری و مطلق العنانی، جور و استبداد، خود پسندی اور خود غرضی کے ہم پایہ بننے کا دعویٰ کر سکے؟ آج گاندھی کی مطلق العنانی چنگیز خاں کی قہرمانی سے بڑھی ہوئی ہے مگر گاندھی کی مطلق العنانی پر دسیسہ کاری کا پردہ پڑا ہوا ہے اور چنگیز خاں کی قہرمانی عریاں ہے۔

ہے کوئی بندۂ خدا جو اس نفسانیت کی حکومت کے بجائے روحانیت کی حکومت کو لبیک کہے!! انقضیت

[تعلیق۔ سلطان ابو سعید کے واقعات تمام تر حبیب السیر (جلد سوم حصہ اول صفحہ ۱۱۹-۱۲۲) سے ماخوذ ہیں۔ یہ ضخیم تاریخ غیاث الدین المعروف بہ میر خوند کی[1] اور سنہ ۹۳۰ھ (۱۵۲۴ء) تک کے حالات محتوی ہے۔ "تاریخ گزیدہ"[2] حمد اللہ المستوفی کی تصنیف ہے اور سنہ ۷۳۰ھ (۱۳۲۹ء) میں مکمل ہوئی ہے سلطان ابو سعید کی ہمعصر تاریخ ہے۔ ابو سعید کے حالات نسبتاً زیادہ شرح و بسط سے دئے ہیں (صفحہ ۶۰۱-۶۱۱) اور ابو سعید کے حالات کے اختتام پر وزیر وقت شمس الدین یزدی کی مدح بھی کی ہے مگر بغداد خاتون کے معاملہ کا ذکر نہیں کیا ہے یہ کوئی خلاف قیاس امر نہیں ہے۔ رشید الدین و فتح اللہ فتح بغداد کے قیامت خیز واقعہ پر بہت ہی سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر گئے۔ تاریخ فیروز شاہی میں علاء الدین کے معاملہ کا مطلق کوئی مذکور نہیں ہے۔ ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ خفیہ لکھی تھی، خود ملا کی زندگی میں پتہ نہ چلا مگر ملا کے بعد جہانگیر کے زمانہ میں ملا کے لڑکے گرفتار ہو کر آئے اور ان سے اس بارے میں باز پرس ہوئی غرض یہ کہ عصری تاریخ کے واقعات کی صحت میں بھی بہت کچھ روایت و درایت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بغداد خاتون کا واقعہ اکثر تاریخوں میں مشرحاً مندرج ہے، بایں ہمہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں نے اس بارے میں رسرچ (تحقیقات) نہیں کیا ہے۔ میر خوند، ملا عبد القادر وغیرہ پر انحصار کیا ہے]

[1] مطبوعہ احمدی پریس بمبئی ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء   [2] گب میموریل، طبع لیڈن ۱۹۱۰ء

باورچی کا انعام

(ایک نیم تاریخی افسانہ)

از جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

سلطان محمد قطب شاہ الٰہی محل میں مشغول مطالعہ تھے۔ آج معمول سے زیادہ وقت اس قصر میں گزر چکا تھا۔ داد محل کے رفیع الشان ایوان اراکین دولت، امرائے دربار، علماء و فضلا کے علاوہ حاجتمندوں اور دادخواہوں سے معمور تھے۔ یہ بارگاہ ہر کس و ناکس کی امیدوں اور آرزوؤں کا ماویٰ و مرجع تھی۔ امراء اپنے محبوب بادشاہ کی قدمبوسی اور غربا اپنی حاجت برآری کے لئے بے چین تھے۔ ان سب پر انتظار کا ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ مگر یہ کٹھن گھڑیاں جواں سال بادشاہ کے ذوق علم و فضل اور نیک نفسی کے تذکروں میں کٹ رہی تھیں۔

خدامان شاہی اور مقربان خاص شاہی باورچی کو گھیرے ہوئے تھے جو ایران کے سفر سے ابھی ابھی واپس آیا تھا اور اپنے وطن کے حالات اور دوران سفر کے دلچسپ واقعات خوش آیند پیرایہ میں بیان کر رہا تھا۔ وہ ڈیڑھ سال قبل اپنی شاہ کے ارادہ سے بادشاہ سے اجازت لے کر گولکنڈہ سے ایران کو روانہ ہوا تھا۔ اور یہ توقع کسی کو نہ تھی کہ اس قدر جلد بصحت و سلامت واپس بھی آسکے گا وہ کئی سال گولکنڈہ میں رہ چکا تھا اور سلطان کے باورچی خانے کا خاص رکابدار ہونے کی وجہ سے دیگر خدامان شاہی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اس وقت ہر شخص اس کے حالات سفر سننے کا مشتاق تھا مگر خود وہ بادشاہ کیلئے مضطر تھا اور اپنے دوست احباب سے کہہ رہا تھا کہ میں نے دوران سفر میں کئی ممالک اور کئی بادشاہ اور امیر دیکھے لیکن سلطان محمد قطب شاہ جیسا متقی پرہیزگار اور صاحبدل انسان کہیں نظر نہ آیا۔ کیا ایران، کیا عراق، ہر جگہ گولکنڈہ کے میووں سے زیادہ یہاں کے بادشاہوں کے اعلیٰ کردار کی شہرت ہے۔ اسی حالیہ سفر نے تو میری آنکھیں کھولدیں اور خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے آقا پر اپنی جان نثار کرنے کیلئے بخیر و عافیت واپس آگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے اہل اللہ بادشاہ کی خدمت وہ سعادت ہے جو ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوسکتی۔

سلطان محمد قطب شاہ نے ایوان دربار میں قدم رکھتے ہی اپنے خاص باورچی کو یاد کیا۔ حاضرین دربار حیران تھے کہ یہ شخص تو ابھی ابھی قافلہ سے نکل کر دربار میں پہونچا ہے بادشاہ کو اس کی واپسی کی کیونکر اطلاع ہوگئی۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی باورچی نے

قدمبوس ہوکر عرض کیا:-

"بندگان عالی کی قدمبوسی کی عزت ایک عرصہ کے بعد نصیب ہوئی ہے جتنے دن حضور کے قدموں سے دور رہا ایک ایک گھڑی ایک ایک سال معلوم ہوتی تھی۔ آج پھر میری قسمت نے یاوری کی اور خدا نے اس قابل کیا کہ ظل اللہ کے قدموں کی خاک سے اپنی آنکھوں کو منور کروں"۔ بادشاہ نے اپنے قدیم خادم کی خیر و عافیت دریافت کرکے اطمینان کا اظہار کیا لیکن باورچی اپنے آقا کے قدموں پر سے اپنا سر ہٹانا نہ چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بادشاہ نے تلطف آمیز لہجہ میں ارشاد فرمایا:-

"تم اپنا سر اٹھاؤ، ہم جانتے ہیں تمہارے دل میں جو خدشہ ہے"۔ باورچی نے دست بستہ عرض کیا "حضور میں بڑا قصوروار ہوں! بارگاہ عالی سے رخصت ہوتے وقت میں بے حد مایوس تھا کیونکہ جب میں نے شادی کیلئے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی تو حضور نے حکم دیا کہ تم جا سکتے ہو لیکن پہلے ہمارے امرا و خداوندان دولت سے بھی رخصت ہو لو اور شہر پناہ سے نکلتے وقت ہماری بارگاہ میں آنا۔ فدوی کو ہر امیر نے اپنے حسب حیثیت سرفراز کیا اور بعضوں نے تو ہزار ہزار ہون کا توڑا بھی ساتھ کر دیا تھا لیکن آخر میں جب ظل سبحانی کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور نے صرف بیس پیسے عنایت کئے تھے جن کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور رعب سلطانی کی وجہ سے کچھ عرض نہ کر سکا۔ جب میں اس بارگاہ سے نکل رہا تھا میرا دل مایوسی اور نامرادی کی وجہ سے بیٹھا جا رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرے مقسوم میں یہی لکھا ہوا تھا کہ چشمہ آب حیات تک پہونچکر بھی پیاسا آؤں۔ اس مایوسانہ حالت میں میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا اور ممکن ہے کہ اپنے آقا کی نسبت میرے گمان نے کوئی بے ادبی بھی کی ہو جس کی وجہ سے میں اپنے تمام زمانہ سفر میں نادم رہا۔ اور اس وقت اس کی معافی کا بصد ادب خواستگار ہوں۔ بادشاہ نے فرمایا تم ہر طرح مطمئن رہو۔ اپنے سفر کے واقعات بیان کرو۔ تمہارے قدیم دوست احباب بھی تمہارے حالات سننے کے مشتاق ہوں گے"۔ باورچی نے عرض کیا "بارگاہ خداوندی سے ناکام جانے کا مجھے بڑا قلق تھا۔ جب میں جہاز پر اپنے وطن کی طرف چلا جا رہا تھا تو رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا۔ اور حضور کے عنایت کئے ہوئے تانبہ کے سکے مجھے بار گراں معلوم ہو رہے تھے۔ چنانچہ کئی دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ ان کو سمندر میں پھینک دوں لیکن پھر کسی نہ کسی وجہ سے رک گیا چند روز کے بعد ہمارا جہاز ایک بندرگاہ پر ٹھہرا وہاں ایک شخص انار بیچ رہا تھا۔ اکثر مسافرین نے دو دو چار چار انار خریدے۔ میں نے بھی یہی خیال کیا کہ یہ پیسے ایران ساتھ لیجا کر کیا کرونگا۔ بہتر یہی ہے کہ ہندوستان کے ساحل پر خرچ کر دوں چنانچہ وہ پانچ گنڈے بیس پیسے انار والے کو دیدئے۔ ان کے بدلے میں اس نے بیس انار میرے حوالے کئے جن کو میں نے اپنے سفری تھیلے میں ڈال دیا اور پھر خیال تک نہ آیا کہ ان کا کیا حال ہوا۔ میں خوش تھا کہ اب تانبہ کے ان بیس پیسوں سے میری جیب ہلکی ہو گئی۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ ہمارے جہاز میں ملک التجار کا اکلوتا لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ طبیبوں نے بہت کچھ علاج کیا مگر حالت سقیم ہوتی گئی۔ اطبا نے مشورہ دیا کہ اب صرف انار سے اس لڑکے کی جان بچ سکتی ہے۔ ملک التجار نے مسافروں سے دریافت

کیا۔ کسی کے ہاں انار نہ ملا۔ مریض کی حالت روز بروز ابتر ہونے لگی۔ آخر ملک التجار نے بڑے عجز کے ساتھ ہر مسافر سے کہا کہ ایک ایک انار کے لیئے ایک ایک ہزار اشرفی نذر کرونگا خدا کیلئے مجھ پر رحم کیجئے اور دیکھئے۔ ممکن ہے ڈھونڈھنے سے آپ کے سامان میں کہیں انار نکل آئے۔ مجھے یاد ہی نہ تھا کہ میں نے بھی انار خریدے تھے۔ اب جو ملک التجار کی عاجزی اور پریشان حالی دیکھی تو یکایک مجھے اپنی وہ حالت یاد آگئی جو ظل سبحانی کی بارگاہ سے سونے کی جگہ تانبے کے سکے حاصل کرنے کی وجہ سے مجھپر طاری ہوگئی تھی۔ ان پانچ آنوں کے پیسوں کی یاد کے ساتھ ہی مجھے اناروں کا خیال آگیا۔ میں دوڑتا ہوا اپنے سامان کیطرف گیا۔

تھیلا کھول کر دیکھا تو دو انار سڑے ہوئے نکلے اور باقی اٹھارہ انار اچھی حالت میں تھے جن کے معاوضہ میں اٹھارہ اشرفیاں مل گئیں اور میری قسمت پر جہاز کا ہر شخص رشک کرنے لگا۔ اٹھارہ ہزار اشرفیوں کا ذکر سنتے ہی بادشاہ نے تعجب کا اظہار کیا کہ :۔ "تمھیں تو بیس ہزار اشرفیاں ملنی چاہئے تھیں۔ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ دو ہزار کم کیوں ہوگئیں"۔ بادشاہ کی اس پر اسرار گفتگو پر دربار میں سناٹا چھا گیا۔

ظل سبحانی نے اپنے خادم خاص کے ذریعہ سے ملکہ زمانی حیات بخش بیگم کے یہاں کچھ کہلا بھیجا جب خادم نے دولت خانۂ عالی سے واپس آکر بادشاہ سے جواب عرض کیا تو سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے باورچی سے فرمایا۔

"ہم نہیں چاہتے تھے کہ یہ بات ظاہر کیجائے۔ لیکن اب کہنا پڑتا ہے کہ ہم اپنے نیئے خانگی اوقات میں قرآن شریف کی کتابت کر کے کچھ پیسے حاصل کر لیتے ہیں چنانچہ تم کو جو پیسے دئے گئے وہ ہماری ذاتی کمائی یعنی اکل حلال کے تھے، لیکن ابھی معلوم ہوا کہ ملکہ نے جو روزانہ رات میں پنکھے سی کر اپنے خانگی خرچ کے لئے رقم حاصل کرتی ہے ان میں سے دو پیسے چراغ کے لئے ارنڈی کا تیل منگانے میں صرف کر دئے تھے۔ اور جب میں نے وہ بیس پیسے منگوا بھیجے تو انھوں نے سرکاری رقم میں سے دو پیسے ان میں ڈال کر پانچ آنوں کو پورا کیا تھا۔ چنانچہ یہی دو پیسے تھے جن کی وجہ سے افسوس ہے کہ تمھاری دو ہزار اشرفیاں ماری گئیں"۔

خاص سالنامہ شاہکار کیلئے۔

مہدی حسن افادی الاقتصادی

کا اسلوب نگارش

اردو نثر میں جدید اسلوب کا آغاز

(از پروفیسر مجنوں گورکھپوری - معاون مدیر شاہکار)

نوٹ:۔ یہ مقالہ مجنوں صاحب نے اسلامیہ کالج گورکھپور میں اکتوبر ۱۹۳۵ء میں پڑھا تھا اور بہت پسند کیا گیا۔ مدیر

صدر محترم۔

حضرات!

آج کی صحبت میں میں ایک ایسی ہستی کی یاد دلانا چاہتا ہوں جو گورکھپور ہی کی خاک سے اٹھا اور یہیں پھر پیوند خاک ہوا اور جس نے اردو نثر میں اپنے اسلوبی اختراعات اور اپنے بے مثل طرز انشا سے وہ مستقل نقوش چھوڑے جو آج تک اردو ارباب نثر کے لئے تخئیل بنے ہوئے ہیں اور ان کے اسالیب کی تہذیب و تحسین میں حصہ لے رہے ہیں۔ ایم۔ مہدی حسن افادی الاقتصادی "خواب طفلی اور اردوے شباب" کے مصنف کا گورکھپوری ہونا۔ گورکھپور کے لئے یقیناً باعث فخر ہے۔ اگرچہ اوائل شباب سے لے کر آخری ایام تک ان کی زندگی کا بہت کم حصہ گورکھپور میں گذرا اس لئے کہ بسلسلہ ملازمت سرکاری ان کو اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ پردیس کی نذر کر دینا پڑا اور وہ بھی ایسی فضا میں جس کو ایک انشا پرداز کے لئے کسی طرح حوصلہ افزا یا نشاط انگیز نہیں کہہ سکتے۔

سرکاری ملازمت کی تاب شکن اور روح فرسا پابندیوں نے مرحوم کی ادبی شخصیت کا گلا گھوٹنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ منصبی زندگی کی مصروفیتوں نے ان کو کبھی اتنی مہلت اور آزادی نہ دی کہ وہ تامل اور اطمینان کے ساتھ کوئی مستقل کتاب تصنیف کرنے کی طرف متوجہ ہوتے اور کوئی زبردست تعمیری ادبی خدمت اپنی یادگار چھوڑتے۔ حوصلے اور ارادے بہت کچھ تھے۔ لیکن "دہند شوق و لے رخصت نظر نہ دہند" کی مجبوریاں بھی عبرتناک ہوتی ہیں۔ مرحوم اپنے "ضبط اوقات" (یہ انھیں کی ترکیب ہے) سے بدقت تمام اتنی فرصت نکال سکتے تھے کہ وقتاً فوقتاً اخبار و جرائد میں کسی عصری مبحث پر قلم برداشتہ کچھ لکھ سکیں یا پھر کسی ادبی تخیل یا کسی روحانی جذبہ کو پھیلا کر انشائے لطیف کی صورت میں پیش کر سکیں۔

افادی الاقتصادی نے جس دم گھٹا دینے والی زحمتوں اور بندشوں میں اپنی زندگی بسر کی ان کو نظر میں رکھئے تو ماننا

پڑتا ہے کہ اگر فطرتاً ان کی طبیعت میں ایک جمالیاتی کیفیت اور ایک ابداعی اپج نہ ہوتی تو ان سے یہ متفرقات بھی یادگار نہ رہتے جو اس وقت رہ گئے ہیں۔ پھر جس شخص کو فطرت نے صناع پیدا کیا ہو وہ ہمارے لئے جو کچھ بھی کر جائے اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اور یہ سوال نہ اٹھانا چاہئے کہ اس نے کیا نہیں کیا۔ نقاد کا کام معدوم سے نہیں بلکہ موجود سے بحث کرنا ہوتا ہے۔ ایک صناع جو کچھ کر گیا ہم کو اسی پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھنا چاہئے۔ افادی الاقتصادی اپنی زندگی میں جتنے لمحے ادب و انشا کو دے سکتے تھے دیئے اور وہ ہماری ہر باز پرس پر یہ جواب دینے کا منہ رکھتے ہیں:-

ازنفس ہمچنہ: اختیم حرف ترانہ کردہ ایم

اس سے انکار نہیں کہ افادی الاقتصادی نے جتنے مقالات لکھے ہیں اور جو "افادات مہدی" کے نام سے ایک مجموعہ کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہیں جن کو وقتی یا موسمی کہنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کا قلم واقعی ایک صناع کا قلم تھا جو بے جان سے بے جان چیز میں زندگی پیدا کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "تمدن عرب پر ایک کھلی چٹھی" "شبلی سوسائٹی" "نامی پریس کانپور کے لٹریری خدمات" "نقاد پر ایک غیر ستائشی جنبش لب" اور اسی قسم کے دوسرے مضامین کو "افادات مہدی" میں آج بھی پڑھئے تو وہی لذت ملتی ہے جو اب سے ۲۵-۳۰ سال پہلے ملتی۔ حالانکہ ان عنوانات میں بجائے خود زندہ رہنے کی مطلق صلاحیت نہ تھی۔

اردو نثر کی تاریخ میں میرامن کے بعد شبلی تک مجھے سوا آزاد کے کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جس کے صرف اسلوب میں اتنی زندگی ہو جتنی افادی الاقتصادی کے اسلوب میں ہے اور جو محض اپنے اسلوب کی بنا پر تاریخ ادب میں ایسی مستقل حیثیت کا مالک اور ایسی پائدار زندگی کا مستحق ہو۔ شبلی کے اسلوب کو موضوع کی اہمیت اور رفعت سے الگ کر لیجئے تو اس میں کچھ زیادہ رہ نہیں جاتا۔ ان کا اسلوب اپنے تمام تناسب اور آہنگ کے باوجود فاضلانہ طرز تحریر سے سر مو آگے نہیں بڑھتا۔ حالی کا انداز تحریر سلیس بے تکلف پختہ اور نرم ہے مگر اس کے اندر کوئی خالص جمالیاتی کیفیت بہت کم ملے گی۔ نذیر احمد کے اسلوب میں ایک البیلا پن ہوتا ہے جو صرف کسی فسانہ نگار کو زیب دے سکتا ہے۔ افادی الاقتصادی کے اسلوب کی اہمیت موضوع کی اہمیت سے بالکل الگ ایک چیز ہے اور بڑے مرتبہ کی چیز ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت جمالیت ہے۔ ان کے اندر ایک خداداد ذوق جمال تھا جو ان کی تحریروں میں بھی اسی طرح نمایاں اور محسوس رہتا تھا جس طرح کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں۔ خود شبلی ان کے معترف ہیں اور یہ اعتراف محض زبانی یا رسمی نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہو سکتے۔ دائرہ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو یقین کی بات نہیں۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:-

"ابشیر میں آپ کا مضمون دیکھا۔ نیچے تمہارے نام کی دستخط تھی۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزاپوری دوست ہیں یا نذیر احمد اور آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا"۔

شبلی کی نظر نذیر احمد اور آزاد کے دائرے سے باہر نہ جا سکی۔ ان کو یہ احساس نہ ہو سکا اور کیسے ہوتا کہ دراصل والٹر پیٹر (WALTE PETER) رسکن (RUSKIN) اور آسکر وائلڈ (ASKERWILD) کی روحوں نے ہندوستان میں آکر ایک اردو انشا پرداز کا جنم لیا ہے۔ مجھے اردو نثر نگاروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کو افادی الاقتصاد کا ہمزبان قرار دیا جائے اور جس کے اسلوب سے ان کے اسلوب کا موازنہ کیا جائے۔

"ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون" "با ظہوری و صائب محو ہمز بانیہا است"

افادی الاقتصادی کے "ہمزبان" کچھ غیر ملکوں ہی میں ملتے ہیں۔ افسوس ہے کہ زمانے نے ان کو اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ کوئی مستقل اور منضبط تصنیف چھوڑ جاتے جو موضوع کی اہمیت اور خیالات کی گرانمایگی کے اعتبار سے اس قدر وقیع اور بہتم بالشان ہوتی جس قدر کہ ان مغربی انشا پردازوں کی تصنیفیں ہیں۔ اس وقت زیادہ وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا تھا کہ مرحوم پیٹر اور رسکن کے حریف تھے۔ لیکن جہاں تک ذوق و نظر اور انداز و اسلوب کا تعلق ہے میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ مہدی حسن مرحوم انھیں مشاہیر روزگار کی جماعت میں شمار کئے جانے کے لائق تھے۔

قبل اس کے کہ میں ان کے متعلق کچھ اور کہوں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبارت کے کچھ نمونے آپ لوگوں کے سامنے پیش کر دوں تاکہ یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ میں صرف خلا میں باتیں کر رہا ہوں۔ حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" میں ایک جگہ ضمنی طور پر لکھتے ہیں :—

> یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانہ میں "حیدرآباد دکن کے بسمارک" کو نذیر احمد کا شیدائی بنا رکھا تھا۔ سر سالار جنگ اول "ڈنر" پر ہیں۔ طلائی قابوں کا دور چل رہا ہے۔ چھری کانٹوں کی دھیمی موسیقیت میں دفعتاً سرکاری ڈاک کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے" ایک منٹ کے بعد جلیل القدر میزبان شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے۔ برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق ادب امیر الامرا کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑ رہی ہے اور چہرے پر رہ رہ کر وہ کیفیت طاری ہو رہی ہے جیسے تبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہئے۔ نذیر احمد کے خوان ادب کا یہ وہ لقمہ تر تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی۔ لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے جیسے ہم اگلنا چاہتے ہیں گریہ بے تکی روایات سابقہ کے لحاظ سے ٹھیک نہیں معلوم ہوتی......"

آپ نے دیکھا انشائے لطیف کسے کہتے ہیں! - ایک لفظ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیجئے یا اسکی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھدیجئے سارا آہنگ بگڑ کر رہ جائے گا۔ تشبیہ کس قدر برمحل اور دلنشیں ہے اور کس سلیقہ کے ساتھ شروع سے

آخر تک نباہی گئی ہے۔ نثر میں تشبیہات و استعارات کو اس لطف کے ساتھ نباہنا نہایت دشوار کام ہے۔ اسلوب کی یہ لطافتیں ہم کو "افادات مہدی" کے ہر صفحہ پر ملتی ہیں۔

"دائرہ ادبیہ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"مہرالنساء" جوان بیوہ کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے۔ لیکن ہائے وہ حسن افسردہ جو خود اپنی قوتوں سے واقف ہو۔ خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی ..... جہانگیر ایک روز اس کے کمرے میں جا نکلا جو ضیائے حسن سے "شیش محل" ہو رہا تھا حور وش کنیزوں کے حلقہ میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے "فطرت کی لاڈلی" "ہمہ غمزہ ہمہ عشوہ ہمہ ناز" نہایت سادے سفید باریک لباس میں تھی لیکن شیشہ کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا ..... مقیاس الشباب کی سرکشی بتا رہی تھی کہ زہ دستانہ کی طرح چپھی ہوئی محرم سے زیادہ اوبھی اوبھی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے۔ اس پردہ کافوری برہنہ افگنی! خیال کے لئے کیا باقی رہا؟ ......

یہ اسی "دائرہ ادبیہ" سے اقتباس ہے جس کی طرف شبلی نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے "ترکوں کی معاشرت" کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

یونانیوں کا تخیل صرف تکمیل انسانیت تھا یعنی وہ ہستی موجودہ سے آگے نہیں جاتے تھے ان کے خیال میں قوائے فطری کی نشوونما اور ان کا معتدل استعمال۔ بس یہی غایت زندگی تھا۔ یہی خیال شاگردانہ حیثیت سے یورپ نے حاصل کیا۔ یورپ کا موجودہ تمدن اسی خیال کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اس کے ہم آج تک یہ سمجھے ہیں کہ ہماری ہستی جو گہوارہ سے شروع ہوتی ہے اور یہ ہیئت موجودہ یقینی قبر سے پہلے ختم ہو جائے گی ایک حرف غلط ہے۔ ترقی کا افتتاح آغوش لحد میں ہو چکا ہوگا۔ میں نہیں جانتا ان خیالات کے ساتھ کوئی قوم دنیا میں کہاں تک متمدن اقوام سے ہم سطح ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے ......"

"علامہ شبلی ماہوار علمی رسالہ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوے خاصہ" کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانیوں پر آئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ مدتوں شعراء سے گاڑھا اتحاد رہا۔ بہ اقتضائے سن بری طرح کھیل کھیلی۔ ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑے کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں سب کو ٹالتی رہی۔ بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی۔ آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔

لیکن [illegible] حالت نے پلٹا کھایا۔ کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہوگئی اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے [illegible] معتد بہ حصہ علما کی کنزرک میں داخل ہے۔ لیکن سنا گیا ہے کہ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انھیں کے تصرف میں رہتی ہے ......"

اس قسم کے نوادر ادب سے "افادات مہدی" بھرے پڑے ہیں۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے تھا۔ اس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ صاحب۔ اسلوب کی حیثیت سے افادی الاقتصادی کا ہمسر اردو نثر نگاروں میں مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ حالی۔ آزاد۔ نذیر احمد۔ شبلی سبھی کے دل سے معتقد تھے اور ان کے ساتھ غلو کو راہ دیتے تھے اور خاص کر کے شبلی کو تو خداوند ادب سمجھتے تھے اور پوجتے تھے۔ بہت ممکن ہے انھوں نے اپنے خیال میں اردو نثر کے ان عناصر اربعہ سے اپنی ادبی قوت کی تربیت میں مدد بھی لی ہو۔ لیکن جہاں تک میں خود مطالعہ کر سکا ہوں میں نے افادی الاقتصادی کی تحریروں میں ان میں سے کسی ایک کی بھی تقلید کے کوئی آثار نہیں پائے ہیں۔ نذیر احمد اور آزاد سے ان کو تھوڑی بہت نسبت دی جا سکتی ہے لیکن پھر یہ نسبت اتنی ہی دور کی ہوگی جتنی کہ بتوں کو کعبہ سے ہو سکتی۔ نذیر احمد کا اسلوب اپنی تمام نسائی دلآویزیوں کے باوجود اس رومانی کیفیت سے بیگانہ ہے جو صرف مغرب کی چیز ہے اور جو صاحب "افادات" کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آزاد کے اسلوب میں رنگینی اور بانکپن جس قدر بھی ہو وہ اس قابل ہرگز نہیں کہ بلیغ اور گہرے اشارات کی حامل ہو سکے یعنی ان کے اسلوب میں معنویت نہیں ہے۔ برخلاف اس کے افادی الاقتصادی کا اسلوب محض تخیلی نہیں ہے۔ اس میں معنویت کے تمام امکانات موجود ہیں۔ ان کا انداز تحریر دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ بلیغ بھی ہے جس میں گہری سے گہری بات بھی کہی جا سکتی ہے۔ اور یہ یقیناً مغرب کی دین تھی۔ مہدی مرحوم نہ صرف مغربی طرز معاشرت کے قائل تھے بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی طرز فکر اور طرز بیان سے بھی متاثر تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مغربی نثر نگاری کے اسالیب و صور کو حل اور جذب کر کے اردو نثر کے فطری عناصر بنائے۔ اس کا شاید بہت کم لوگوں کو احساس ہو کہ اردو نثر میں گذشتہ تیس سال سے جو مغربی طرز رائج اور مقبول ہے اس کے موجد نہ حالی تھے نہ شبلی بلکہ خوش اسلوب افادی الاقتصادی تھے۔ تواریخ و سیر اور تحقیق و تنقید میں حالی اور شبلی کا مرتبہ مسلم ہے۔ اور اس اعتبار سے ان لوگوں کی برابری کا دعوی کوئی نہیں کر سکتا کہ انھوں نے سب سے پہلے تاریخ و تنقید کو جدید اصول فن کی رو سے وسیع بنایا لیکن اردو کے جدید اسلوبی میلانات کو متاثر اور متعین کرنے میں ان کا وہ حصہ نہیں جو افادی الاقتصادی کا ہے۔ اردو نثر کے موجودہ اسلوب کا سنگ بنیاد یقیناً افادی الاقتصادی نے رکھا اگرچہ ان کے بعد پھر کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کو صحیح معنوں میں ان کا مقلد کہا جا سکے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ آزاد کی طرح ان کا اسلوب بھی بیک وقت باعث رشک اور ناقابل تقلید تھا۔

افادی الاقتصادی نے نہایت غیرت دار طبیعت پائی تھی۔ وہ غیروں کا ممنون رہنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہ خصوصیت ان کی تحریروں میں بھی نمایاں رہتی ہے۔ وہ حتی المقدور انگریزی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا

جبکہ تحریر و تقریر دونوں میں جا بجا انگریزی الفاظ استعمال کرنا لوگ فخر کی بات سمجھتے تھے حالی اور شبلی بھی جو انگریزی زبان پر کوئی دسترس نہ رکھتے تھے اس علت سے بچے نہ رہ سکے۔ افادی الاقتصادی نے اگر کہیں انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مجبور ہو گئے ہیں۔ ورنہ عموماً ترجمہ کر دیتے تھے اور اس لئے ان کو اپنے مادۂ اختراعی سے کام لینا پڑتا ہے ان کے بیشتر ترجمے یادگار ہیں اور اردو کے ذخیرہ میں مستقل اضافوں کا حکم رکھتے ہیں۔ مثلاً "ادب الاساتذہ" "اقتصاصی تنقید عالیہ" "ٹکسالی" "اختراع فائقہ" "میزبان شام" "ضبط اوقات"۔ ابھی میں نے "مادہ اختراعی" کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ بھی انھیں کی دی ہوئی ہے۔ افادی الاقتصادی بھی انھیں کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے۔ چونکہ اصطلاح اسوقت بالکل غیر مانوس تھی اور پھر چونکہ مہدی حسن فلسفہ 'افادیت' کی معقولیت کے معترف بھی تھے اس لئے بعض بے تکلف احباب مذاق میں ان کو "افادی الاقتصادی" پکارنے لگے۔ یہاں تک کہ ادبی دنیا میں "افادی الاقتصادی" ان کے نام کا ایک جزو بن گیا۔

افادی الاقتصادی کی تحریروں کی امتیازی شان وہ نفاست اور نزاکت ہے جو ان کی فطرت ثانی تھی اور جو صرف مغرب میں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری اپنی قابل قدر تصنیف "اسالیب بیان" میں لکھتے ہیں "مہدی رسکن کی طرح الفاظ کے خوشنما بیل بوٹے بنا کر پیش کرتے ہیں"۔ آگے چل کر اسی مصنف کی رائے ہے کہ "ان کی عبارتیں انگریزی کھانوں کی طرح خوشنما ہونے کے علاوہ سہل الہضم بھی ہوتی ہیں"۔

لیکن مجھے "افادی الاقتصادی" والٹر پیٹر سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان کی عبارت میں جو تعمیری آہنگ اور ان کے اسلوب میں جو بلیغ ترنم ہوتا ہے وہ کافی حد تک رسکن کی یاد تازہ کرتا ہے۔ لیکن پھر مصنف کے اپنے تیور اور اس کا اپنا زاویہ نگاہ بھی کوئی چیز ہے۔ رسکن کے اندر جو واعظانہ رنگ غالب رہتی تھی اس کی کوئی علامت مہدی مرحوم میں نہیں پائی جاتی۔ رسکن کے خیال میں جمالیاتی حسن بجائے خود کوئی قدر و قیمت کی چیز نہیں۔ وہ جمالیات کو اخلاقیات کی روشنی میں دیکھتا ہے اور حسن کو خیر کے ماتحت تصور کرنا چاہتا ہے جس سے حسن کی اپنی قدر گھٹ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے پیٹر جو بر رفائیلائٹ صناعوں اور فرانسیسی مدرسہ جمالیات سے متاثر ہو چکا تھا حسن اور وہ بھی حسن صورت کو حاصل کونین سمجھتا تھا جس کے ساتھ اس کے والہانہ جذبات عبودیت کی حد تک پہونچے ہوئے تھے اس کے خیال میں حسن کے لئے کسی قسم کے خارجی اعتبارات کی ضرورت نہیں حسن اگر حسن ہے تو سب کچھ ہے۔ یہی انداز افادی الاقتصادی کا ہے۔ حسن کو سوا حسن کے اور کچھ ہونے کی ضرورت نہیں۔ انگریزی کے جوانمرگ شاعر کیٹس کی طرح ان کے لئے بھی "حسین چیز ایک ابدی مسرت ہے"۔ وہ خالص حسن اور خالص صناعی کے قائل ہیں اسی لئے ان کو اسلوب کا اتنا ہی تیز اور شدید احساس ہے جتنا پیٹر کو تھا یا جتنا اس کے بعد اس کے پیرو آسکر وائلڈ کو رہا۔

افادی الاقتصادی نے جتنے مقالات لکھے ہیں ان میں سے بیشتر تنقیدیں ہیں۔ اسکا اعتراف ہے کہ یہ تنقیدیں

زیادہ تر وقتی اور سرسری ہیں۔ لیکن ہیں بہرحال تنقیدیں۔ بہ حیثیت تنقید نگار کے بھی وہ بہت کچھ پیٹر ہی کو یاد دلاتے ہیں پیٹر کا تنقیدی اسلوب محاکاتی یا ارتسامی ہوتا ہے جس کو ہیزلٹ اور لیمب کا ترکہ سمجھنا چاہئے۔ افادی الاقتصادی کا انداز تنقید بھی یہی ہے۔ اردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تنقید کو ادب لطیف بنایا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پیٹر کی طرح انھوں نے بھی تنقید کو شاعری اور وہ بھی غزل کے مرتبہ کی چیز بنادیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی وقتی باتوں میں اس قدر ہمیشگی پیدا کرسکے ہیں کہ آج بھی ہم ان سے اسی طرح کیف اندوز ہوتے ہیں۔

جن انگریزی انشا پردازوں کا ذکر میں نے کیا ہے ان سب میں ایک عنصر مشترک یہ بھی تھا کہ ان کی تحریریں ان کے ذاتی میلانات اور اپنے مزاج و طبیعت کا آئینہ ہوتی تھیں۔ افادی الاقتصادی کی بھی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ان کی انفرادی زندگی کے آثار ہر لمحہ بے نقاب ہونے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ ان کے مزاج کی نفاست اور ان کی فطری شرافت ان کے ایک ایک لفظ میں جھلکتی ہوتی ہے۔

افادی الاقتصادی فن مکتوب نگاری میں بھی آپ اپنی نظیر ہیں۔ غالب کے بعد اردو میں ایسا خط لکھنے والا نہیں پیدا ہوا۔ یوں تو اکثر مشاہیر ادب اردو ایسے نکلیں گے جن کے مکاتیب کو ہم آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ لیکن خطوط مہدی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ان کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ دراصل خط لکھنے کا کیا سلیقہ ہے اور ہندوستانی ابھی اس سلیقہ سے کس قدر بیگانہ ہے۔ مجھے تو "عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں بھی وہ بات نہیں ملی جو خطوط مہدی میں ہے۔ غالب کے خطوط سے اہتمام کی بو آتی ہے۔ میں بعض جدید نقادوں کی طرح یہ کہنے کے لئے تو تیار نہیں کہ غالب واقعی محنت و کاوش کے ساتھ خط لکھتے تھے اور یہ سمجھ کر کہ ممکن ہے آئندہ ان کے خط شائع ہو جائیں لیکن پڑھنے والوں کو اس قسم کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط کا مجموعی آہنگ وہی ہے جس کو خود غالب کی زبان میں "سادگی و پرکاری" یا افادی الاقتصادی کی اصطلاح میں "پیدا کردہ بے ساختہ پن" کہیں گے۔ لیکن خطوط مہدی کا طرہ امتیاز وہ بے تکلفی اور معصومیت ہے جو فطری ہوتے ہوئے بھی خالص صناعی کا حکم رکھتی ہے۔ وہ اردو مکتوب نگاری کے کاؤپر ہیں۔ ان کے خطوط بھی اسی طرح خالص وصداقت سے معمور اور ریا و تصنع سے خالی ہوتے ہیں جس طرح کہ کاؤپر کے خطوط۔ وہ جانتے ہیں کہ روز کی معمولی باتوں میں ندرت اور تازگی کیسے پیدا کیجائے اور اہم اور غیر معمولی باتوں کو خلوص۔ سادگی اور تاثیر سے بھر کر عوام کے لئے دلچسپ کیونکر بنایا جائے۔ کاؤپر کی طرح وہ بھی خطوط میں اپنی ساری شخصیت کو بے نقاب کر دیتے ہیں لیکن کہیں سے خودی یا انانیت یا کسی قسم کے عصبی تناؤ کا احساس نہیں آنے دیتے۔ انھوں نے روزمرہ کی زندگی کو اپنے خطوط میں رومان بنا دیا ہے۔

ان کے خطوط ابھی عوام کے سامنے نہیں آئے ہیں لیکن مہدی بیگم جنھوں نے اب سے تقریباً پندرہ برس پہلے "افادات مہدی" سے ہم کو روشناس کرایا تھا ان کے خطوط کو بھی مرتب کر کے مطبع کے سپرد کر چکی ہیں اور اب وہ عنقریب شائع ہو کر اہل ذوق کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ اس کے لئے ہم جس قدر بھی مہدی بیگم کے ممنون ہوں کم ہے کہ انھوں نے

ان ادبی موتیوں کو محنت کر کے ہمارے لئے اکٹھا کر دیا اس وقت اس مجموعہ کا کوئی خط میرے سامنے نہیں ہے کہ میں اس میں سے مثال پیش کروں۔ لیکن دو چار خط مجھے مل گئے ہیں جن کے لئے میں خان بہادر مولوی محمد ذکی صاحب اور ان کی بیگم یعنی مرحوم کی بڑی لڑکی کا ممنون ہوں۔ یہ خطوط مجموعہ میں شاید اس لئے نہیں شامل ہیں کہ وہ بے انتہا نجی اور ذاتی ہیں۔ لیکن میری غرض انھیں سے پوری ہو سکتی تھی اس لئے کہ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ ضرورت سے زیادہ نجی اور معمولی باتوں کو بھی سب کی دلچسپی کی چیزیں کیسے بنا دیتے تھے۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک ہی خط لکھتے ہیں اور اس میں اپنے دو خرد سال بچوں کے حرکات و سکنات کی یوں مصوری کرتے ہیں۔

"ایک لڑکا آگے آگے بھاگا چلا جاتا ہے۔ ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کچھ اختلاف ہو گیا ہے اس لئے دانت کاٹنے کی فکر میں ہے۔ دری کے فرش تک تو یہ گھٹنیوں چلا (جسے تم بکیاں کہتی ہو) اس کے بعد ٹاٹ کی رگڑ سے بچنے کے لئے یہ چھوٹا سا دو ٹانگ کا حیوان چوپایہ بن گیا ہے اور اب شاہد کی پنڈلی پر دانت جمایا چاہتا ہے۔ لیکن مدد پہنچ گئی۔ ناقد کا وار خالی گیا!"

اپنی بڑی لڑکی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تمہارے ہاتھ کی کھجوروں نے الہ آباد کی زندگی یاد دلائی۔ کبھی کیسی اچھی طرز زندگی تھی۔ تم نے نئے سرے سے زندگی پائی۔ خدا کرے اس درمیان میں تم نے پوری ترقی کر لی ہو اور اس قابل رہو کہ تمہارے خیال سے دل بہلاتا رہوں"

اسی لڑکی کو ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :۔

"خدا پر بھروسہ رکھو اور ذرا بھی دلگیر نہ ہو۔ یہ فطرت کے معمولی عوامل ہیں جو ہوتے رہتے ہیں۔ خدا میری ہیرا تراشن بیٹی کو ضائع نہیں کرے گا۔ ثبوت یہ ہے کہ تم نے ایک غیر علاج پذیر مرض سے معجزانہ شفا پائی اگر تم واقعی مجھے چاہتی ہو تو دل نہ چھوٹا کرو۔"

پھر دوسرے خط میں لکھتے ہیں :۔

"آج کل گرمی میں کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا یہاں تک کہ میں نے کھانا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ کبھی ولایتی دلیا دو دانت کے کھالئے۔ کبھی مچھلی کا ایک ٹکڑا الہ آباد سے آئی ہوئی ڈبل روٹی اور مکھن کے ساتھ بشرطیکہ نارنگی کا جام بھی ہو غرض ٹالتا رہتا ہوں۔ دال بھات کی مقداری ترکیب آج کل کے موسم کے لئے کس قدر ناموزوں ہے۔"

ان خطوط کو پڑھکر ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ سچی رومانیت اور سچی تخئیلیت اگر ہم کو کہیں مل سکتی ہے تو وہ صرف روزمرہ زندگی کی معمولی باتوں میں جن کو عموماً ہم اس قدر بے کیف اور غیر دلکش پاتے ہیں۔

میں اب صرف چند اقتباسات اور دینا چاہتا ہوں اور اسکے بعد آپ لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔

خان بہادر محمد ذکی صاحب کو لکھتے ہیں :۔

مدت کے بعد آپ کا خط دیکھا۔ یہ بھی غنیمت ہے آپ مطمئن ہیں میری طرف سے کوئی غیر عاقلانہ پیش قدمی نہیں ہوگی۔ تاہم لوگوں کو جو کچھ میں نے لکھا وہ میرے احساسات کا اظہار تھا اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے جذبات کو چھپاؤں۔"

اپنے دوست مولوی محمد اذراغ صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"میری زندگی میں کچھ دنوں بہ ایں ہمہ جس قدر میری تمدنی رفتار تیز تھی۔ اقتصادی مشکلات پر جلد نہ غالب آ سکا ..... اس خیال سے کانپ اٹھتا تھا کہ کمند اگر لب بام پہنچ کر ٹوٹی تو اس حیثیت سے افسوس رہ جائے گا کہ توسیع میعاد کی درخواست یعنی کاسۂ گدائی ہاتھ میں ہو گا اور میں تب دیکھے موتی پیا ما تا تھا جس کا اپنی آن بان رشک زندگی میں ہزار موانع کے ساتھ بھی عادی تھا۔ بہر حال بخیر گذشت۔

خان بہادر محمد ذکی صاحب کو لکھتے ہیں:۔

عبدالماجد کی نئی تصنیف یعنی "فلسفہ اجتماع" آپ نے دیکھی۔ "فلسفہ جذبات" کے بعد یہ دوسری کتاب ہے۔ جو ایک نہایت ضروری موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اور در اصل اردو لٹریچر میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ ڈاکٹر لیبان نے جو حکمائے عصر میں ایک زندہ مصنف اور زبردست عالم نفسیات ہیں فرنچ میں روح الاجتماع پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ مصریوں نے عربی میں کیا ہے یہ کتاب بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ مہینے میں آپکی عربی اتنی ہو سکتی ہے کہ آپ بے تکلف ادب الاساتذہ (کلاسکل لٹریچر) سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کاروباری زندگی میں کیا آپ اتنا وقت نکال سکیں گے۔ دل پر رکھ لینے کی بات ہے خاص کر جدید عربی تو کچھ ایسی بڑی بات نہیں۔ رسائل و لغت سے پورا کام نکل سکتا ہے۔ ایک دوسرے خط میں بڑی لڑکی کو یوں سمجھاتے ہیں:۔ اپنی رفاقت۔ دلسوزی اور ہمدردی سے بار فکر کم کرتی رہو جس کے لئے کمال شائستگی کی ضرورت ہے۔ تمہاری ذرا سی کج ادائی یا کسی وقت معمولی اخلاق کی کمی بڑے سے بڑا جرم ہے جو کوئی خاتون (لیڈی) کر سکتی ہے اور جس کا فرض غم کا بھلا دینا ہے ....." اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

موسم بہت سخت ہے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ کنوئیں کا پانی جب شہر میں بیماری کی شکایت ہو قابل اطمینان نہیں ہوتا اسلئے ابال کر کورے آبخوروں میں ٹھنڈا کر کے پیو۔ کھانے میں کوئی چیز ثقیل نہ ہو۔ ٹھنڈی غذا ٹھنڈا دودھ استعمال نہ کرو۔ ہر چیز تیز گرم ہونی چاہئے جس میں کالرا کے جرمس اگر ہوں گے بھی تو فنا ہو جائیں گے۔ خاص کر "قاتل انسان" یعنی مکھی سے کھانے کی چیزوں کو بچاؤ۔ یعنی وہ جس غذا پر بیٹھے سمجھو لو متاثر ہو گئی۔ ایک بات کا اور خیال رکھنا عید یا ڈیڑھ یا ڈیڑھ پاؤ کے نوالے دن رات میں اگر بارہ دفعہ بھی حلق سے اتارے تو کوئی حرج نہیں لیکن اب آصفیہ آنکھ بچا کر نہ شریک ہوں" اسی لڑکی کو ایک خط میں تدبیر منزل کا سبق اس لطیف پیرایہ میں دیتے ہیں گویا کسی نہایت پر کیف شعر کے رموز سمجھا رہے ہیں:۔ "لکڑی کل گئی۔ آج بھی جاتی ہے۔ اتنی اچھی ہے کہ جلانے کے عوض کھانے کو جی چاہے گا۔ سب باہر نہ رکھواؤ ممکن ام غائب کر دیگا یا بے ضرورت پھونک دیگا..."

ایک دوست کے خط میں لکھتے ہیں:۔ دنیا کو ایسے ناپاک وجود سے خالی ہونا تھا جو بے تصرف اشخاص کی جائز آزادی اور قدرتی سکون و عافیت میں مخل ہو۔ میں تیسرے درجہ کی مخلوق کو اخلاقی حیثیت سے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتا رہا۔ لیکن ایسی سخت وحشیانہ مثال اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ....."

آخر میں میں ایک بار پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ افادی الاقتصادی کے اندر ایک خداداد ذوق جمال تھا اور ان کی نگاہ حسن شناس تھی۔ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کے اندر اس حسن کو دیکھ لیتے تھے جو اس کی سطحی کثافتوں میں چھپا ہوتا تھا۔ اور ان کا پیغام یہ تھا کہ حسن مقصود بالذات ہے اور حسین چیز اپنی زندگی کے لئے کسی دوسری چیز کی دست نگر نہیں ہے۔

(غیر مطبوعہ)

فلسفہ سیاسیات کا ایک رخ

از جناب مولوی محمد رضوان اللہ بی ایس سی، ال ال بی، ایم ایل اے کا ایک بہترین سیاسی مقالہ

حکومت کا آغاز اور اس کے حدود کار کا تعین انسانی جماعت بندی کے ساتھ ساتھ ہوا اور جس طرح جماعت کی تنظیم مرتب ہوتی گئی اسی طرح حکومت کے قواعد و ضوابط میں توسیع ہوتی گئی۔ لیکن اگر علمی حیثیت سے حکومت کی ترتیب و تنظیم کا جائزہ لیا جائے تو یہ بہت صاف و واضح طور پر چند الفاظ میں نہایت آسانی سے ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ علم سیاسیات کے مطابق مختلف الہیئت اور نوع بہ نوع طرز حکومت کے باوجود ایک ہی نظریہ اٹل اور کارفرما معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرد واحد یا چند افراد یا بہت سے اشخاص اپنے خودغرضانہ مقاصد یا کلیتاً محکوم کے مفاد کو مدنظر رکھ کر حکومت قائم کرتے اور چلاتے رہے ہیں۔

مندرجہ بالا نظریہ کی تشریح کیلئے غالباً حکومت کی ہر طرح کی علمی و عملی سیاسی تقسیم کو صدیوں کی تاریخی مثالوں سے نمایاں کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود تاریخ کی ورق گردانی یا تمثیلات سے مضمون میں بے جا گرانی و تلخی پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ قارئین کے سامنے ایک تیزی سے گذر جانے والے مصور پردہ کے مانند اہم واقعات کو اجمالاً و سرسری طور پر پیش کر دینا ہے۔ البتہ یہ سوال ضرور ہے کہ آیا یہ سیاسی کلیہ ہماری سیاست میں کہاں تک کارفرما رہا اس لئے اس کی وضاحت لازم ہے۔ ابتداءً حکومت کا قیام گروہ جماعت یا اجتماعی تنظیم اور اس کے حقوق کے تحفظ کے لئے ضروری قرار پایا اور اسی لحاظ سے ان کے سردار پر یہ ذمہ داریاں جماعت کی منشاء سے ڈال دی جاتی تھیں لیکن بالعموم سرداری کا عہدہ آبائی ہوتا تھا اسی لئے رفتہ رفتہ حکومت کی ذمہ داری بھی آبائی قرار پائی۔

حکومت کرنے والے طبعاً جس انداز کے ہوتے وہی عکس ان کی طرز حکومت میں بھی نمایاں رہتا تھا۔ اگر کوئی حاکم اس اقتدار کو محض اپنی خودغرضانہ مقصد براری کا آلہ کار بناتا تھا تو وہ اصولاً جابر ([illegible]) کہلاتا۔ قدیم زمانہ میں بعض بعض ممالک میں یہ بھی ہوا ہے کہ حکومت کی ذمہ داری محض ایک سردار پر نہیں ہوتی تھی بلکہ گروہ یا جتھے کے چند سر برآوردہ اشخاص کے ذمہ ہوتی تھی یا کہیں کہیں لیکن بہت کم ملکوں میں یہ بھی ہوا کہ گروہ یا جتھا یا جمہور کی طرف سے بہت سے افراد اس ذمہ داری کی انجام دہی کے لئے مامور کر دئے جاتے تھے لیکن عموماً یہ طبقہ حکومت کا مدار اپنے مقاصد کے حصول قرار دیا کرتا تھا اسی لئے اس طرح کی طرز حکومت کو اصطلاحاً جبری حکومت ([illegible]) کہتے ہیں۔

یورپ کی اقوام میں بھی حکومت کا انداز وہی تھا جو ایشیا کی قدیم قوموں میں رائج تھا۔ مگر آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو برس پہلے طرزِ حکومت کے اس تخیل میں انقلابی صورت عرب میں پیدا ہوئی اور اسلامی خلافت کے ابتدائی دور نے دنیا میں اصولِ انتخاب و نیز اغراض و مقاصدِ حکومت میں ایسی اہم تبدیلیاں پیدا کر دیں جو جدید سیاستِ عالم کا واحد نشانِ منزل بن گئیں۔ اس طرزِ حکومت کے اجرا نے قوموں کی حالت میں ایسی سیاسی تبدیلی پیدا کر دی کہ یورپ کی تثلیثی جنگوں کے اہم نتائج سے موثر ہو کر انھوں نے قومیت (NATIONALISM) کے اصول قائم کر کے اپنی حکومتوں کو نئے سیاسی قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا یہاں تک کہ انقلابِ فرانس نے جمہوری (DEMOCRATIC) طرزِ حکومت کا اولین خاکہ تیار کیا جس کو فرانسیسیوں نے اپنے ملک میں رواج دے کر اور قوموں کو تقلید کا موقع دیا۔

جمہوری طرزِ حکومت نے رفتہ رفتہ یورپ کے ہر ملک پر کم و بیش غلبہ حاصل کر لیا۔ بعض بعض ملکوں میں شہنشاہیت قائم رہنے کے باوجود وہ محض محدود ہو کر رہ گئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جمہوری حکومت شہنشاہیت کے سایہ میں مدغم ہو گئی انگلستان کی مثال محدود شہنشاہیت اور موثر جمہوریت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس ملک کی سیاست نہایت ہی لچکدار اور انوکھی ہے۔ حکومت کے جملہ انتظامات شہنشاہ کے نام پر قوم کے نمائندے انجام دیتے ہیں۔ اس طرح کے دو اصولی طرزِ حکومت کے اتحاد و اتصال کا نمونہ کسی اور ملک میں نہیں ملتا ہے جس کے باعث انگریزی قومی سیاست کا وقار بہت بڑھ گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ ملک اُن نہایت اہم و دشوار سیاسی پیچیدگیوں اور کشمکش کا کبھی شکار نہیں ہوا جس کی بدولت دوسرے ممالک اور بالخصوص فرانس کو کئی بار بہت خراب دن دیکھنے پڑے۔

گذشتہ جنگِ عظیم سے تقریباً ساڑھے تین سو برس قبل یعنی انقلابِ فرانس کے زمانہ سے سیاسی دنیا میں جمہوریت نے پورے طور پر فروغ پایا۔ لیکن جیوں جیوں زمانہ گذرتا گیا تمثیلی جمہوریت (IDEAL DEMOCRACY) کا اصول بالکل ناممکن العمل معلوم ہونے لگا اور تمدن نے اس سیاسی تخیل کو محض ایک علمی نظریہ قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ قومیں اس کی طرف تیز رفتار سے بڑھنے کے بجائے دوسرے طرزِ حکومت کی متلاشی ہو گئیں یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے اختتام پر قومیں عموماً انانیت (DICTATORSHIP) کی طرف رفتہ رفتہ بڑھنے لگیں تقریباً ۳ صدیوں کی جمہوریت کے تجربہ نے پورے طور پر یہ ظاہر کر دیا کہ یہ طرزِ حکومت بھی نقائص سے بری نہیں ہے بلکہ دیگر طرزِ حکومت کے مقابلہ میں کم پایہ دار اور کافی دشوار گذار ہے۔

تمثیلی حکومت (IDEAL STATE) کا معیار یہ قرار دیا گیا ہے کہ حکومت جتنے افراد پر مشتمل ہو وہ سب کے سب انفرادی آزادی کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ مرفع الحال ہو سکیں اور حکومت سے کما حقہٗ منتفع بہ ہوتے رہیں۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر جب جمہوری طرزِ حکومت کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ سیاسی منزلِ مقصود تک پہونچنے میں یہ طرز ہمارے لئے کچھ بہت زیادہ تسکین بخش نہیں ہے اور یہی وجہ ہوئی کہ روس میں بالشوزم (BOLSHEVISM)

اور اس کے کچھ عرصہ بعد اٹلی میں فیسی سزم (FACISISM) کا دور دورہ ہوگیا - یہ دونوں تمدن سیاسی نقطہ نگاہ نیز آئندہ تجربہ کے لحاظ سے نہایت ہی دلچسپ اور ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

بالشویزم (BOLSHEVISM) کا نظریہ حکومت میں اشتراکیت کا پورے طور پر نفاذ مقصود ہے اور اس کا عملی تجربہ روس میں ہو رہا ہے - کارل مارکس (KARL MARKS) اور اس کے ہم خیال رہم نوا لینن (LINEN) و ٹراسکی (TROSKEY) اور اسٹیلن (STALIN) کم وبیش اسی اصول کے پابند اور اُن کی زندگی اسی مقصد کے احیا رو اشاعت کے لئے وقف رہی ہے - جہاں تک اس نظریہ کا تخیلات و تصورات سے تعلق ہے سرسری طور پر نظر ڈالنے سے یہ ایک بہتر اصول تمدن کہلانے کا مستحق ہے لیکن عملی صورت میں آنے کے بعد اتنی دشواریاں اور کمزوریاں ظاہر ہوئیں کہ اس کے باعث دن رات روس میں نہایت خوفناک واقعات رونما ہو رہے ہیں جو عالم انسانیت کو خوفزدہ و متوحش کر رہے ہیں اور یہ امر بھی پایہ تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ اس کے اصول انسانی فطرت کی بہت سی تعصبات سے متصادم ہوتے ہیں اس لئے انسانی طبعی ترقی ایسی حکومت کے ماتحت جو اس تمدن کے قیام کی ضامن ہو ممکن نہیں ہوسکتی اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے دیگر ممالک میں خالص بالشویک (BOLSHEVIC) طرز حکومت کا رواج اب تک نہیں ہوسکا۔ جنگ عظیم کے بعد اس تمدن کا اثر اٹلی پر بھی پڑا تھا لیکن وہاں اس کو پورے طور پر کامیابی حاصل نہیں ہوسکی بلکہ اس کے خراب نتائج وہاں بہت جلد رونما ہوگئے جس کی وجہ سے اسکے خلاف فیسی سزم (FACISISM) نے وہاں مضبوط طور پر جڑ پکڑ لی اور آج کل ان دونوں تمدن کا تصادم انسانیت کے لئے عجیب معمہ بن کر رہ گیا ہے۔

جہاں جنگ عظیم نے نئے تمدن پر حکومتوں کی بنیاد از سر نو قائم کرنے کا موقع مہیا کیا وہاں اسی قدر نمایاں ایک اور نظریہ حکومت کے دستور پر غالب آیا - اور وہ انانیت (DICTATOR SHIP) کا اصولی رواج ہے - گذشتہ جنگ سے پہلے انسانی تخیل و سیاست کا مدار جمہوریت (DEMOCRACY) پر تھا لیکن قوموں کو اس سے منحرف ہو کر انانیت (DICTATOR SHIP) کے اصول کو اپنی آئندہ سیاسی نجات کا ذریعہ قرار دینا پڑا چنانچہ روس جرمنی و اٹلی ٹرکی وغیرہ اس اصول پر پورے طور پر کاربند ہیں - اس موقع پر میں ایک نہایت اہم مگر عمومی نقطہ کیطرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حقیقتاً کسی اصول کار کا دار و مدار بجز ایک مرکزی تخیل کے نہیں قائم کیا جاسکتا - وہ مرکزی تخیل ہمیشہ ایک دماغ کا مرہون منت ہوتا ہے - یہ ممکن ہے کہ اس مرکزی تخیل پر قدرے عوام یا اس کے منتخب کردہ نمائندوں کے خیالات سے اثر اندازی ہوسکے مگر اصل تخیل کی کارفرمائی یقینی ہوتی ہے - چنانچہ اگر اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ہم شہنشاہیت (IMPERIALISM) یا جمہوریت (DEMOCRACY) یا انانیت (DICTATOR SHIP) کا جائزہ لیں تو یہی ایک اصول کسی نہ کسی شکل میں کام کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے - فرق صرف اس قدر ہے کہ شہنشاہیت میں مرکزی تخیل پر عوام کے خیالات کا اثر قطعاً مفقود ہوتا ہے - یا بہت ہی کم رہتا ہے - برخلاف اس کے جمہوریت کی صورت میں مرکزی تخیل پر عوام کے خیالات کا اثر بہت ہی غالب ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ان دونوں شکلوں میں

حسب خواہ انسانی ارتقاء کی عدم کامیابی کو یقینی سمجھ کر آج کل عملی سیاست میں تیسری نوعیت یعنی انانیت کو زیادہ رواج پانے کا موقع میا ہوگیا ہے۔ اس نوعیت کی حکومت میں دونوں پہلو یعنی ایک طرف مرکزی تخیل کا پورا پورا احیاء اور دوسری جانب جمہور کے خیالات کا بقدر ضرورت اثر قائم رہتا ہے اس لئے یہ طرز حکومت مرکزی طور پر مضبوط اور اس کے ابھرنے کی خاصیت عام منشا کے مطابق باقی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا اس اصول حکومت کی طرف گرویدگی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

اگر آپ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اسلامی سیاست کے ابتدائی دور کے طرف جائیں تو آپ آسانی سے اس کا مشاہدہ کر سکیں گے کہ دونوں موجودہ نئے تمدن یعنی بالشویزم (BOLSHEVISM) کی تحریک اشتراکیت اور فیسیزم (FACISISM) کی تحریک فسطائیت کے ضروری وصول اسلامی تمدن کا سنگ بنیاد مانے گئے ہیں مساوات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مراتبی و طبقاتی عناصر کا مناسب جزو انسانی جماعت بندی کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ طرز حکومت میں جمہوریت کے منشا کے مطابق انتخاب کے پہلو کو قائم رکھ کر خلیفہ کو آزاد انہ انانیت (DICTATORSHIP) کے اصول پر کام کرنے کا پورا پورا موقع دیا گیا ہے یہی اصول آج کل دنیا کی عملی سیاست کے مسلمات بن رہے ہیں۔ کیا اگر اس موقع پر یہ کہا جائے تو مناسب نہ ہوگا کہ دنیائے انسانیت اپنے تعمیر کردہ تمدن اور قائم کردہ اصول حکومت جس کی بنیاد انسانی طبع کے مطابق نفسانیت پر ہے اس سے پریشان و عاجز ہو کر ایسے تمدن اور طرز حکومت کی متلاشی ہے۔ جس کے ذریعہ اس کو سکون اور فارغ البالی اور بالآخر نجات حاصل ہو۔ موجودہ طرز حکومت کی تبدیلیاں اور جدید تمدن کا نفاذ اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ کہ عالم انسانیت صحیح تمدن و طرز حکومت کی طرف دوڑ رہا ہے۔ وہ تمدن اور طرز حکومت کیا ہیں۔ وہ یقیناً اسلامی تمدن اور طرز حکومت ہیں جن میں نفسانیت کا مکمل فقدان اور ربانیت کا پورا پورا اجارہ ہے۔ خود غرضانہ حدود سے آگے نکل کر خداوندی اصول پر جب تک انسانیت کی رفعت و ترقی کا مدار نہیں سمجھا جائے گا اور اس کو انسانی کاروباری زندگی کا نصب العین نہیں قرار دیا جائے گا۔ اس وقت تک انسانی مشکلات کا قطعی حل اور امن و سکون کی حتمی ضمانت ناممکن ہے۔



جناب مولوی نثار اللہ صاحب ایم - ال - اے
رئیس اعظم گورکھپور

عکس تحریر جناب صاحبزادہ نواب سید علی اکبر بی اے، ال، ال، بی (ایڈیٹر ناظم) گورکھپور

بندہ نواز - محترم قبلہ سلامت

دست بستہ آداب عرض۔ مجھکو اپنے وعدہ کا خیال تھا۔ آج سبکدوش ہوتا ہوں۔ مضمون کا تصویر سے ربط ہے۔ روداد تصویر میں اس خط میں لکھ چکا ہوں۔ اگر یہ جناب کو پسند آجائے تو خود جناب ممنون ہوں۔ تصویر بھیجا تو قدرت سامنے اعضا کو پیش خدمت کر سکا۔ میں اپنی ترکیب ذہنی کی ترتیب پاتا ہوں۔ یہ لطف اصلاح پیش کرتا ہوں۔ آپ کا خط تو لکھ چکا تھا کہ میرے تخیل نے مجھکو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے دیکھا مگر کچھ پرسش سے تبادلہ خیال نہ کر سکا - اب آپکی حسب ضرورت کرتا ہوں

اپنی تصویر کے ہاتھوں میں برا بن جاؤں

یہ تقاضائے محبت مجھے منظور نہیں

میں یادگار زمانہ ہوں مگر ابھی نہیں۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ مگر ابھی سے پابند آرزو ہو جانا۔ اور اپنی یادگار حیات کو سپرد خاک کر دینا۔ خوب نہیں۔ میں نے کوئی نمایاں کارنامہ نہیں کیا کہ آپ کے سامنے رہوں۔ میری زندگی حجاب آسا ہے۔ اور خیال ہے کہ اسکو نقش برآب ہی رہنے دوں۔ میرے سامنے مشکلات ہیں۔ ان سے مقابلہ کرتا ہوں اور یوں زندگی بسر کرتا ہوں۔ میری جانبازی ایک حد تک ضرور قابل ستائش ہے۔ مگر انگشت نمائی سے ڈر لگتا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں بدنام ہوں مگر تشہیر نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے خدا پیکر حیات کو اسکی زد سے بچا - آمین

مجھکو لوگ جانتے ہیں۔ اسکا بھی مجھکو احساس ہے۔ مگر میں اپنے ہم عصروں سے معذرت کرتے ہوئے۔ یہ عرض کرونگا - کہ تصویر کے ہمیشہ دو رخ ہوتے ہیں۔ میرے لئے قدرت نے ہر بات پیدا کی ہیں منظر لطیف میں ہوں۔ انسان ہوں۔ مگر حسن بندگی سے یکسر دور ہوں۔ اس لئے قاصر ہوں کہ اپنی روداد زندگی کو مصور کے ہاتھوں میں لاکر پابند کر دوں۔ میرے ارادے مستحکم ہیں۔ اگر لوگ اس کو خام خیالی سے خطاب کرتے ہیں جس سے مجھکو تکلیف پہنچتی ہے۔ اور میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ یہ برقع زندگی مجھکو بے حجاب ہونے سے روکتا ہے - میں خود نمائی نہیں چاہتا صرف دعاگو ہوں اور دعا چاہتا ہوں

میرے خیال میں تصویر دیکھنا بھی ایک چیز ہے - ایک زبان کو خطابات اور الزامات سے روکتی ہے - وہ مجھکو اپنے دل میں دیکھتا ہے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ مروت کی خاطر میری خطاؤں پر صلواتیں نہیں بھیجتا۔ خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح سوال و جواب کی بحث سے میں داخل حسنات ہوتا ہوں۔ اور وہ بھی باثواب ہوتا ہے۔ واقعہ ہے کہ جب تک ایک چیز حفظ ماتقدم میں رہتی ہے تو ہمیشہ اچھی اور نئی نئی شکایتیں تبدیل کرتی ہے۔ مگر جب وہی چیز پبلک کے سامنے آتی ہے۔ تو نئے نئے روپ بدلتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نظریں نقاد ہیں۔ مناظر قدرت کو سامنے رکھتی ہیں۔ اور دل اشکال پر ہے۔ جو نظر دل کو صحیح انتخابات سے روکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک مقبول ہستی معتوب ہو جاتی ہے۔ مجھکو اس موقع پر ایک افسانہ یاد آیا - عرض کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک مصور نے ایک خوبصورت تصویر بنائی۔ اور اپنی دوکان میں رکھ چھوڑی۔ اس کے احباب آئے اور اس سے مصر ہوئے کہ تم اسکو ایک نمایاں جگہ میں ٹانگ دو۔ اور یہ نوٹ لکھ دو کہ جسکا دل چاہے اسکی کمی پوری کر سکتا ہے۔ اس کے احباب کو یقین تھا کہ تصویر عمدہ ہے۔ عیب سے پاک ہے۔ کوئی حرف ہی کیا لکھ سکتا ہے۔ مگر یہاں مذاق حسن جداگانہ رکھتے ہیں۔ ہر نظر باز نے اپنی طبع آزمائی فرمائی۔ نوبت باین جا رسید کہ دوسرے ہی دن وہ تصویر نقطوں کی آماجگاہ ہو گئی۔ اور وہ تصویر تصویر نہ رہی۔ مصور کی بدنامی ہوئی...... مگر حقیقت کا انکشاف ہوا میرا صانع خدا ہے۔ یہ اسکی قدرت ہے کہ ہم بولتے ہیں۔ چلتے ہیں۔ پھرتے ہیں۔ اور جذبوں سے کام لیتے ہیں۔ اور ہمیں اسی قدرت جانتے ہیں۔ اور مہذب کہلاتے ہیں۔ مگر غور کیا جائے تو سارے انداز مجھکو انقلاب کی جانب لیجاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا سکھلاتے ہیں۔ نعوذ باللہ ایک خدا کے سو خدا بناتے ہیں۔ مگر ہم۔ ہم ہیں۔ پابند ہو چکے ہیں۔ دنیا کو دیکھنے آئے......

ایک موٹر کی کمپنی کوئی موٹر تیار کرتی ہے۔ تو اسکو اسی طرح چلانا چاہتی ہے۔ اور جب تک وہ اپنی اصلی حالت میں رہتی ہے وہ اپنا کام کرتی ہے۔ اور آرام پہونچاتی ہے۔ مگر جب اسمیں ہاتھ کی صفائی دیکھائی جاتی ہے تو وہ ٹھپ ہو جاتی ہے۔ اسیطرح جب انسان اشرف کے جامے میں رہتا ہے۔ وہ مقبول نظر رہتا ہے۔ مگر جب وہ انسان بننے کی کوشش میں تبدیل ہیئت کرتا ہے تو وہ بدنام اور رسوا ہو جاتا ہے...... شیخ صحرا کار خیر میں مصروف ہو کر دشت نوردی میں مشغول ہوا۔ در بدر کی ٹھوکر کھائی۔ مگر نتیجہ سے نا آشنا رہا۔ اب فقط افسانہ بنکر رہگیا ہے۔ چونکہ اس کی تلاش تلاش حسن تھی۔ اسلئے لیلی رسوا ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ سیہ فام تھی۔ مگر عاشق اسکو بہ نظر مجنوں دیکھتے ہیں۔ اور اسکی قدر کرتے ہیں... ہماری تلاش تلاش محض ہے ہر روز نئی زندگی شروع کرتے ہیں اور وہیں ختم کرتے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں ع نہ خدا ہی ملے نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کا رہوں نہ ادھر کا رہوں۔ اب میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا خدا کو اپنی عکس نمائی منظور ہے۔ وہ اپنا پرتو ہر صورت اور ہر شے میں دیکھتا ہے۔ اسکی شان موجد دنیا ہے جسمیں اسکا ہر رنگ مختلف طور پر ظاہر ہے اور ہوتا رہا۔ وہ اپنی تصویر بنا سکتا تھا مگر اسکو عیب جوئی پسند نہیں... اپنی قدرت دیکھتا ہے۔ اور جگ سے خود کو چھپاتا ہے۔ یہ ہمارے لئے موزوں نہیں۔ ہمیں عبادت سے کام ہے اور اپنی طرف دلوں کو بلانا ہے ع دلوں میں تیرے نظر میں صحرا حجاب ہستی اٹھا اٹھا ہے۔ معافی کا طالب علی اکبر عقیل

عکسِ تحریر احمد علی شوق قدوائی (مرحوم)

شاہجہان آباد — بھوپال ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۱۶ء

حافظ صاحب عنایت فرمائے بندہ زاد عنایتکم سلام شوق — آپ کا خط
جو میرے خط کے جواب میں ہے — مجھے پہونچا — دہلی کے مونث الفاظ کی جمع
عموماً دہلی میں آپ "تانیث" ہی کے ساتھ کہی اور لکھی جاتی ہے — میری نگاہ سے
"مقالات عام" وغیرہ کے پرچے جہاں تک گذرے — اون میں فصحائے دہلی کے
مضامین میں اب یہی ترکیب پائی گئی — دہلی کے علاوہ میں تو آزاد و سجاد و دیگر
تصنیفات میں دیکھ رہا ہوں کہ "انہیں جمعیں" تانیث ہی کے ساتھ مستعمل ہوتی ہیں
بے شک مرزا داغ اور ان کے علاوہ دیگر شعراء دہلی نے بھی ہمیشہ تذکیر کے ساتھ
کہا ہے مگر گفتگو تو اس میں ہے کہ نثر میں — اب تو تانیث ہی کے ساتھ
رواج ہے — چاہیے وہ الفاظ مونث حقیقی کی صنف سے ہوں چاہے غیر حقیقی کی
صنف سے —

یہ اصلاح عام رواج سے ہوئی ہو یا قصداً کی گئی ہو — میری رائے میں
بہت معقول اور مناسب ہوئی — شہر دہلی اس اصلاح میں لکھنؤ سے اچھا رہا —
چونکہ خواتین کی زبان میں یہی ترکیب تانیث جمع کی عموماً داخل ہے اور
چونکہ جو شہر لکھنؤ سے قریب اور دہلی سے دور ہیں — وہ بھی اسی روش کو
اختیار کئے ہوئے ہیں — لہٰذا میں خیال کرتا ہوں کہ صرف ایک شہر لکھنؤ کو
منفرد رہ کر اس ترکیب میں شکست ہوگی — اور جمع مونث کی شکل تذکیر کے ساتھ میں
صرف اہل لکھنؤ اور اونکے مقلدین ہی کی نثر و نظم تک محدود رہ جائیگی — آج قریب قریب
تمام ہندوستان میں اس دہلی ہی کی ترکیب کا رواج زیادہ بلکہ زیادہ تر ہو رہا ہے —

اس خط سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اسے اختیار کریں — یہ بھی
غرض نہیں ہے کہ کوئی بحث پیش آئے — یہ بھی مدعا نہیں ہے کہ کوئی اسے
برا سمجھے یا اچھا — میں اپنی ذات کے واسطے دہلی کی روش کو پسند کر چکا
اور عربی کے الفاظ مونث کی جمعوں کو تانیث ہی کے ساتھ کہونگا — بلکہ
جدید تصانیف میں یوں ہی کہہ رہا ہوں —

یہ بات کہ مصالحت — اشتقاق اور صفات وغیرہ کی جمعیں مونث
بولی اور لکھی جائینگی تو زبان اس ترکیب کے موافق رہیگی یا نہیں — میں
کہتا ہوں کہ زبان ہمیشہ طرز تقریر اور طرز تحریر کے رواج عام سے موافق ہوتی
جاتی ہے — جو الفاظ پیشتر مذکر بولے جاتے تھے اور اب مونث ہونے
جانے لگے — یا اسکے برعکس — اون کے لئے زبان کیونکر موافق ہوگئی
صرف رواج سے — آخر دہلی اور قریب قریب ہندوستان کے بہت سے حصوں کی
زبان کیونکر موافق ہوگئی — اسی وقت صلوٰۃ عام پر میری نظر پڑی —
وہ لکھتا ہے کہ "اور ہندوستان میں بھی معتبر تصانیف تصوف کی فارسی میں ملینگی"
اس جملے میں تصنیف کی جمع تانیث ہی کے ساتھ یائے معروف سے لکھی گئی ہے
یہ تو صرف ایک فقرہ کی مثال میں نے لکھ دی — کتاب حمیدیہ کا ترجمہ کا نمونہ سا

چھپا ہوا ہو۔ ۶ ۹ ، مضمون پر ہے ۔ اس میں تمام الفاظ مونث کی جمع تانیث کیسے تھے

عورات کی جمع متکلم صیغۂ مذکر کے ساتھ بولی جاتی ہے ۔ بے شک ۔ مگر میں خدا سے

امید کئے ہوئے ہوں کہ اس کی اصلاح بھی کسی دن ہو گی اور اسی طرح زبان کی اور

بے اصول ترکیبوں کی ۔

چونکہ مجھے صرف اپنی ذات کے لئے دہلی کی ترکیب اختیار کرتی ہے اور میں

اسی جدید ترکیب سے کہہ رہا ہوں اس لئے میں صرف اپنی ذات کے واسطے

کسی اخبار میں اعلان دے دیدونگا تاکہ میری ذات کا استثناء ہو جائے لیکن

میں یہ ہے ایسے استحکام کے ساتھ قائم کر چکا ہوں اور اسکو با اصول پائے ایسا

اسکا پابند ہونا چاہتا ہوں کہ اس سے ہٹ نہیں سکتا

میں زبان اور شاعری کے معاملات میں تخئیل جدید کا طرف کش ہوں اور

چونکہ اردو علمی زبان بنائی جاتی ہے اسلئے جب تک اس میں اصلاحات نہ ہوں

تب تک دشوار رہی ہے ۔

میں غزل کو ایک شمع اور دل حبیب چیز سمجھتا ہوں ۔ تغزل کے خلاف

نہیں ہوں بلکہ جو لوگ غزل کو مٹانا چاہتے ہیں میں انکے خلاف ہوں ۔ لیکن

میرے خیال میں غزل کو عشق و حسن کے جذبات کا پاک تر ذریعہ رہنا چاہئے

نہ کہ فحش ۔ اور ذلیل مضامین کا ذخیرہ ۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں مجبوری سے

کسی کی فرمائش پر کچھ بھی دیتا ہوں اور خود بہت ہی شاذ ۔ ورنہ امرد پرستی اور

رقابت وغیرہ کے بے غیرتانہ مضامین بہت ہی ناگوار تھے ہیں ۔ طبیعت ہی

تو ہے ۔ ان خواہش سے ہٹ گئی ہے ۔

میں نہیں جانتا کہ کسی کا خیال کیا ہے اور ہو ۔ مینے زیادہ تر فطری

رنگ اختیار کر لیا ہے ۔ وہ بھی علمی یا اخلاقی شکلوں پر ۔ جدید مثنوی جو

چھپنے کو گئی ہے وہ بھی قدیم رنگ سے متجاوز ہے ۔

میں یہ خیالات اثر ڈالنے کو نہیں لکھ رہا ہوں ۔ میرا اور آپ کا معاملہ

ایک ہے ۔ ایک ہی سلسلۂ خاندان سخن سنجی ۔ ایک ہی جتھا ۔ مگر لنکا کرنا

میرا خیال اردو کو تنگ دائرے سے نکالنے کا ہے مگر نہ انگریزی پرست

ہوقونوں کی طرح ۔ بلکہ اصول شاعری اور ضوابط سخن کو لئے ہوئے جو

نقائص کو دور کرنے پر متوجہ ہوں وہ صحیح اصول پر ہیں نہ یہ کہ انگریزی کے الفاظ

بلا ضرورت بھرے جائیں اور قیود قافیہ ۔ و ردیف اور تحفظ الفاظ سے

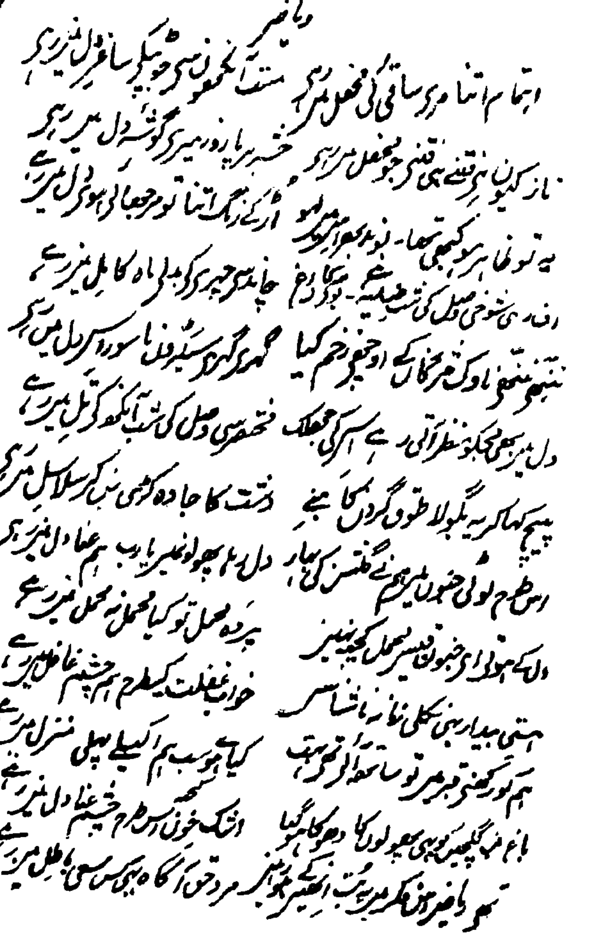
تجاوز کرکے شاعری کی مٹی خراب کی جائے بلکہ اردو کی بھی ۔ جیسے جا تک پنجاب کی

ہو رہی ہے

امید ہے کہ آپ اور آخر سلمہ اچھے ہوں ۔

احمد علی ۔ شوق

عکس تحریر حضرت ریاض خیر آبادی (مرحوم)



کمزوری تیرا نام عورت ہے

ایک شاعر کی ڈائری کے چند اوراق

حضرت فطرت واسطی کا ایک لاجواب افسانہ

۳۰ جولائی ۱۹۳۶ء ——— آج پریم لتا کا خط آیا ——— حالانکہ ایک بڑا یوروپین ادیب کہہ چکا ہے کہ جب دو دوست علیحدہ ہو جائیں تو انھیں خط نہ لکھنا چاہئے۔ خط و کتابت کا لازمی نتیجہ مادی بُعد اور فصل میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انسانی چہرہ کی متنوع حرکتوں میں وہ ذرائع اظہار پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا الفاظ (خواہ وہ کتنے ہی چھیلے ہوں) کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مثلاً اسی وقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ جو برقی قوتیں پریم لتا کے چہرہ میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنے اور میرے خیالات کو سمجھنے کی موجود ہیں۔ وہ میرے ان الفاظ کو کہاں نصیب۔ شکسپیر نے سچ کہا ہے "الفاظ بڑے دھوکے باز ہوتے ہیں" WORDS ARE TRICKSY THINGS

پندرہویں صدی میں ویبسٹر کہہ گیا ہے کہ "ہم پرچھائیں ہیں اور پرچھائیں ہی کی طرح گذر جائیں گے"۔ اگر یہ سچ ہے تو پریم لتا کیوں آزردہ ہے کہ میں نے اسے تفصیلی خط ہی لکھا اور نہ تصویر بھیجی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پریم لتا میری تمام بندگیوں کی مرجع رہ چکی ہے' آج ہے ——— اور اگر اس حیات کے بعد احساس اور اظہار کی صلاحیت باقی رہی تب بھی یہی کہوں گا۔ اسی کے ساتھ میرے پیش تخیل یہ اعتقاد بھی رہتا ہے کہ کوئی کیسا ہی دلکش اور حسین کیوں نہ ہو مگر خوبصورت جلد کے نیچے وہ ایک زخمی لاش سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔

برنیف BERENICE کا نوعمر نکھار اور قلو پطرا کا پختہ جادو جب اس سے وقیع تر نہیں ہے کہ کوئی رومانی شاعر اس پر ڈرامہ لکھے اور دنیا کے بے فکرے اور تفریح پسند اسے دیکھنے جائیں .... تو میں کیسے یقین کروں کہ ابتدا سے انتہا تک میری روح کے سفرنامہ میں ایسے حوادث کی بھی کوئی اہمیت ہے ——— وہ دریافت کرتی ہے کہ میں اسے زیادہ چاہتا ہوں یا وہ مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ میں اسے کیسے بتاؤں کہ افلاطونی محبت اس قسم کی دماغی کمزوری ہے جسے مہذب لوگ اخلاقاً بھولے پن سے موسوم کرتے ہیں۔

ورڈس ورتھ نے کہا تھا "جہاں لاعلمی ایک برکت ہو وہاں واقفیت حماقت ہے" کاش میں بھی نہ جانتا ہوتا یا اب بھی

بھول جاؤں کہ محبت درحقیقت کیا ہے۔ اسے جلال الدین رومی نے خوب محسوس کیا یا فرائڈ FREUD اور ینگ JUNG نے اس کا صحیح مطالعہ کیا ہے۔ اب تو میرا بھی یہی خیال ہے کہ محبت کا محرک ایسا جذبہ ہے جس کا نام لیتے ہوئے مہذب اور فریب کار لوگ ڈرتے ہیں۔ اور خاص کر ایسا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی کے شعوری ذہن میں اولاً محبت فاعلہ کمزور اور نقیح ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی حالت میں شکوک مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

گو کہ صدیوں قبل ایک رومی حکیم نے اعلان کیا تھا کہ محبت کرنا اور عقل سلیم کو قائم رکھنا دیوتاؤں کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ بہرحال میں پریم لتا کو کیسے جواب دوں کہ اس کے دل میں (اس کی لاعلمی میں سہی) ایک جذبہ نمائش EXHIBITIONISM بھی ہے جو اسے کسی محبت کرنے والے کی تلاش میں بے چین رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ مگر اسے ایسی حقیقتوں سے کیونکر مطلع کروں جو تلخی سے بھی زیادہ تلخ ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ اس وقت ایک مرتبہ بداخلاقی کا مرتکب ہو جاؤں اور یہ دیر یا کبھی بھی اس خط کا جواب نہ دوں—
اب بارہ بج گئے ہیں میں سونے جاتا ہوں۔

---

۱۷ ستمبر ۱۹۳۶ء ——— صبح کی ڈاک سے پریم لتا کا محبت میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ عرصہ سے میں کسی تعریف یا ناپسندیدگی سے قدرے بے نیاز ہو چکا ہوں پھر بھی ایسے مواقع پیش آجاتے ہیں جب میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل خوش ہونے کے لئے میری خوشامدیں کرتا ہے اور اور میں انسانی آرا کو اہمیت دینے لگتا ہوں۔

پریم لتا نے مجھے لکھا ہے کہ اسے میری نظم "محبت کے دو تیر" بہت پسند آئی۔ اور وہ اس پر تبصرہ بھی لکھ رہی ہے۔ کل میں اسے لکھ دونگا کہ اگر ادبی ذوق اس تحریر کا محرک نہیں ہے تو زبانی تحسین، مطبوعہ تبصرہ سے کہیں زیادہ پرخلوص اور بہتر ہوگی۔

---

۱۸ ستمبر ۱۹۳۶ء ——— میں چائے پیتا جاتا ہوں اور کل کی بقیہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مگر آج کا نوٹ لکھنے کے بعد کوئی پڑھنے والا کیسے معلوم کر سکتا ہے کہ یہ کب لکھا گیا۔ اسی طرح دس روز کے بعد جو واقعات میں لکھونگا ان کے وقت تحریر اور وقوع پذیری کا آج تک مجھے کوئی پتہ نہیں ہے۔

کل دوسری ڈاک سے پریم لتا کی وہ خوشگوار تحریر موصول ہوئی تھی جس نے مجھے اس کے ہمراہ تعطیلات کے اختتام تک مسلسل بنارس ہی میں رہنے کی دعوت کا اعلان کیا ہے۔

---

۱۶ نومبر ۱۹۳۶ء ——— فردوس زار بنارس سے ایک ہفتہ کے بعد آج آیا ہوں۔

اس عرصہ میں پریم لتا کی مہربانیوں میں کچھ ایسا غرق رہا کہ ڈائری میں تفصیلی اندراجات بھی نہ کر سکا۔ بہرحال سب سے اہم دیوالی کے واقعات ہیں۔

پریم لتا تمام دن اپنے کمرہ کو قندیلوں، فانوسوں اور برقی چراغوں سے سجانے اور گھر کو ارم زار بنانے میں محو رہی ہیں دن بھر اس سے ملنے کے انتظار میں شعر کہتا رہا۔ اور اپنے خیالات کے منظم ہار گوندھنے میں مصروف رہا۔ شام کو میں اس سے ملنے گیا۔ وہ میرے انتظار میں آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھی اور نرم اور نازک ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے کر اس نے اپنے دلکش تبسم سے میرا استقبال کیا۔ اس کی دلفریب نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھ سے کمرہ کی آرائش اور اپنی خوش سلیقگی کی داد چاہتی ہے۔ عورت اپنی خواہشوں کو زبان سے ظاہر کرنے میں ہمیشہ شکست محسوس کرتی ہے۔ اس کی ہر بات میں فریب بھی ہوتا ہے اور غرور بھی مگر اس کا اندازہ آسان نہیں۔

پریم کے خفیف اصرار کے بعد میری نظم "جشن چراغاں" نے نغموں کا روپ اختیار کر لیا۔ نظم کے آخر میں جب اس کا نام آیا تو وہ اس جادوگر کی طرح مسکرائی جس کا جادو پورا کام کر چکا ہو۔ اس وقت میرے دل کی حرکت میں شدید اضافہ ہو گیا اور میں اسے مسحور ہو کر دیر تک دیکھتا رہا۔

پریم لتا! اف پریم لتا! جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی ناسمجھ، جس قدر محبت کے معاملہ میں آزاد ہے اس سے زیادہ مذہب اور ملت کے مسئلہ میں مجبور۔ وہ سماجی رسم و رواج کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتی۔ حالانکہ نوع انسان میں افراد تو اچھے اور کافی دلچسپ ہوتے ہیں مگر جب انھیں کو یکجا کر دیا جائے تو وہ قابو میں نہ آنے والے جسیم درندہ کے ہم معنی ہو جاتے ہیں جسے "سماج" کہتے ہیں۔ ایسی بے حقیقت چیز کی پرواہ کرنا پبلک کے بھوت DEMOGORGON کی عبادت ہے۔

---

۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء —— کل شام کو میں رام گنگا کے کنارے، دنیا اور گوشت کی آلائشوں سے دور بیٹھا تھا۔ آسمان کسی یوروپین دوشیزہ کی آنکھ کی طرح نیلا تھا —— مگر کیسا ظلم ہوا کہ مختلف رنگوں کے ابر میرے اور اس کے درمیان حائل ہو گئے ورڈس ورتھ نے کہا تھا کہ اصل تعریف کا مستحق وہ آرٹ ہے جو تیز رفتار ابر پارہ کو قائم کر سکتا ہو اور اڑتے ہوئے دھوئیں کو بغیر علاقہ غیر فانی بنا سکتا ہو، لیکن اس آرٹ کا ترجمہ مجھ سے انسان کے لئے فوٹوگرافی نہیں ہو سکتا۔ وہ فن لطیف ہے ضرور مگر محدود ہے اور اس پر طرح طرح کے قیود بھی عائد ہوتے ہیں۔ اول تو فوٹوگرافی کا ذریعہ ایک کمرہ، دوسرے نقرئی نمک ہے جو سیاہی اور سفیدی کے علاوہ مزید پرواز سے قاصر ہے —— مگر الفاظ کے لئے طول و عرض کی پابندی ہے اور نہ رنگ و صلابت کی قید —— ان کے لوچ کی مثال موسیقی بھی پیش نہیں کر سکتی۔ میرا تو ایمان ہے کہ "بغیر شاعری کے زندگی ایک سخت غلطی ہوتی"۔

آج میں بیحد بے چین ہو رہا ہوں اور ایسا روحانی اضطراب اور خیالی تناؤ محسوس کرتا ہوں جیسا کہ میں کسی سے ملنے

کے لئے نہیں بلکہ اس کی ملاقات کو ایک نظم میں غیر فانی بنانے کے لئے بے چین ہو کر محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت گیارہ بج چکے ہیں مگر میں شعر کہونگا اور شاید آج سے بہتر نظم میں پھر کبھی نہ کہہ سکونگا۔

یکم دسمبر ۱۹۳۶ء ——— آج کنور کا خط آیا۔ جب کبھی میں بنارس گیا کنور نے جی کھول کر میری مدارات کی۔ انھوں نے ہمیشہ کہا کہ وہ میری نظموں میں پریم لتا سے زیادہ حسن محسوس کرتے ہیں — ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ پریم مجھ سے محبت کرتی ہے اور میں بھی اسے چاہتا ہوں — پھر انھوں نے یہ کیسے لکھا کہ پریم ان سے شادی کرنے کو تیار ہے۔ کیا مذہب کی آگ نے محبت کو سوخت کر دیا۔ کیا سماج کے بھوت نے دو متحد دلوں کو ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا۔ نہیں! مجھ میں تو کوئی تغیر ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ پریم لتا کو اختیار ہے۔

---

۷ فروری ۱۹۳۷ء ——— کوئی روٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اسے منائیں۔ مگر مجھ ایسے شوریدہ سر تو بے اعتنائی کو عین الفت اور بے التفاتی کو تکمیل محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یا یہ کہئے کہ اس کے خوگر ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے یہ فلسفہ شکست ہو۔ مگر یہ میرا فلسفہ ہے۔ یہ ان لوگوں کا نظریہ بھی ہو سکتا ہے جو منقش پردے کے اس پار بھی وقتاً فوقتاً دیکھ لیا کرتے ہوں۔ عام دنیا والے تو فریب کے غار میں "حقیقت سے اس قدر اجنبی ہو گئے ہیں کہ ان کے لئے ایک عورت کے الہامانہ مفروضات "حدیث محبت" سے بھی سوا ہوتے ہیں۔ محبت کی ساری کائنات میں اگر کوئی قابل قدر چیز ہے تو یہ محبت کرنے والے کو اپنے راسخ العمل ہونے کا یقین ہوتا ہے ——— پریم لتا مجھ سے ناراض ہے مگر اس کی ناراضگی میرے استحکام اور ایمان پر فتح نہیں حاصل کر سکتی اور صرف اس لئے کہ میں نے اسے عرصہ سے خط نہیں لکھا ہے۔ ہم گئے گذروں کے لئے تو یہ معمولی بات ہے۔
مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خود تو جی کھول کر جو چاہتی ہے لکھتی ہے۔ مگر میرے اظہار محبت سے گریز کرتی ہے شاید وہ مجھے ابھی دھوکے میں رکھنا چاہتی ہے۔ بہر حال مستقبل خود اس کا فیصلہ کر دے گا۔

---

۱۰ مارچ ۱۹۳۷ء ——— ابھی کتنا عرصہ ہوا چند سال قبل پریم لتا اور ہم دونوں اجنبی تھے۔ اتنے ہی زمانے میں محبت کا رشتہ دماغی اور جسمانی مرض ہوا اور سرحد توازن سے تجاوز کر گیا۔ اب ہم وہاں ہیں جہاں تلخیوں میں شیرینی محسوس ہوتی ہے۔ اور گذری باتوں کی یاد حافظہ پر ایک ناخوشگوار خواب سے زیادہ گراں محسوس ہو رہی ہے ——— اچھا ہوا پریم لتا نے میرے دونوں خطوط کا جواب نہیں دیا۔ سچ ہے مرد جس قدر جلد عورت کے سامنے سپر ڈالنے کو تیار ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ عجلت سے عورت ماحول سے مغلوب ہو جاتی ہے۔
پریم لتا کو وہ زمانہ اب کہاں یاد جب میں شام ہی سے اس سے ملنے کو جاتا تھا اور ساری ساری راتیں باتوں میں

گذر جاتی تھیں۔ میں نے اس کے کنول سے زیادہ خوبصورت ہاتھوں کو بار ہا چوما ہے جیسے کوئی پجاری اپنے مخصوص بت کو بوسہ دیتا ہے۔

اسے کیا معلوم کہ میری راتیں کس بے چینی سے گذرتی ہیں اس لئے نہیں کہ وہ میری ہو جائے بلکہ اس لئے کہ میں اُسے روح سے بھی قریب تر پاتا ہوں۔ میری حیات وقف انتظار نہیں ہے بلکہ مصروفِ خیر مقدم۔ اب بھی مجھے کوئی بیوفا سمجھے تو میں کیا کروں۔

---

۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء ——— آج کئی ماہ کے بعد پریم لتا سے ملنے گیا۔ اس نے دیرینہ وضع کو ملحوظ رکھتے ہوئے تواضع میں تو کمی نہیں کی ——— مگر اس کی ہر مہربانی میں ایک بے تعلقی، ہر ربط میں ایک بے اختلاطی اور ہر قرب میں ایک دوری موجود تھی ممکن ہے کنور جی نے نہ محسوس کیا ہو مگر مجھے اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہے۔

آج کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب کنور جی شام کو تفریح کے لئے چلے گئے اور کمرہ میں ہم دونوں عرصہ کے بعد تنہا رہ گئے تو پریم لتا نے مجھ سے کہا "مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ میری زندگی کے منظوم افسانے دنیا کے سامنے کیوں پیش کرتے ہیں۔ میرے دل کو اس تشہیر سے تکلیف پہونچتی ہے"۔ اس کے بعد اس کا یہ کہنا کہ "میری باتوں پر آپ برا تو نہیں مانتے" یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب میں نے سکوت سے دیا۔ جب میں چلنے لگا تو اس نے ایک خوبصورت رومال میں رکھ کر اپنی شبیہ اور غالباً آخری یادگار دی۔

شبیہ میں پریم کی مشابہت موجود ہے مگر ایک کمزور مشابہت بہرحال اس کی یاد کو تازہ کرنے کیلئے یہ موثر ترین ذریعہ ہو سکتی ہے چاہے شرک ہی کیوں نہ ہو اس لئے کہ :-

بت پرستم بہ اسلام مرا کالے نیست

اگر تصویر کے ایک کونے پر تمھاری مخلص پریم لکھ دیتی تو کیا نقصان ہو جاتا لیکن اسے تو دنیا کا خوف ہے۔ کیا محبت کا عمل (گناہ ہو یا ثواب) اتنا رقیق اور قوی نہیں ہے کہ ہر فعل اپنی اصلیت کو بدل دے؟ بہرحال ہر شخص کو اپنے عمل پر اختیار ہے۔

پریم لتا کو قدرت نے اسی لئے تخلیق کیا ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ مجھے اس سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ محبت ایک ہمیشہ قائم رہنے والا ستارہ ہے جس میں ارتعاش یا تزلزل قطعی غیر ممکن ہے۔ یہ تو محبت کرنے والوں کو روشنی کے طوفان میں ڈبو کر ایسا غیر مادی بنا دیتا ہے کہ مادیت یا مادئین کو ان کے بارے میں دخل کی گنجائش نہیں رہجاتی۔

---

۱۳ اگست ۱۹۳۷ء ——— یہ اتفاقی صورت تھی کہ آج شب کو پریم لتا سے سنیما میں ملاقات ہو گئی۔ میں تصویروں میں کیا گیا تھا؟ مجھے اس کا علم جانے سے پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ پریم نے

مجھ سے گفتگو کرنا چاہی مگر میں خاموش رہا۔ اس نے مجھے کئی بار خوبصورت لڑکیوں کے رقص و سرود کی جانب متوجہ کیا مگر میں کسی نامعلوم اور نامحسوس خیال میں غرق رہا۔ میں شبہ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سینما جانے سے قبل مجھے محمود کا خط ملا تھا جس کے اس جملے نے کہ "عورت سے عقیدت کا لگاؤ کسی بڑے روگ سے کم نہیں ہے" میرے دماغ پر عجیب طرح کا نفسیاتی اثر کیا۔ مجھے سینما میں بھی رہ رہ کر محمود کا جملہ یاد آ رہا تھا۔ غالباً میں "عورت کی محبت" پر غور کر رہا تھا کہ پریم نے میری جیب سے ایک کاغذ نکال لیا۔ میں چونک پڑا۔ اس پر میری ایک غیر مطبوعہ نظم "عقیدت کے پھول" کا مسودہ تھا۔ تماشہ ختم ہو چکا تھا اور وہ ظالم میری نظم لے کر ہنستی ہوئی رخصت ہو گئی۔ کیا وہ نظم اسے پسند ہے۔ نہیں یہ بھی دھوکا ہے۔ افسوس مرد کس قدر سادہ لوح ہوتا ہے۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ یہ نظم اسی کی تعریف میں ہے۔ افسوس اسے یہ بھی گوارا نہ ہو سکا۔

---

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء ——— آج صبح سے نہ جانے کیوں پریم لتا مجھے بہت یاد آ رہی ہے۔ پریم لتا کو میں نے ہمیشہ پھول تصور کیا۔ دوشیزہ ہمیشہ پھول ہی ہوا کرتی ہے جس کی غایتِ وجود خوشبو بن کر دماغوں کو معطر کرنا اور مہکتے مہکتے بے مہک یا تمام تر مہک ہو جانا ہے۔

ایک آلودۂ محبت اپنی لغزشوں کے احساس کے بجائے اتنا ہی محسوس کر سکتا ہے کہ ایک مہک تھی جو پھول کے باہر نکلی اور اب اس کے اندر واپس نہیں جا سکتی ——— اس کی آفرینش ہی علیحدگی ہے ——— اب مجھے اک گونہ صبر بھی ہو چکا ہے کہ چاند سے چھوٹی ہوئی شعاعوں کی طرح میں پریم لتا سے دور ہوں ——— کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ میں یہاں سے کہیں چلا جاؤں مگر کیا کوئی جلاوطن اپنے آپ سے بھی بچ سکتا ہے۔ گھر چھوٹ سکتا ہے، وطن سے دوری ممکن ہے مگر وہ کیفیت جو مجھ میں پیدا ہو گئی ہے اور میری حیاتِ شاعرہ سے وابستہ ہے، جو مجھے بے چین کر رہی ہے اور ہمیشہ بے چین کرتی رہے گی ——— وہ مجھے کب آزاد کر سکتی ہے۔

غریب کیٹس آخر عمر تک FANNY BRAWNE کا نام لیتا رہا اور روتا رہا۔ ناسمجھوں نے اسے بزدل اور کم ہمت بتایا ہے مگر یہ کتنی بڑی حقیقت ہے کہ رونے کے ایسے بے لطف مشغلہ سے عشق کی تمام تلافی کی جائے۔ کوئی کیا جانے اس کے لئے کتنا بڑا دل درکار تھا۔ اگر صبح کے تاروں کو ڈوبنے سے کوئی نہیں بچا سکتا، رات کے تھکے ہارے چاند کے چہرہ سے پریشانی کے آثار کوئی دور نہیں کر سکتا تو مجھے تمام عمر رونے سے کون روک سکتا ہے۔ اب مجھے رونے ہی میں مسرت اور ابدی مسرت ملتی ہے۔

خوشی کو غم کے طوفاں میں ڈبوتا ہوں
ہنسا ہوں جتنا میں اتنا ہی روتا ہوں — فطرت

چکبست کی شاعری

نوٹ: جناب حسن جمیل کا یہ مقالہ اسلامیہ کالج گورکھپور میں پڑھا گیا تھا۔ مقالہ بہت خوب ہے مگر افسوس کہ دیر میں وصول ہونے کے باعث مکمل نہ شائع ہو سکا۔ ایڈیٹر

موجودہ زمانہ میں جبکہ ہندوستان کی قومی تشکیل و تعمیر ہو رہی ہے ایک قومی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔

چکبست اپنے زمانہ کے بہترین شعرا میں سے تھے۔ اردو شاعری میں ایک سے ایک شاعر گذرے ہیں مگر ہر ایک کو ہم شاعر کہنے کے لئے تیار نہیں۔ شاعر دراصل وہ ہے کہ جو صحیح معنوں میں قوم کی زبان ہو اور جیسا کہ اقبال نے کہا ہے "دیدہ بینائے قوم ہو" اس کا موضوع صرف یہ ہے کہ انسانیت (HUMANITY) اور اس کی قوم کو اس زمانہ میں کیا درکار ہے۔ وہ ایک سچا پیغام لئے ہوئے آتا ہے کہ جس کی اشاعت اپنے کلام سے کرتا ہے۔ قوم افلاس و تنگدستی کی خوفناک کشتی میں ناپیدا کنار دریا میں جا رہی ہو اور ناخدائے قوم "سخاوت۔ محبت۔ عیش و مسرت کے رنگین ترانے گاتا ہو۔ تو یہ انسانیت کے خلاف ہے۔ اس کو ہم شاعر نہیں کہہ سکتے کیونکہ قدرت نے شاعر کو ایک حساس قلب دیا ہے اس کو قوم میں نہ صرف دلوں کو خوش کرنے کو بھیجا ہے بلکہ قوم کا رہبر بنا کر منزل مقصود بتانے کے لئے اور جوش رہروی پیدا کرنے کے لئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی تمام زندگی پند و نصائح میں ختم کر دے۔ پند و نصیحت اپنا درجہ الگ رکھتی ہے۔ شعریت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اگر دونوں چیزیں ایک ہوتیں تو نبی شاعر ضرور ہوتا اور ہر شاعر نبی اللہ ...... مگر شاعر پیغمبر ضرور ہوتا ہے اگرچہ اس کا پیام مختلف ہوتا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ع۔ "اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے"۔ وہ ستائش و صلہ سے بے پروا ہوتا ہے مگر شورش و ضروریات زمانہ سے ہم آہنگ ضرور ہوتا ہے۔

اگر کوئی شاعر ایسے زمانہ میں پیدا ہو کہ جب قوم کی حالت کو ننگ و افلاس میں پڑے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا ہو اور وہ اس سے بے خبر ہو۔ "پدرم سلطاں بود" کا راگ گاتی ہو اور اپنے حکومت و آزادی کے زمانہ کی طرح عیش و خوش رنگیوں میں ڈوبی ہو ہر فرد اس کا زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف اور اپنے افعال کی پرواہ نہ کرتا ہو حتیٰ کہ اس زمانہ کے شاعر بھی گل و بلبل کے فسانے۔ عشق و محبت کے لطیفے۔ مے و مینا کے خصوصیات بیان کرتے ہوں ایسے زمانہ میں اگر کوئی شخص سچے راستے کی تلقین کرے تو وہ نہ صرف قابل تعریف بلکہ اصلی معنوں میں شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔

چکبست بالکل ایسے ہی زمانہ میں پیدا ہوئے سیاسی۔ معاشرتی۔ مذہبی غرضکہ ہر حیثیت سے زمانہ مطمئن کن

نہ تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب قیود اور غلامی کی زنجیروں سے پریشان ہوکر قومی لیڈروں نے آزادی کی صدا بلند کی چکبست نے اپنے کلام میں اس کو لبیک کہا - یہ وہ زمانہ تھا کہ ترک موالات کا سوال شروع ہوا تھا - کانگریس قائم ہوئی تھی - ہندو مسلمان میں اتحاد کی کوشش ہوئی تھی - تعلیم نسواں اور پردے کا ضروری اور غیر ضروری ہونے کا سوال پیدا ہوا تھا جدید طرز معاشرت کی طرف لوگوں کا رجحان ہو چلا تھا -

اس سب کا اثر اردو زبان پر بھی پڑا - لوگوں نے انداز بیان کو بدلنا چاہا - خواہ وہ نظم ہو یا نثر میں - آزاد اس تحریک کے موجد تھے ——————— حالی نے نہایت سرگرمی کے ساتھ انکا ساتھ دیا - انھوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور نثر میں نئے طرز ایجاد کئے - اس کی مخالفت شروع شروع میں ہوئی مگر یہ سب وقتی تھیں - ہر موجد کو اپنے ایجاد کے وقت مخالفت کا منھ ضرور دیکھنا پڑتا ہے - غرضکہ جدید شاعری کی داغ بیل پڑ گئی - لوگوں کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ کہنے والا ٹھیک کہتا ہے - اب تک تمام شاعری غزل سے پر تھی اور اردو شاعری کا تین چوتھائی حصہ غزل پر مشتمل تھا لوگوں نے اب غزل سے ہٹ کر دوسرے اصناف سخن پر طبع آزمائی کی نہ صرف ایرانی اصناف سخن پر بلکہ یورپین بحور اور اوزان استعمال کرنا شروع کئے - پرانے فرسودہ اور پامال مضامین کو لوگوں نے چھوڑنا شروع کیا - جدت خیالی نے زور پکڑا - نئی بندشیں اور نئے محاورے تراشے جانے لگے - سادگیٔ بیان کلام کا خاص جز سمجھا جانے لگا - مگر اب تک اس قسم کے شاعروں کی تعداد اتنی تھی کہ انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی - پرانی شاعری ابھی اسی طرح حاوی تھی -

چکبست ایک حساس قلب اور زوردار طبیعت لیکر پیدا ہوئے تھے ان پر دونوں قسم کی شاعری کا اثر پڑا - ایرانی شاعری کے اثر پڑنے کا سبب نہ صرف ان کا ماحول تھا بلکہ انھوں نے متقدمین کے کلام کا وسیع مطالعہ کیا تھا - ان کے پاس خیالات کا لامحدود خزانہ تھا اور چونکہ وہ قوم کے لئے آزادی کی صدا بلند کرنا چاہتے تھے اس لئے قدیم طرز شاعری ناموزوں تھا - انھوں نے جدید و قدیم طرز شاعری کو ملا کر نئی راہ نکالی جس کے خود سالک ہوئے جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے -

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں　　　عروس شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ انھوں نے قوم کو کیا پیغام دیا یہاں پر صرف یہ جان لینا ضروری ہے کہ ان کے کلام پر غالب و آتش اور سب سے زیادہ انیس کے کلام کا اثر پڑا ہے - اور اکثر جگہ انیس کی تقلید کی ہے - خواجہ آتش اور میر انیس کے کلام سے ان کے کلام میں روانی پیدا ہو گئی -

ان کی بندش الفاظ نہایت چست ہوتی تھی ان کے یہاں شوکت الفاظ زیادہ نہیں - سادے اور شیریں الفاظ کو اس خوبی سے باندھ جاتے تھے کہ فصاحت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ معلوم ہوتا تھا - فصاحت انھوں نے کبھی ہاتھ سے نہ جانے دی مثلاً یہ دو مصرعے -

۱ - کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں

۲ - دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

چکبست کہیں کہیں غریب الفاظ بھی لے آئے ہیں مگر اس کی وجہ شاید مجبوری ہے کیونکہ زیادہ غریب الفاظ انکے مسدس میں پائے جاتے ہیں کہ جہاں قافیہ کی قید و بند سے فصاحت کا قائم رکھنا دشوار ہوگیا ہے۔ مثلاً فریاد قوم میں کہتے ہیں۔

ع - جگر سے اپنی ہے جیوڑ کی زمیں سرکی

نہایت بھدے قسم کی تعقید ہے مگر چونکہ دوسرے مصرعہ میں "آکر" سے قافیہ ملاتا ہے اسلئے بدرجہ مجبوری ایسا کیا۔ چکبست نے ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔

ع :- ست جسے کہتے ہیں وہ آگ ہے دسانا کی

ع :- قوم غافل نہیں ماتا تری غمخواری سے

ع :- تو گرفتار سہی ہے تری شکتی آزاد

ع :- زمین ہند کی اگلے گی سو نہ بیر اپنے

چکبست کا کلام ابتذال اور سخافت سے پاک ہے انکے انداز بیان میں سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے اور بعض جگہ بلاغت بھی مگر زود فہم مثلاً رام چندر جی اپنی ماں سے رخصت ہوتے ہیں۔ ماں اپنی شومئی قسمت پر روتی ہے بے قراری ظاہر کرتی ہے اور نہ جانے پر مُصر ہے اس موقع پر جس انداز سے وہ صبر دلاتے ہیں بلاغت کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر انسانی نفسیات سے خوب واقف ہے مصیبت کو مصلحت خداوندی سے تعبیر کرتا ہے۔ مجبوری سے شکر کہتا ہے۔ شاید اس میں کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔ تلقین صبر بھی اسی طرح کرتے ہیں چنانچہ رامچندر جی بھی کہتے ہیں۔

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی　　کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

پھر صبر دلانے کا ایک اور طریقہ ہے۔ ایک ہی شخص دنیا میں آفت رسیدہ نہیں بلکہ ہزاروں ہیں۔ چکبست یہ بھی رامچندر جی کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار　　ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار

پھر ایک اور طریقہ ہے مصیبت پڑنے پر صبر خود بخود آجاتا ہے۔ اسلئے مصیبت سے پہلے گھبرانا نہیں چاہیئے انسان پر ہزاروں تکالیف پڑتی ہیں اور ہر ایک کو ہنس کر یا رو کر وہ جھیلتا ہے۔ یہ بھی رامچندر جی سے کہلواتے ہیں۔

پڑتا ہے جب غریب پر رنج و محن کا بار　　کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار

صبر کا ایک اور طریقہ ہے مصیبت کے زمانہ کو آئندہ آنے والی راحت کی امید میں گذار دے۔ امید بھی بڑی مطمئن کن چیز ہے چنانچہ یہ بھی کہلواتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

(خاص سالنامہ کیلئے)

برامکہ کا عروج وزوال

تاریخ انقلاب کا عبرت انگیز ورق

(از حضرت ماہر القادری)

دنیا کی تاریخ انقلابات کے خونیں افسانوں سے لبریز ہے، تاریخ کا ایک ایک لفظ درس ہے چشم بصیرت کیلئے، اور عبرت کا سبق ہے "اولی الابصار" کے واسطے! لیکن ہم سے کتنے ہیں، جو ان عبرتناک واقعات سے درس حاصل کرتے ہیں! اور کتنی آنکھیں ہیں، جو مطالعہ کے وقت اشکبار ہو جاتی ہیں، ہم تاریخ کا مطالعہ فن وادب کی حیثیت سے کرتے ہیں، تاریخ کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسی زمین کے اوپر اور اسی آسمان کے نیچے، سورج کی آنکھ نے فلک بوس ایوانوں کو ریت کے ذروں کی طرح اڑتے ہوئے دیکھا ہے، کتنے باغ ہیں، جو عین بہار میں اجڑ گئے ہیں، اور کتنے چراغ ہیں جن کو نصف شب میں خاموش ہو جانا پڑا ہے، جن کی سطوت سے دشت وکوہ لرزتے تھے، جن کے نام کی ہیبت سے جرار لشکر کانپتے تھے، ان کو خاک وخون کے آغوش میں موت کی ہچکیاں لیتے ہوئے دیکھا گیا، جن کے در سے ایک مخلوق پلتی تھی، ان کو در در بھیک مانگتے ہوئے پایا گیا، فردوسی نے کیا خوب کہا ہے:۔

همین است رسم سرائے فریب — گہے بر فراز وگہے بر نشیب

جن سروں پر جڑاؤ تاج جھلمل کرتے تھے، ان پر گرد وغبار کی تہیں جمی ہوئی پائی گئیں، فرش مخمل کی شکن جن تلووں کو ناگوار تھی، ان کو کانٹوں کی نوکوں پر خونچکاں دیکھا گیا۔ جو بدن پھولوں کی سیجوں پر بھی مزید لطافت وگداز کے متمنی رہتے تھے، ان کو پتھر کی چٹانوں پر سونا پڑا۔ جس نگاہ کی ایک جنبش ہزاروں انسانوں کو خاک وخون میں تڑپا سکتی تھی، اس کو رحم وکرم کی بھیک مانگنا پڑی، اور جو ہاتھ کروروں کی دولت لٹا دیتے تھے، ان کی گرفت میں کاسۂ گدائی دیکھا گیا۔ انقلابات کی اسی خوفناک نوعیت سے متاثر ہو کر، گلگشت مصلےٰ، اور آب رکنا باد کا شیدائی بے اختیار پکار اٹھا:۔

بس کن زکبر وناز کہ دیدہ است روزگار — چین قبائے قیصر وطرف کلاہ کے

اس دور میں جبکہ دنیا بادۂ عیش وراحت سے سرمست ہے، تاریخ انقلاب کے عبرتناک اوراق کے مطالعہ کی بیحد ضرورت ہے، اسی ضرورت کے مد نظر میں نہایت ایجاز واختصار کے ساتھ برامکہ کے عروج وزوال کی داستان ناظرین "شاہکار" کو سنانا چاہتا ہوں۔

شرحے ز حالِ خویش بہ پیمانہ نوشتہ ایم ادراکِ حال ما ز نگہ می تواں نمود

برامکہ کی ابتدا

خاندانِ برامکہ کی ترقی کا آغاز خالد ابن برمک کے عہد سے ہوتا ہے۔ خالد کے باپ کا نام برمک تھا، جو ایران کے مشہور آتشکدے "نوبہار" کا مُغ تھا۔ آتش پرست ایرانی برمک کو مذہبی اعزاز کی بنا پر قدر و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور برمک اور اس کے بیٹے خالد سے ایران کی بڑی آبادی واقف و متعارف تھی۔ آتشکدے کے قریب کھڑے ہو کر زمزمے گانیوالا "اور تبسم گداز" خالد آتشکدۂ نوبہار کی پرسکون فضا میں چین سے نہ بیٹھ سکا۔ قدرت اس سے ایک بڑا کام لینا چاہتی تھی، اور انقلاب کی دیویاں، خالد کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔

پہلا انقلاب تو خالد کی زندگی میں یہ آیا کہ وہ مسلمان ہوگیا۔ آتشکدہ کے مُغ کا مسلمان ہو جانا۔ آتش پرست ایرانیوں کے لئے غیر معمولی بات تھی، مگر انقلاب تو ہمیشہ غیر معمولی باتوں سے ہی شروع ہوا کرتا ہے۔ خالد کو اب نوبہار کی بہار سے لطف اندوز ہونے کا حق حاصل نہ تھا۔ اس نے آتشکدہ کو خیرباد کہا، اور خراسان کے مشہور قائد (ڈکٹیٹر) ابو مسلم کی فوج میں ملازم ہوگیا۔ خالد جوان ہمت اور صاحب تدبیر تھا، تھوڑے ہی دن میں اس کو فوج میں سرداری مل گئی یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جبکہ شجاعت و ہمت کے زور پر ایک انسان تاج و تخت کا مالک بن جاتا تھا۔ خالد کے اثر و اقتدار اور صاحبان سیف میں اس کی قبولیت دیکھ کر، سفاح نے اس کو اپنا وزیر بنالیا۔ سفاح کے بعد منصور نے بھی خالد ہی کو قلمدان وزارت سپرد کر دیا۔ اس طرح بنو عباس کی خلافت، اور برامکہ کی وزارت کا چولی دامن کا ساتھ ہوگیا۔

اعراب کے اقتدار کا زوال

اب تک حکومت کی زمام اہل عرب کے ہاتھ میں تھی، عجمیوں کو حکومت کی طرف سے عہدے دئے جاتے تھے، مگر ذمہ دار عہدوں پر اعراب مقرر ہوتے تھے، اور خلافت کی "مشین" اعراب کے اقتدار کی بھاپ سے چلتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ خلافت کا اصل مرکز مکہ اور مدینہ سمجھا جاتا تھا، اور مسلمانوں کی قوت مرکزیت رکھتی تھی۔ اعراب نے اس بات کی کوشش کی کہ عراق، شام، مصر اور ایران پر قابض ہو جانے کے بعد بھی، مکہ اور مدینہ کی مرکزیت باقی رہے اور اعراب کا اقتدار زائل نہ ہونے پائے۔ مگر خلیفہ منصور نے اعراب کے اس اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اور اپنے موالی اور غلاموں کو اعراب پر حاکم بنا دیا۔ ممکن ہے کہ منصور کے اس فعل کو رواداری کے نقطۂ نگاہ سے قابل تعریف قرار دیا جائے، لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عرب کی روح آزادی کو اس سے بڑا صدمہ پہونچا۔ اور جن کے اسلاف نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے تھے، ان کی اولاد کو جن منزلوں سے گذرنا پڑا، ان پر تاریخ کے صفحات شاہد ہیں — اس انقلاب میں برامکہ کا بھی ہاتھ تھا، یہ خاندان مسلمان ہو چکا تھا، مگر عجمیت اور وطنیت کا احساس کچھ نہ کچھ باقی تھا۔ اور یہ ساری خرابی امپیریلزم (شہنشاہی) کی تھی، جو اسلامی اصول کی مخالف ہے

رشید کی تخت نشینی

خالد کا بیٹا یحییٰ نہایت دانشمند اور صاحب تدبیر تھا۔ اس نے زمانہ کے بہت سے سرد و گرم دیکھے تھے۔ مہدی کے انتقال کے بعد جب ہادی تخت نشین ہوا، تو اس نے تخت پر بیٹھتے ہی ہارون الرشید

کی ولیعہدی کو منسوخ کرنا چاہا۔ مگر یحییٰ کی رائے رشید کے حق میں تھی، اور وہ برابر ہارون الرشید کی تائید کرتا رہا۔ رشید کی حمایت میں اس کو قید و بند کے مصائب بھی اٹھانا پڑے، مگر اس نے رشید کی حمایت سے منہ نہ موڑا، یہاں تک کہ ہادی کا انتقال ہو گیا اور یحییٰ کی تائید، رشید کی تخت نشینی کے بھیس میں جلوہ گر ہوئی۔ رشید یحییٰ کو "والد محترم" کہا کرتا تھا۔ اس نے حکومت کا بڑے سے بڑا اعزاز یحییٰ کو دیا۔ اور "والد محترم" کے خطاب کو لفظوں کی حد تک نہیں، بلکہ عمل کی حد تک پورا کر دکھایا۔

رشید کو یحییٰ سے اس لئے بھی زیادہ لگاؤ تھا، کہ یحییٰ کی بیوی خیزران نے رشید کو دودھ پلایا تھا، یحییٰ کے بیٹے فضل اور رشید میں صرف سات، دن کی چھوٹائی بڑائی تھی، جب رشید بڑا ہوا تو خلیفہ مہدی نے یحییٰ کو رشید کا اتالیق بنا دیا اس طرح رشید کو برامکہ کے گھرانے سے ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا۔

جعفر کی وزارت

یحییٰ کی تمام اولاد قابل اور لائق تھی، اس کے بیٹے باپ کے مختلف اوصاف کے حامل تھے۔ فضل اور جعفر کو تو تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔ فضل سخی اور دریا دل تھا۔ اہل علم و کمال کی قدردانی کرتا تھا فضل جب خراسان کا گورنر تھا تو اس نے وہاں بہت سی خوبصورت عمارتیں بنائیں، اس کا آستانہ اہل علم و کمال کا ملجا و ماویٰ تھا، ۱۷۹ھ میں جب وہ عراق واپس ہوا ہے، تو ہارون الرشید نے قلمدان وزارت اس کے سپرد کر دیا۔ کچھ دن کے بعد رشید نے قلمدان وزارت فضل سے لے کر جعفر کو دیدیا۔ یہ تبدیلی اس نے یحییٰ کے مشورہ سے کی، اور فضل نے بھی بھائی کی عزت کو اپنی عزت سمجھا، جعفر نے سلطان کے مزاج میں اس قدر دخل حاصل کیا۔ کہ دنیا میں شاید ہی کسی وزیر کو یہ عزت نصیب ہوئی ہو، محبت و اتحاد کی انتہا یہ ہے کہ رشید نے ایک ایسا لباس تیار کرایا تھا، جس میں دو گریبان تھے، تاکہ رشید اور جعفر بیک وقت اس کو پہن کر ایک ساتھ بیٹھ سکیں۔ حکومت عباسی کی باگ ڈور درحقیقت جعفر کے ہاتھوں میں تھی، وہ سیاہ و سپید کا مالک تھا، سلطان اس کی مرضی سے سر مو انحراف نہیں کر سکتا تھا، جعفر کے اشارے پر حکومت کی مشین چلتی تھی، جعفر کی دولتسرا کاہے کو تھی، حکومت کا ایوان تھا، جہاں ارکان حکومت سر جھکائے کھڑے رہتے تھے، اس کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ معمولی معمولی آدمی لعل و جواہر سے اپنے دامنوں کو بھر کر اس کے یہاں سے واپس ہوتے۔ جعفر کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی، اہل کمال کو جعفر کی قدردانی کا تصور ہی عراق کی طرف کھینچ کر لاتا تھا۔ جعفر کو خلیفہ کے مزاج میں کس قدر دخل تھا، اس کا ثبوت ذیل کے واقعہ سے مل سکتا ہے۔

عبدالملک ابن صالح ہاشمی، خلافت کا دعویدار تھا۔ اس لئے ہارون الرشید قدرتی طور پر اپنے حریف سے ناخوش تھا۔ ایک دن عبدالملک، جعفر کی بزم عیش میں شریک تھا، شراب کا دور چل رہا تھا، حسین چھوکریاں رقص کر رہی تھیں، بربط و رباب نغمہ کی شراب برسا رہے تھے۔ جعفر نے نشہ کی ترنگ میں عبدالملک سے کہا کہ جو خواہش کرو گے پوری ہو گی، عبدالملک نے تین خواہشیں پیش کیں۔

(۱) خلیفہ مجھ سے راضی ہو جائیں۔

(۲) میرے بیٹے ابراہیم کی شادی خلیفہ کی کسی بیٹی سے ہو جائے۔

(۳) ابراہیم کے اعزاز میں اضافہ کیا جائے۔

جعفر نے تینوں باتوں کی ہامی بھر لی ـــــ حاضرین محفل حیران تھے، اور ان کو خوف تھا کہ ممکن ہے خلیفہ کو یہ باتیں ناگوار گزریں، مگر جب جعفر نے عبدالملک کی خواہشیں، خلیفہ کے سامنے پیش کی ہیں تو وہ ہر خواہش پر "بہت مناسب" کہتا جاتا تھا۔

عین اس وقت جبکہ برامکہ کے اقبال کا چمن لہلہا رہا تھا خزاں کی دہشت ناک آندھیاں چلنے لگیں۔

برامکہ کا زوال

آل برامکہ، ابتدا ہی سے علویین کے حامی تھے، اور بنو عباس کی خلافت کے بعد بھی وہ اسی ٹوہ میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح علویین میں سے کوئی شخص وارث حکومت قرار پا جائے۔ اہل برامکہ کے اسی میلان نے، بنو عباس کو ان کی طرف سے بدظن کر دیا تھا، رشید کے دو بیٹے تھے امین اور مامون، جعفر ہمیشہ مامون کو امین پر ترجیح دیتا تھا، زبیدہ امین کی ماں تھی، اس کو جعفر سے عداوت ہو گئی، اور اس کی عداوت بڑی حد تک جعفر کے قتل اور خاندان برامکہ کی تباہی کا باعث ہوئی۔ زبیدہ اور ربیع کے خاندان کے لوگ، جعفر کی طرف سے رشید کے کان بھرتے تھے، یہاں تک کہ رشید کے دل میں بھی جعفر کی طرف سے بدظنی پیدا ہو گئی، تفصیلات میں جانے کی مجھ کو فرصت نہیں ہے، مختصر یہ ہے کہ بعض انقلابات کے باعث، رشید کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ جعفر، علویین کا طرفدار ہے، اور بنو عباس کی خلافت اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی رشید نے برامکہ کے گھرانے میں جاسوس بھی مقرر کر دیے تھے، جو معمولی معمولی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے، جن سے رشید کی بدگمانیوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ جعفر بھی ان حالات سے بے خبر نہ تھا، اور وہ بھی اپنے اثر و اقتدار کے بل بوتے پر بعض تند و تیز باتیں کہہ دیا کرتا تھا، جو جاسوسوں کی زبانی اور زیادہ تلخ و تیز صورت میں خلیفہ کے کانوں تک پہنچتی تھیں، آخر کار، زبیدہ کے مشورے سے رشید نے جعفر کے قتل کا ارادہ کر لیا۔ یحییٰ اور فضل کے مکان لوٹ لئے گئے، اور رشید کے غلام مسرور نے جعفر کو قتل کر دیا۔ اور اس طرح وہ خاندان جس کا عروج، آسمان کی بلندی کو شرماتا تھا، زوال کی موت مر گیا جعفر کے قتل کے بعد رشید ہمیشہ متاسف و ملول رہا، لیکن اس کا تاسف اور ملول جعفر کو زندہ نہ کر سکا،

انقلاب کی تاریخ کتنی دردناک ہے!

جذبات اثر

(از جناب خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی)

ہم سے اب بھی سمجھے جاتے ہیں بڑی مشکل سے ہم — اک معمہ بن گئے ہیں دستگاہ دل سے ہم

مجھ سے اظہار تمنا تجھ سے عرض ماجرا — بیوفا مجبور ہو جاتے ہیں اپنے دل سے ہم

جلوۂ بینا کہاں وہ جلوۂ رعنا کہاں — آنکھیں روشن کرتے ہیں گرد محمل سے ہم

جیب پارہ پارہ کی ترتیب اب ہے مشغلہ — دل کو یکسو کر چکے عشق جنوں منزل سے ہم

کس طرح سمجھے کوئی نیرنگ ہستی و عدم — تیری ہی محفل میں آ کے تیری ہی محفل سے ہم

اہل ہمت نے سفینہ نذر طوفاں کر دیا — اور بیٹھے کھیلتے ہیں موجۂ ساحل سے ہم

مدعا ہستی کا ٹھہرا ہستیٔ بے مدعا — کچھ نہ کچھ لے تو چلے اس کشت بے حاصل سے ہم

تھک کے بیٹھے۔ بیٹھ کر اٹھے۔ گرے۔ سنبھلے۔ بڑھے — کیا کہیں دیر تک رہے پہونچے ہیں کس مشکل سے ہم

تار تار جاں ہے لبریز نوائے آشنا
آشنا ہوں تو اثر ساز شکست دل سے ہم

(خاص سالنامہ کیلئے)

شراب دو آتشہ

(۱)

از حضرت حافظ غازی پوری

فطرت کو ہے تعلق جبتک مری نظر سے
ہے باخبر زمانہ اک حسن بیخبر سے

واقف سہی زمانہ حسن فسوں اثر سے
مجبوریاں ہیں دل کی معصومی نظر سے

احساس کی ہے شدت یا کیف آرزو ہے
بیخود سے ہم بھی کچھ ہیں وہ بھی ہیں بیخبر سے

دنیا کچھ اور سمجھے میں اور کچھ سمجھ لوں
پھر دیکھ لے کسی دن مجکو اسی نظر سے

پنہاں خموشیوں تک اسرار حسن فطرت
یہ بھی ہے خاص عالم ہم ہیں جو بیخبر سے

میں آئینہ پہ صدقے آئینہ اس پہ قربان
جسکو یہ دیکھتا ہے حافظ مری نظر سے

(۲)

از حضرت جگر مرادآبادی

عہد رنگیں کی یادگار ہوں میں
یعنی اپنا ہی سوگوار ہوں میں

ذرہ آستان یار ہوں میں
صدمہ دہر در کنار ہوں میں

آہ بیتاب انتظار ہوں میں
درد کی آخری پکار ہوں میں

اللہ اللہ نزاکتیں میری
اپنی ہستی پہ بھی تو بار ہوں میں

مجھکو رنگ خزاں سمجھ کے نہ دیکھ
مژدہ آمد بہار ہوں میں

اف جواں مرگیاں محبت کی
ہائے کس کس کا سوگوار ہوں میں

نکہت گل کا بھی دماغ نہیں
کتنا آزردہ بہار ہوں میں

میری ہستی کا واہ کیا کہنا
تیری ہستی کا پردہ دار ہوں میں

رشحاتِ عالیہ

(از لسان القوم مولانا صفی لکھنوی)

محض تخئیل نہ سمجھے اسے حاشا کوئی ۔۔۔ پھر نیا بھیس بدلنے کو ہے دنیا کوئی
انقلابات کے طوفان کا وہ جوش وخروش ۔۔۔ موجزن جیسے امڈتا ہوا دریا کوئی
رو میں ہر پیکرِ کم زور ہے یوں سرگرداں ۔۔۔ جیسے آغوش میں گرداب کے تنکا کوئی
صحنِ عالم میں ہر اک سمت ہے رقصِ بسمل ۔۔۔ دور سے دیکھ رہا ہے یہ تماشا کوئی
کس مپرسی کا وہ عالم کہ الٰہی توبہ ۔۔۔ دم بھی نکلے تو نہیں پوچھنے والا کوئی
ہر طرف گرم ہے ہنگامۂ نفسی نفسی ۔۔۔ کیا قیامت ہے کسی کی نہیں سنتا کوئی
دُور کیوں جاؤ ذرا اپنی ہی حالت دیکھو ۔۔۔ مست امروز کوئی سرخوشِ فردا کوئی
کل خدا جانے کہ محشر میں ہو کیا حشر اپنا ۔۔۔ ہم ہیں جب آج کسی کے نہ ہمارا کوئی
رنگ لائیگی بہرکیف یہ فاقہ مستی ۔۔۔ مست و مدہوش ہے بے ساغر و مینا کوئی

کیوں کریں شکوۂ بے مہریِ احباب صفیؔ
اب وہ دل ہی نہیں جس میں ہو تمنا کوئی

چاندی کے شمعدان

(ایک ایکٹ کا بہترین عبرتناک اخلاقی ڈرامہ)

(از جناب وسیم علوی بی اے (فائینل) گورکھپور)

افراد ڈرامہ

فلپ ——— ایک بڑا پادری

ولیم ——— ایک مجرم

پرسوم ——— فلپ کی بہن ۔ ایک بیوہ

میری ——— خادمہ

جیمس اور پولیس کے چند آدمی

[منظر ——— فلپ کے مکان کا باورچی خانہ بہت صاف ستھرا اور مزین ہے ۔ سامنے دو بہت خوبصورت چاندی کے شمعدان رکھے ہوئے ہیں]

(میری اور پرسوم چولھے کے سامنے بیٹھی ہوئی ہیں میری شوربا جلا رہی ہے اور پرسوم کپڑے سکھا رہی ہے)

پرسوم ——— کیوں میری! کیا شوربا ابھی تک نہیں اُبلا؟

میری ——— ابھی نہیں بیگم۔

پرسوم ——— ارے اب تک تو ہو جانا چاہئے ۔ شاید تو نے آگ ٹھیک نہیں جلائی ۔

میری ——— مگر بیگم! آگ تو آپ ہی نے سلگائی تھی ۔

پرسوم ——— خبردار پھر کبھی مجھے اس طرح کا جواب نہ دینا ۔ یہ بے تمیزی ہے

میری ——— اچھا بیگم!

پرسوم ——— تو پھر ملامت کرنے کی نوبت نہ آنے پائے ۔

میری ——— نہیں بیگم!

پرسوم ——— خدا جانے میرے بھائی اب تک کہاں رہ گئے (گھڑی کی طرف دیکھ کر) رات کے گیارہ بج گئے

اور ان کا پتہ نہیں میری!

میری — ہاں بیگم!

پرسوم — کیا بڑے پادری صاحب میرے متعلق کچھ کہہ گئے تھے؟

میری — نہیں بیگم!

پرسوم — اور کیا کچھ کہہ گئے تھے کہ کہاں جا رہے ہیں؟

میری — ہاں بیگم!

پرسوم — ہاں بیگم! (اس کی نقل کرتے ہوئے) پھر بتایا کیوں نہیں۔ بگلی!

میری — بیگم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں۔

پرسوم — لیکن یہ تو نہ بتانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ یا ہے؟

میری — بیگم صاحبہ نے آج ہی صبح کو تو بتایا کہ مجھے زبان نہ چلانی چاہئے۔ اس لئے میں نے سوچا.....

پرسوم — اونہہ! خاک سوچا تو نے۔

میری — ہاں بیگم!

پرسوم — مت رٹے جا طوطے کی طرح "ہاں بیگم! ہاں بیگم" احمق کہیں کی۔

میری — نہیں بیگم!

پرسوم — اچھا تو کیا کہہ گئے تھے کہاں جا رہے ہیں؟

میری — میری ماں کے یہاں بیگم!

پرسوم — تمھاری ماں کے یہاں!.... آخر کیوں؟

میری — بڑے پادری صاحب نے مجھ سے اس کی خیریت پوچھی تو میں نے کہا کہ اس کی حالت نازک ہے،

پرسوم — تو نے کہدیا کہ اس کی حالت نازک ہے — کیوں؟ — اور اسی لئے ہمارے بھائی اتنی رات گئے ابھی تک گھر نہیں لوٹے اور نہ کھانا کھایا۔ یہ ہے تیری احسانمندی۔ کیوں؟

میری — بیگم! شوربا ابل رہا ہے

پرسوم — تو باہر انڈیل دے نا۔ بیوقوف کہیں کی! اور بک بک مت کر [میری ایسا کرنا ہی چاہتی ہے] نہیں! نہیں! ویسے نہیں۔ ٹھہر۔ میں خود آکر انڈیلتی ہوں — اور ہاں وہ نمکدان تو نے میز پر رکھے — وہی چاندی والے۔

میری — کون وہ چاندی والے نمکدان بیگم!

پرسوم — ہاں وہی چاندی والے - کیا تو ان دنوں بہری بھی ہوگئی ہے ؟ بیوقوف کہیں کی۔
میری — بیگم! وہ تو بک گئے۔
پرسوم — بک گئے! (حیرت سے) تو پاگل ہوگئی ہے؟ کس نے انھیں بیچ ڈالا؟ کیوں وہ بیچے گئے؟
میری — بیگم! آج شام کو جب آپ باہر گئی ہوئی تھیں بڑے پادری صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ انھیں لیجاکر گیروس کے ہاتھ زیادہ سے زیادہ قیمت پر بیچ ڈالوں اس لئے کہ وہ ان کا بہت خواہشمند تھا
پرسوم — لیکن تجھے بغیر مجھ سے پوچھے ہوئے انھیں لیجانے کا کیا حق تھا؟
میری — (سہم کر) لیکن بیگم! مجھ سے بڑے پادری صاحب — نے تو کہا تھا
پرسوم — بڑے پادری صاحب! — ہونہہ — لیکن آخر انھیں روپیوں کی کیا ضرورت تھی؟
میری — معاف کیجیے بیگم! ہمارا خیال ہے — کہ — لوسی کو دینے کے لئے۔
پرسوم — ٹھیک! بیشک لوسی ہی کو دینے کے لئے - وہی ڈائن نا جو پہاڑی کی چوٹی پر رہتی ہے اور جو کہا کرتی ہے کہ میں بہت ضعیف ہوگئی ہوں اس لئے کام کاج نہیں کر سکتی لیکن اسے روپیوں کی کیا ضرورت تھی؟ — بتا؟
میری — بیگم! اسے مالگذاری ادا کرنی تھی۔ امین صاحب اب انتظار نہ کر سکتے تھے - وہ برابر دھمکیاں دیتے تھے کہ اگر لگان نہ چکایا تو آج تیری خیر نہیں - تجھے گھر سے باہر نکال دیں گے - اس لئے اس نے اپنی چھوٹی بچی جینی کو امداد کی غرض سے یہاں بھیجا تھا — اور —
پرسوم — آہ! — یہ خانہ بربادی - اب تو گھر میں کچھ بھی باقی نہ بچے گا - جائداد فروخت ہوئی - پس انداز کی ہوئی رقم بھی گئی - سارا فرنیچر بک گیا — اور سب کچھ — کیا اب ہم لوگ فاقہ کریں گے - اور آج ہمارے چاندی کے خوبصورت نمکدان بھی — (سسکیاں لیتے ہوئے) — یہ بیجا — سراسر بیجا ہے - (رونے لگتی ہے)
میری — بیگم! مجھے افسوس ہے - اگر مجھے علم ہوتا — تو —
پرسوم — تجھے افسوس ہے — کیوں؟ — اگر بڑے پادری صاحب خود ہی ان چاندی کے نمکدانوں کو بیچنا پسند کرتے ہیں تو وہ کریں — تو جا اور اپنے ہاتھ دھو کر آ - دیکھ کتنے میلے ہوگئے ہیں۔
میری — بہتر ہے بیگم! (چلی جاتی ہے)

[پادری صاحب - داخل ہوتے ہیں]

نسب — واہ یہاں کتنی گرمی ہے - اس شدت کی سردی میں باہر جاکر یہاں واپس آنے پر بہت آرام ملتا ہے

The Shahkar, Annual Number 1938.



جناب قربان وارث صاحب
ایڈیٹر مشرق گورکھپور



شاہکار کے نوجوان ادیب
جناب محمد وسیم صاحب گورکھپور

(پرسوم جلدی سے آگر اسے کوٹ اتارنے میں مدد دیتی ہے) شکریہ بہن پرسوم! (اس کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں کیا بات ہے؟ تم ابھی کیوں رو رہی تھیں؟ میری کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی؟ بولو۔

پرسوم ——— نہیں میری کی وجہ سے نہیں بلکہ ———

فلپ — ہاں! ہاں! کہو کیا بات ہے؟ (میری کو بلاکر) میری! تم اب گھر جاؤ۔ تمھاری ماں کی حالت اب پہلے سے اچھی ہے۔ میں نے اس کے لئے دعا کر دی ہے اور ڈاکٹر نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔ جاؤ! اب گھر جاؤ! (میری اپنا لبادہ پہن کر جانے لگتی ہے) اور ہاں! سنو میری اگر تمھاری ماں کی آنکھ لگ گئی ہو تو بہت خاموشی سے اندر قدم رکھنا۔

میری ——— بہتر ہے حضور! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ [وہ جانے کے لئے دروازہ کھولتی ہے اور باہر برف گر رہی ہے]

فلپ — سنو میری! ہمارا گلوبند لے لو۔ اس سے تمھیں گرمی پہنچے گی۔ آج رات بڑی سردی پڑ رہی ہے۔

میری ——— (شرما کر) نہیں حضور! ٹھیک ہے۔

پرسوم — کیا کرتے ہو بھائی؟ (غصہ سے) ارے وہ تو نوجوان ہے اس پر سردی کا کیا اثر ہوگا؟

فلپ — اوہ پرسوم! تم باہر کہاں گئی ہو۔ تم کیا جانو کتنی سخت سردی پڑ رہی ہے۔ آؤ میری میں گلوبند لپیٹ دوں۔ (لپیٹ دیتا ہے) اچھا اب جاؤ۔ جلدی جاؤ [میری چلی جاتی ہے]

پرسوم ——— بھائی! اب میں صبر نہیں کر سکتی۔ آئیے بیٹھئے! اور شوربا چکھئے۔ آپ کو آنے میں بڑی دیر ہو گئی۔ دیکھئے! شاید شوربا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔

فلپ — مگر یہ تو خوش ذائقہ معلوم ہوتا ہے۔

پرسوم ——— (غصہ سے) مجھے کامل یقین ہے کہ میری کی ماں اس قدر بیمار نہ ہوگی کہ آپ کو ایسی سرد رات میں وہاں ٹھہرنے کی ضرورت تھی۔ ہمارے خیال میں لوگ محض اس لئے بیمار بن جاتے ہیں کہ بڑے پادری کو تکلیف دیں پادری کے آرام کا انھیں کوئی خیال نہیں ہوتا۔

فلپ ——— یہ ان کی مہربانی ہے کہ وہ ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔

پرسوم ——— جی ہاں! مگر چراغ پہلے گھر میں جلایا جاتا ہے۔ صدقہ و خیرات کی ابتدا پہلے گھر ہی سے ہوتی ہے۔

فلپ ——— اچھا تو اسی لئے تم نے یہ شوربا میرے لئے تیار کیا ہے ——— تو میری بڑی اچھی بہن ہے۔

پرسوم ——— اچھی بہن! بیشک! آپ ہی بتائیے اگر میں نہ ہوں تو کون آپ کے آرام کا خیال کرے گا۔ مگر مجھے آپ کی ایک بات بہت ناپسند ہے کہ آپ اپنی ہر چیز کو دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کو دیدیتے ہیں۔ یہ دریا دلی رہی تو ہم گھر میں کچھ باقی نہ رہے گا۔

فلپ ۔ بہن! یہ دنیا دارالمحن ہے ۔ اس میں ہر چہار طرف آلام و تکالیف ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا کے کچھ لوگوں کی تو تکلیف دور کر سکوں ۔

پرسوم ۔ تکلیف ۔ ہاں! لیکن آپ ان صدمات کو خاطر میں نہیں لاتے جو مجھے ...... (جس کو آپ سے سب سے زیادہ محبت ہے) ...... پہنچتے ہیں ۔

فلپ ۔ (اٹھتے ہوئے) کیوں بہن! کیا میری ذات سے تمھیں کوئی صدمہ پہنچا ۔ اچھا مجھے یاد آیا تو تم اسی لئے رو رہی تھیں ۔ آخر میرا کیا قصور ہے؟ میں تمھارے جذبات کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا ۔ مجھے بیحد افسوس ہے ۔

پرسوم ۔ آپ کو افسوس ہے؟ ۔ ہونھ! ۔ خیر اپنا شوربا پیجئے ۔ دیکھئے! ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے ۔

فلپ ۔ (بیٹھ جاتا ہے) مگر بہن! بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟

پرسوم ۔ کیا آپ ابھی بچہ ہی ہیں ۔ مجھے تو اب آپ پر کم اعتبار ہونے لگا ۔ جیونہی میں یہاں سے باہر گئی کہ آپ نے وہ چاندی کے نمکدان تیری کے ہاتھوں فروخت کرا ڈالے ۔

فلپ ۔ اچھا تو وہ نمکدان! بس اتنی سی بات ہے ۔ کیا تمھیں ان پر بڑا ناز تھا؟

پرسوم ۔ ناز! بیشک! کئی سال سے وہ ہمارے خاندان میں ہوتا چلا آیا ہے ۔

فلپ ۔ بہن مجھے افسوس ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھے ...... مگر ... نمک تو چینی کی بھی کسی پیالی میں رکھ سکتے ہیں ۔

پرسوم ۔ (طنز سے) جی ہاں! آپ کو ۔ کی مالگذاری چکانی بھی تو ضروری تھی ورنہ ۔ اسے گھر سے باہر نکال دیتے

فلپ ۔ ہاں بہن! بات تو یہی ہے ۔ اور تم جانتی ہو کہ میرے پاس روپے بھی نہ تھے ۔ اس لئے انھیں بیچنے کی ضرورت پڑی ۔ اتفاق سے وہ اس وقت میرے پاس تھے ۔ کیوں ہے نا؟ (مسکراتے ہوئے) لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمھیں اس کا صدمہ پہنچا ۔

پرسوم ۔ جی ہاں! اب آپ کا اعتبار ہی کیا ۔ دوسری دفعہ آپ یہ چاندی کے شمعدان بھی بیچ ڈالیں گے ۔

فلپ ۔ نہیں نہیں بہن! میں ان کو نہیں بیچوں گا ۔

پرسوم ۔ آخر کیوں؟ (طنز سے) ان کو بیچ کر کسی دوسرے کی مالگذاری ادا کر دیجئے گا ۔

فلپ ۔ ہاں بہن! تمھارا خیال تو ٹھیک ہے لیکن میں انھیں بیچنا نہیں چاہتا ۔ تمھیں یاد نہیں ...... جب تم پیدا ہو چکی تھیں ...... تو ماں نے مرتے وقت یہ شمعدان ہمیں دیئے تھے کہ میری یادگار ہیں انھیں اپنے پاس رکھنا ۔ اس لئے میں انھیں اپنے پاس رکھونگا ۔ اور کبھی بھی فروخت نہ کرونگا ۔

پرسوم ۔ (درد آمیز لہجہ میں) بھائی! میرا دل بے قابو ہوا جا رہا ہے ۔ مجھے معاف کیجئے اور دعائیں دیجئے ۔ اب میں سونے جا رہی ہوں ۔

[فلپ اسے دعائیں دیتا ہے اور پرسوم نعمت خانہ میں تالا بند کر کے جانے لگتی ہے]

پرسوم ۔ بھائی اب زیادہ رات تک نہ جاگئے ۔ آنکھوں پر زور پڑیگا۔

فلپ ۔ نہیں بہن! تم سونے جاؤ۔ خدا حافظ! (پرسوم اپنے بستر پر چلی جاتی)

فلپ ۔ [میز کے پاس آ کر بیٹھتا ہے اور ایک کتاب کھولتا ہے ۔ پھر ان شمعدانوں پر نگاہ ڈالتا ہے] پرسوم کیسی اچھی ہے۔ کہتی تھی "ان کو بیچ کر کسی دوسرے کی مالگذاری ادا کر دیجئے"۔

[فلپ لیمپ کو جلاتا ہے ۔ کچھ کتابوں اور رسالوں کو ترتیب دیتا ہے ۔ پھر بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے لگتا ہے ۔ گھڑی پر نگاہ جاتی ہے ۔ ٹھیک بارہ بجتے ہیں ۔ مجرم ولیم دروازہ سے دبے پاؤں داخل ہوتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو ہے اور وہ آتے ہی فلپ کی گردن پیچھے سے پکڑ لیتا ہے]

ولیم ۔ اگر ذرا بھی شور مچایا تو یہ چاقو تمھارے سینے کے پار ہوگا۔

فلپ ۔ لیکن میرے دوست! تم دیکھتے ہو کہ میں پڑھ رہا ہوں..... میں بھلا کیوں شور مچاؤں گا.... کیا میں تمھاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟

ولیم ۔ (ترشروئی سے) مجھے کھانا چاہئے ۔ آج فاقہ کرتے مجھے تین روز ہو گئے اور کچھ بھی کھانے کو نہ ملا ۔ لاؤ مجھے جلد کھانے کو دو ۔ اٹھو ۔ فوراً کھانا لاؤ ۔

فلپ ۔ (نرم لہجہ میں) اچھا بیٹا آرام سے بیٹھو ۔ میں ابھی تمھیں کھانے کو دیتا ہوں ۔ ذرا میں اپنی بہن سے نعمت خانہ کی کنجی لے لوں ۔ (اٹھتا ہے)

ولیم ۔ بیٹھو! (فلپ مسکراتا ہوا بیٹھ جاتا ہے) یہ سب کچھ نہیں ۔ میں ان چکموں میں آنے کا نہیں ہوں ۔ تم اپنی بہن سے کنجی مانگنے جا رہے ہو ۔ کیوں؟ ۔ اچھی ترکیب سوچی کہ اس طرح سے لوگوں کو جگا دوگے ۔ آؤ بتاؤ کھانا کہاں رکھا ہے؟ مجھے کنجیوں کی کوئی ضرورت نہیں ۔ مارے بھوک کے میرا برا حال ہے ۔ جلدی اٹھو بتاؤ کھانا کہاں ہے؟

فلپ ۔ (اپنے دل میں) ۔ [پرسوم نے آخر نعمت خانہ میں تالا کیوں بند کر دیا] آؤ دوست! کوئی خوف کی بات نہیں ۔ یہاں پر صرف ہماری بہن اور ہم رہتے ہیں ۔

ولیم ۔ میں یہ کیسے مان لوں؟

فلپ ۔ کیوں! میں نے تمہیں بتایا نہیں!.... (ولیم ۔ فلپ کو بغور دیکھتا رہتا ہے)

ولیم ۔ خیر میں اسے باور کئے لیتا ہوں ۔ (فلپ دروازہ کے پاس جاتا ہے) ۔ لیکن یاد رکھو اگر تم نے میرے ساتھ دغا کی تو یہ چاقو تمھارے سینہ میں پیوست ہوگا ۔ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ۔

فلپ ۔ نہیں بیٹا! ایسا کرنے سے تمھاری روح خسارہ میں رہے گی ۔ وہ روح جس کی قیمت ضمیر سے بڑھ کر ہے ۔ (دروازہ پر آ کر آواز دیتا ہے) ۔ پرسوم! پرسوم! [ولیم ۔ فلپ کے پیچھے ہاتھ میں چاقو لئے ہوئے بالکل تیار کھڑا ہے ۔]

پرسوم — (اندر سے) — ہاں بھائی!

فلپ — یہاں ایک غریب مسافر ہے جو بہت بھوکا ہے۔ ذرا آؤ نعمت خانہ کھول دو اور میں اسے کچھ کھانے کو دیدوں۔

پرسوم — (اندر سے) — کیوں! اتنی رات گئے؟ — یہ طولِ عمل ہے۔ کیا اب ہم لوگ رات کو بھی نہ سو سکیں گے۔ آخر کوئی ہر ایک کی کہاں تک سنے۔

فلپ — لیکن پرسوم! مسافر بہت بھوکا ہے۔

پرسوم — اچھا بھائی۔ لو میں آ رہی ہوں۔ (پرسوم داخل ہوتی ہے اور ولیم کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتی ہے) بھائی! وہ چاقو ہاتھ میں کیوں لئے ہوئے ہے؟

فلپ — وہ چاقو! — اچھا — شاید بہن! اس نے سمجھ لیا ہو کہ ہم لوگوں کے پاس چاقو نہ ہو (مسکراتا ہے)

پرسوم — بھائی! مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔ وہ مجھے اس طرح گھور رہا ہے جیسے کوئی جنگلی جانور۔ (اسے ذرا دور ہٹاؤ)

ولیم — جلد بتاؤ کھانا کہاں رکھا ہے۔ لاؤ مجھے فوراً کھانے کو دو ورنہ یہ چاقو تم دونوں کے سینوں میں پیوست ہو گا۔

فلپ — پرسوم! لاؤ مجھے کنجیاں دو (وہ کنجیاں دیدیتی ہے) ۔ اچھا بہن اب تم جاؤ آرام کرو۔ [پرسوم جانے لگتی ہے کہ ولیم لپک کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے]

ولیم — ٹھہرو! تم دونوں میں سے کوئی بھی کمرے کو نہیں چھوڑ سکتے جب تک کہ میں یہاں سے نہ چلا جاؤں۔ [پرسوم فلپ کو بغور دیکھنے لگتی ہے]

فلپ — پرسوم! کیا تم اس نوجوان کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو گی۔ شاید اس کی یہی خواہش ہے۔

پرسوم — بہتر ہے بھائی۔ [میز کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور دونوں کو دیکھنے لگتی ہے]

فلپ — یہ لو کچھ گوشت روٹی اور ایک بوتل شراب حاضر ہے۔

ولیم — میز پر رکھو اور پیچھے کھڑے رہو تاکہ میں تمھیں دیکھتا رہوں۔ [فلپ ایسا ہی کرتا ہے اور میز کی دراز میں سے چھری کانٹا نکال کر ولیم کے ہاتھ میں لئے ہوئے چاقو کو دیکھنے لگتا ہے]

ولیم — کوئی ضرورت نہیں۔ میرا چاقو تیز ہے۔ (اپنی انگلیوں سے کھولنے لگتا ہے) اور ہاں — یہ چمچے اور کانٹے (ہاتھ میں لے کر) ۔ ہا! ہا! ہا! —
چھری — (انھیں پھینک دیتا ہے) — لیکن جیل میں تو ہم لوگ چھری کانٹا استعمال نہیں کرتے۔ پرسوم۔ جیل؟

ولیم — [روٹی کی ایک بڑی قاش کاٹتے ہوئے جیسے وہ جانوروں کی طرح انگلیاں ڈال کر کھینچتا ہے۔ اور دروازہ پر نگاہ ڈال کر کہتا ہے] اوہ ہاں! تم نے دروازہ کو کیوں کھلا ہوا چھوڑ دیا۔ اس کے پٹ کیوں نہ بند کئے۔ اس لئے تاکہ کوئی اندر آ جائے۔ (اٹھ کر دروازہ بند کرتا ہے)

فلپ — ہاں! اسی لئے اسے کھلا ہوا چھوڑ دیا تھا۔
ولیم — مگر اب تو میں نے انھیں بند کر دیا۔
فلپ — (ٹھنڈی سانس لے کر) تیس سال کے عرصہ میں آج یہ پہلا اتفاق ہے ... [ولیم جلدی جلدی کھاتا ہے اور اور ایک ہڈی فرش پر پھینک دیتا ہے]
پرسوم — اوہ! میرا صاف ستھرا عمدہ فرش — [فلپ اس ہڈی کو اٹھا کر طشتری میں رکھ دیتا ہے]
ولیم — کیوں تمھیں چوروں کا کوئی خطرہ نہیں ہے؟ — فلپ — ذرا بھی نہیں!
ولیم — ذرا بھی نہیں! — ہا! ہا! ہا! (بوتل سے انڈیل کر ایک جام پیتا ہے) — خوب! تمھیں ذرا بھی خطرہ نہیں — ہا! ہا! ہا! (پھر ایک جام پیتا ہے اور ایک بیک پوچھ اٹھتا ہے) — اور ہاں! تم ہو کون؟
فلپ — میں ایک بڑا پادری ہوں۔
ولیم — ہا! ہا! ہا! بڑا پادری! — ماشاءاللہ تم بڑے پادری ہو! — خیر — میں تو گمراہ ہی ہوں! (حسرت سے)
فلپ — نہیں بیٹا! میں تمھیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرونگا۔ پرسوم! اب تمھیں اجازت ہے۔ تم جا کر آرام کر سکتی ہو۔
پرسوم — تو کیا میں آپ کو تنہا چھوڑ کر چلی جاؤں؟ —
فلپ — ہاں تم جاؤ۔ میں اپنے دوست سے ذرا تخلیہ میں آزادی کے ساتھ گفتگو کرونگا [اس عرصہ میں شراب فاقہ کش ولیم پر کافی اثر کر چکی ہے]
ولیم — کیا بات ہے؟ جاؤ۔ ہاں ہاں تم جاؤ شب بخیر! میں بھی ذرا پادری صاحب سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں — پادری صاحب! — ہا! ہا! (ایک جام اور پی کر خوب ہنستا ہے اور کھانستا ہے)
فلپ — شب بخیر! پرسوم — (پرسوم چلی جاتی ہے)
ولیم — بڑا پادری! — ہا! ہا! — اچھا تو — (پھر یک بیک چلا اٹھتا ہے) — تم جانتے ہو میں کون ہوں؟
فلپ — تم زمانہ کے ستائے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔
ولیم — ستایا ہوا! (ٹھنڈی سانس لیکر) — ہاں! ہاں! (پھر تھوڑی سی شراب پیتا ہے) لیکن اس کو تو ایک عرصہ گذر گیا۔ (ہنستا ہے) یہ جب کی بات ہے جب میں انسان تھا اور اب میں انسان نہیں ہوں بلکہ ایک عدد ۲،۵۱
— اور میں دس برس جہنم میں رہا ہوں۔
فلپ — کیا کہا جہنم! — بتاؤ بتاؤ مجھے اس جہنم کے متعلق بتاؤ۔
ولیم (شبہ کرتے ہوئے) — کیوں؟ کیا تم مجھے پولیس کے حوالہ کرنا چاہتے ہو۔

فلپ — نہیں! میں پولیس کو اطلاع نہیں دونگا۔

ولیم — (مشتاق نگاہوں سے اسکو دیکھتا ہے اور سر کھجاتے ہوئے بولتا ہے) میں تمھاری بات کا یقین کرتا ہوں لیکن آخر تم کو—

فلپ — (اپنا ہاتھ ولیم کے بازو پر رکھ کر) اسے تسکین دیتے ہوئے بتاؤ اس وقت سے پیشتر جبکہ تم..... جہنم .....

ولیم — مجھے یاد نہیں۔ ایک عرصہ گذر گیا — ہاں میرے کبھی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور شام کیوقت جب سورج کی آخری سنہری کرنیں اس پر پڑتیں تو بھلا معلوم ہوتا — اور وہاں ایک عورت تھی (کچھ سوچنے لگتا ہے) وہ — ہاں ہاں مجھے یاد آیا — وہ میری بیوی تھی۔ (پھر کچھ سوچنے لگتا ہے اور دفعتاً بول اٹھتا ہے۔) وہ بہت بیمار تھی اور ہمارے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا۔ مجھے کہیں بھی کوئی کام نہ ملا۔ وہ سال بہت منحوس تھا اور میری بیوی جینی بہت بیمار تھی۔ وہ فاقہ کشی سے مر رہی تھی — اس لئے میں نے چوری کی تاکہ اس کے لئے کچھ کھانے کو خرید لاؤں (اتنا کہکر وہ رک جاتا ہے اور فلپ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا ہے اور وہ پھر بولتا ہے) ہاں تو انھوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے ان سے لاکھ کہا کہ میں چور نہیں ہوں بلکہ میں نے اس لئے چوری کی ہے کہ میری بیوی قریب المرگ ہے۔ آج کئی دن ہوگئے کہ اس کے منھ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا۔ لیکن وہ لوگ ہماری باتوں پر ہنستے اور بالآخر مجھے دس سال سخت قید کی سزا ملی (ذرا ٹھہر کر) — کامل دس سال جہنم میں — اور اسی رات کو جبکہ مجھے سزا ملی تھی داروغہ جیل نے مجھے اطلاع دی کہ میری عزیز بیوی جینی مرگئی — (آنکھیں اشک آلودہ ہو جاتی ہیں اور وہ خشم آمیز سسکیاں بھرنے لگتا ہے) الٰہی! ان پر تیری لعنت ہو۔ تیرا قہر نازل ہو۔

فلپ — اچھا اب جیل خانہ (جہنم) کے متعلق تو بتاؤ۔

ولیم — سنئے! میں کبھی انسان تھا لیکن اب میں جانور ہوں۔ اور مجھے انھیں لوگوں نے جانور بنا دیا ہے۔ انھوں نے مجھے ایک جنگلی جانور کی طرح — ایک خونخوار کتے کی طرح — مقید کر دیا وہ مجھے غلیظ کھانے کو دیتے اور میں چیتھڑوں سے اپنا تن ڈھانکتا۔ لکڑی کے تختے پر مجھے سونا پڑتا جس کا میں شاکی رہتا۔ تب — انھوں نے مجھے پھر — دس سال کی — اوخدا! ان ظالموں نے میرا نام ڈبو دیا۔ میری طرح — میری ایمانی قوت کو ضائع کر دیا اور اس کے بدلہ میں مجھے شیطانی وسوسوں کا شکار بنا دیا۔ لیکن ایک روز جب لوگ بے خبر تھے — یعنی مجھ جنگلی جانور کو کتوں کی طرح باندھنا بھول گئے تھے — میں آزادی پاکر بھاگ نکلا۔ کل چھ ہفتے گذرے تھے — اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی تھی۔

فلپ — فاقہ کشی کی نوبت؟

ولیم — ہاں فاقہ کشی! جبتک جہنم میں رہو کھانے کو بھی ملتا ہے اور جب وہاں سے فرار ہو جاؤ تو فاقہ کرنا پڑتا ہے — اور وہ لوگ میرے تعاقب میں تھے اور میرے پاس باہر بھاگنے کے لئے نہ تو کوئی پاسپورٹ تھا اور نہ میں اپنا نام ظاہر کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے پھر چوری کی — ان کپڑوں کو جنھیں میں پہنے ہوئے ہوں چرایا۔ پیٹ بھرنے کے لئے

ہر روز کھانا چراتا اور رات میں کہیں کسی جگہ جنگل بیابان میں سو رہتا۔ مجھے کہیں کام مانگنے کی جرأت نہ ہوتی اور نہ میں کسی شہر یا قصبہ جا کر بھیک مانگ سکتا تھا۔ اس لئے میں برابر چوری کرتا رہا اور انھیں لوگوں کی وجہ سے میں نے یہ چوری کی عادت سیکھی۔ الٰہی! تو انھیں غارت کر دے (شراب کی بوتل ختم کرکے آتشدان میں ڈال دیتا ہے)

فلپ — بیٹا! تم نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ لیکن اب بہت کچھ امیدیں ہیں۔

ولیم — امید! امید! ہا! ہا! (خوب ہنستا ہے)

فلپ — اچھا بیٹا تم دور سے آئے ہو بہت تھک گئے ہوگے۔ آؤ تمھارے لئے وہاں بستر بچھا ہوا ہے آرام کرو۔ میں تمھارے لئے کچھ اوڑھنے کو لاتا ہوں۔

ولیم — اور اگر کوئی آجائے ؟

فلپ — کوئی نہیں آئے گا۔ اطمینان رکھو بیٹا۔ اور فرض کرو اگر کوئی آبھی گیا تو کیا تم ہمارے دوست نہیں ہو؟

ولیم — تمھارے دوست؟ (استعجاب اور سراسیمگی کی حالت میں)

فلپ — ہاں بڑے پادری کے دوست کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

ولیم — پادری کے دوست؟ (حیرت سے سر کھجاتے ہوئے)

فلپ — ہاں میں تمھارے اوڑھنے کے لئے لاتا ہوں (چلا جاتا ہے)

ولیم — [ولیم اٹھ کر آتشدان کے پاس جاتا ہے اور وہاں رکھے ہوئے چاندی کے شمعدان کو بغور دیکھتا ہے اور چاروں طرف نگاہ ڈال کر اپنے کو تن تنہا پا کر انھیں ہاتھ میں لے کر وزن کرتا ہے] —— واللہ! یہ تو چاندی کے ہیں اور کتنے وزنی ہیں۔ بہت خوب! (وہ فلپ کے آتے ہوئے پیروں کی چاپ سنتا ہے اور جلدی میں ایک شمعدان اس کے ہاتھ سے گر جاتا ہے) [فلپ داخل ہوتا ہے اور یہ سب دیکھتا ہوا نظر انداز کرتا ہے اور ہاتھ میں لئے ہوئے کمبل لیجا کر اس کے بستر پر رکھ دیتا ہے]

فلپ — کیوں تم میرے شمعدان کی تعریف کر رہے تھے! مجھے ان پر ناز ہے۔ انھیں میری ماں نے مجھے تحفتاً دئے تھے۔ اس چھوٹی سی جھونپڑی میں غالباً وہ بھلے معلوم ہوتے ہیں اور اکثر مجھے اپنی والدہ مرحومہ کی یاد دلاتے ہیں۔ اچھا آؤ! اب تمھارے لئے بستر تیار ہے۔ آرام کرو۔

ولیم — ہاں! ہاں! اب میں آرام کرونگا۔ مگر یہ تو بتاؤ آخر تم مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہو۔ (کچھ شبہ کرتے ہوئے) تم کیا چاہتے ہو؟

فلپ — میرے دوست! میں یہی چاہتا ہوں کہ تم آرام سے سو رہو۔

ولیم — اچھا تو شاید تم میری اصلاح کرنی چاہتے ہو۔ ہشو میرے دماغی —— (روحانی) —— تاثرات کو نہ بدلو۔ سنو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں مذہب پر لات مارتا ہوں۔ مجھے گرجا کی کوئی ضرورت نہیں —— مجھے گرجا سے

نفرت ہے۔

فلپ — نہیں بیٹا! ایسا کیوں کہتے ہو — گرجا کو تو تم سے نفرت نہیں۔

ولیم — تو تم میری اصلاح کرنے کی کوشش کررہے ہو۔ ہا! ہا! ہا! ہا! — اچھا خیال ہے! (تمسخر کے ساتھ ہنستا ہے) بڑے پادری صاحب! مجھے تمہارے مذہب کی کوئی ضرورت نہیں — عیسائیت! — امید مستقبل! — ہونھ! میرے حق میں تمہارے لئے کچھ کرنا بے سود ہے۔ سمجھے؟

فلپ — نہیں بیٹا! تم خدا کو پہچانو۔ میں تمہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرونگا۔

ولیم — (غصہ سے) ہٹو۔ مجھے تمہاری — تمہارے مذہب — کی کوئی ضرورت نہیں۔

فلپ — اچھا تم اب آرام کرو۔ رات کافی گذر گئی۔

ولیم — بہتر ہے لیکن میں نصیحتیں سننا نہیں چاہتا۔ (بستر پر لیٹتے ہوئے) — تمہیں یقین ہے نا کہ کوئی نہیں آئے گا؟

فلپ — ہاں! ہاں! اب کوئی نہیں آئے گا — اور فرض کرو اگر کوئی آیا بھی تو تم نے دروازہ میں تالا بند کرہی دیا ہے۔

ولیم — خوب! مجھے اس کے محفوظ ہونے میں شبہ ہے۔ (دروازہ کے قریب جاتا ہے اور تالے کو کھینچ کر خوب دیکھتا ہے پھر واپس آکر بستر پر لیٹ رہتا ہے اور فلپ کو مخاطب کرکے کہتا ہے) اب تم جاؤ (فلپ کو کمبل پیش کرتے ہوئے دیکھ کر) میں کمبل اوڑھ کر سو رہونگا۔ جاؤ جاؤ!

فلپ — اچھا بیٹا — شب بخیر! (فلپ چلا جاتا ہے)

ولیم — [فلپ کے چلے جانے پر ولیم اٹھ کر اس کے دروازہ کو آزماتا ہے] — اچھا اس میں تالا نہیں بند ہے (چاروں طرف نگاہ ڈال کر چاندی کے شمعدان پھر ہاتھ میں لے کر بغور دیکھتا ہے) ارے! ان کی قیمت تو کئی سو روپئے ہوگی۔ اگر میں انھیں بیچ ڈالوں گا تو بہت روپئے — مگر — (اپنے ضمیر سے) وہ بڈھا بھی تو ان کا بڑا اشائق ہے۔ ابھی کہہ رہا تھا کہ اس کی ماں نے مرتے وقت اسے دئے تھے — (دماغی کشمکش کی حالت میں)۔ انھیں اس کی ماں نے — ہاں! — لیکن انھوں نے میری ماں کا بھی تو کوئی خیال نہیں کیا جب مجھے جہنم (جیل خانہ) میں بھیج دیا تھا — لیکن وہ تو میرے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آیا — خیر! — پادری عام طور پر بامروت ہوتے ہی ہیں — کوئی نئی بات نہیں — (اپنے ضمیر سے) اے دل! میں دیکھتا ہوں کہ تو اب مجھے نرم ہو چلا ہے — ہمت کر — نیکی! — خدا — نہیں! نہیں! میں ان شمعدانوں کو لے کر ضرور آج ہی رات کو چلدونگا۔ اگر میں یہاں صبح تک ٹھہرا تو وہ نصیحتیں کرکے ہمارے قلب کو موم بنالے گا — گولی مارو اس کو اور اس کی نصیحتوں کو — یہ لو میں اب چلا —

[وہ شمعدان اٹھا کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیتا ہے اور خاموشی کے ساتھ باہر کے بائیں دروازہ سے بھاگ جاتا ہے

[لیکن جیونہی وہ نکلتا ہے دروازے کے زور سے بند ہونے کی آواز پیدا ہوتی ہے اور پرسوم جاگ جاتی ہے]

پرسوم — کون ہے؟ کون ہے؟ کیا آج رات کو میں سو نہ سکوں گی۔ آخر یہ کون؟ (دالانِ دروازہ سے داخل ہوتی ہے) ہیں! ابھی تو میں نے دروازہ کے بند ہونے کی آواز سنی ہے اور یہاں کوئی بھی نہیں۔ (فلپ کے دروازہ پر کھٹکھٹاتی ہے اور فوراً دیکھتی ہے کہ شمعدان غائب ہیں) — شمعدان! شمعدان چوری ہو گئے۔ بھائی! بھائی دیکھو۔ دوڑو۔ چوری ہو گئی چور! — چور! (فلپ داخل ہوتا ہے)

فلپ — کیا ہے — آخر کیا بات ہے؟

پرسوم — وہ بھاگ گیا! — وہی جو بھوک کے مارے مرا جا رہا تھا چلدیا اور اپنے ساتھ وہ شمعدان بھی لے گیا۔

فلپ — نہیں بہن! کیا دراصل میرے چاندی کے شمعدان — (انھیں غائب پاکر افسوس کرتا ہے) — یہ بڑا تکلیف دہ صدمہ ہے۔ کاش وہ انھیں چھوڑ گیا ہوتا — وہی میری ساری کائنات تھی —

پرسوم — مگر۔ جلدی جاؤ پولیس کو تو اطلاع دو۔ ابھی تو وہ دور بھی نہ گیا ہوگا۔ پولیس اسے جلد گرفتار کر لے گی۔ اور پھر وہ شمعدان ہمیں واپس مل جائیں گے۔ تمھیں یہ زیبا نہ تھا — کہ ان شمعدانوں کو وہیں ایک ایسے آدمی پر اعتبار کر کے چھوڑ دیا۔

فلپ — تم ٹھیک کہتی ہو بہن — یہ میری ہی غلطی تھی جو میں نے اس پر اعتماد کیا۔

پرسوم — "اعتماد کیا!" — خوب! ارے وہ تو صورت ہی سے چور معلوم ہوتا تھا۔ بے ایمان! چور کہیں کا۔ میں تو اسے دیکھتے ہی جان گئی تھی۔ جب — اچھا جلد جاؤ اور پولیس کو اطلاع دو ورنہ میں خود جاتی ہوں۔ (خود جانے لگتی ہے مگر فلپ اسے روکتا ہے)

فلپ — (نہایت نرمی سے) آخر کیا فائدہ؟ کیا اسے پھر جیل خانہ — جہنم — بھیج دوں۔ نہیں بہن پرسوم! یہی میری سزا ہے۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے سب چیزیں یونہی چھوڑ رکھی تھیں — بیشک میں سزا کا مستحق ہوں لیکن خدایا! یہ میرے لئے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ (اپنے چہرہ کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیتا ہے)

پرسوم — نہیں بھائی! تم غلطی کر رہے ہو۔ اگر تم پولیس کو اطلاع دینے نہ جاؤ گے تو میں خود جاؤں گی۔ میں اس گھر کو اس طرح لٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ تم — میرے بھائی — ایک بڑے پادری ہو — سارے فرانس میں تم سے بہتر اور رحمدل کوئی آدمی نہیں۔ لیکن بھائی! یہ تمھاری غلطی ہے کہ تم پولیس کو .... — میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمھاری نیکی سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ میں ضرور جاکر پولیس کو اطلاع دوں گی (جانے لگتی ہے)

فلپ — ٹھہرو پرسوم! وہ شمعدان میرے تھے اور اب اس کے ہیں۔ یہی بہتر ہے۔ اس کو ان شمعدانوں کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ میری والدہ اگر زندہ ہوتیں تو وہ بھی یہی پسند کرتیں —

پرسوم ۔ لیکن ــــــ [دروازہ پر کوئی کھٹکھٹاتا ہے]
جیمس ۔ (باہر سے) ــ اعلیٰ حضرت! ہمیں آپ سے کچھ کام ہے ۔ کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟
فلپ ــ ہاں! ہاں! بیٹا آؤ ۔ (جیمس اور اس کے ساتھ تین پولیس کے سپاہی ولیم کو گرفتار کئے ہوئے، داخل ہوتے ہیں، اور جیمس ان شمعدانوں کو فلپ کے سامنے لیجاتا ہے)
پرسوم ــ اچھا تو اس مردود کو تم لوگوں نے گرفتار کر لیا ۔
جیمس ــ ہاں بیگم صاحبہ ہم لوگوں نے اس بدمعاش کو سڑک کے کنارے کنارے تیز بھاگتے ہوئے دیکھا ۔ اور جب اس نے اپنے متعلق کچھ بھی نہ بتایا تو اسے شبہ پر گرفتار کر لیا طاقتور ہے ہی پھر تو یہ ہم سے لڑنے لگا اور جب ہم اسے پکڑنے لگے تو یہ شمعدان اس کی جیب سے گر پڑے ۔ [پرسوم انھیں لیجا کر صاف کر کے میز پر رکھتی ہے] ہمیں اعلیٰ حضرت کے شمعدان یاد پڑے اس لئے ہم اس کو گرفتار کر کے آپ کے پاس لائے ہیں کہ اگر یہ شمعدان آپ والے ہوں تو انھیں آپ رکھ لیں اور ہم اس بدمعاش کو قید خانہ میں بند کر دیں ــ (فلپ اور ولیم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں)
فلپ ۔ لیکن ــ یہ تو ہمارے بڑے اچھے دوست ہیں ۔
جیمس ــ آپ کے دوست! مقدس بزرگ! میں ۔۔۔
فلپ ــ ہاں! میرے دوست! آج شب میں ہمارے ساتھ کھانا کھا کر انھوں نے ہم کو شرف بخشا اور میں نے ان کو یہ شمعدان دیئے ہیں ــ
جیمس ــ اچھا مقدس بزرگ! آپ نے یہ شمعدان انھیں دیئے ہیں ــ (حیرت سے)
فلپ ــ ہاں! بیٹا ــــ جیمس ــ (سلام کر کے) تو ہم معافی چاہتے ہیں ۔ اعلیٰ حضرت!
فلپ ــ اور تم اپنے قیدی ــ ہمارے دوست ــ کو اب چھوڑ دو ۔
جیمس ــ لیکن اس نے نہ تو ہمیں کوئی کاغذ دکھایا اور نہ یہی بتایا کہ خود ہے کون؟ ــ
فلپ ــ مگر میں نے تو تمھیں بتایا کہ یہ ہمارے دوست ہیں ۔ جیمس ــ ہاں یہ تو ٹھیک ہے ۔ لیکن ــ
فلپ ــ یہ تمھارے بڑے پادری کے دوست ہیں ۔ بس یہی کافی ہے ۔ جیمس ــ ہاں ــ لیکن ــ
فلپ ــ لیکن کیا؟ ــ [کچھ دیر سکوت رہتا ہے ۔ جیمس اور فلپ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں]
جیمس ــ میں ..... ذرا .... خیر! (اپنے آدمیوں سے) قیدی کو چھوڑ دو ۔ (پولیس کے آدمی اسے چھوڑ دیتے ہیں) چلو! ــ (جیمس معہ ان پولیس کے آدمیوں کے چلا جاتا ہے) {بڑی دیر تک خاموشی رہتی ہے}
ولیم ــ (بڑے دھیرے سے جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو) تو آپ نے ان سے کہہ دیا کہ یہ شمعدان آپ نے مجھے دیئے ہیں خدایا!

پرسوم — (سینہ سے شمعدان کو لگائے ہوئے اور غصہ سے کانپتی ہوئی) — نمک حرام! تم رات یہاں آئے - یہیں کھانا کھایا اور — پھر یہیں چوری کی - جس نے تمہارے ساتھ بھلائی کی تم نے اس کا یہی بدلہ دیا - احسان فراموش کہیں کا!

فلپ — پرسوم! تم اپنے حدود سے بڑھ گئی ہو - جاؤ - اپنے کمرہ میں جاؤ۔

پرسوم — (دادا) آپ کو پھر تنہا چھوڑ کر چلی جاؤں - کیا اس لئے کہ اس دفعہ تو اس نے چوری ہی کی تھی اس بار آپ کو مار ہی ڈالے - نہیں - میں نہیں جاؤں گی -

فلپ — (ذرا درشتی سے) پرسوم جاؤ - میری یہی مرضی ہے - (پرسوم فلپ کو دیکھتی ہے اور پھر دروازہ کی طرف جاتی ہے)

پرسوم — بہتر ہے - لیکن میں کم از کم ان شمعدانوں کو ساتھ لے کر جاؤں گی -

فلپ — (سختی سے) پرسوم! شمعدان کو میز پر رکھ دو اور جاؤ — پرسوم — میں نہیں جاؤں گی -

فلپ — (تند و تیز لہجہ میں) میں — تمہارا بڑا پادری — حکم دیتا ہوں - [پرسوم جبر یہ اٹھکر اپنے کمرہ میں چلی جاتی ہے]

ولیم — (خجالت سے) مقدس بزرگ! میں خوش ہوں کہ میں آپ کے شمعدان لے کر نہ بھاگ سکا - میں نادم ہوں - مجھ پر لعنت ہو -

فلپ — کیا تم اب آرام نہیں کروگے ؟ — دیکھو تمہارا بستر تیار ہے -

ولیم — نہیں! (شمعدانوں کی طرف دیکھ کر) نہیں! نہیں! اب میری جرات نہیں - میں نہیں سو سکتا - اور — اب مجھے جانا بھی چاہئے - مجھے پیرس جانا ہے - پیرس بڑی جگہ ہے اور وہاں میں خاموشی سے زندگی کے بقیہ دن گذار دونگا - اور لوگ میرا پتہ نہ پاسکیں گے - اس لئے میں رات ہی رات سفر کرنا چاہتا ہوں - آپ سمجھے ؟....

فلپ — اچھا - تب — تمہیں رات ہی کو سفر کرنا چاہئے -

ولیم — میں ...... میں سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں — با اخلاق اور رحمدل — کم از کم وہ تو ایسا ہی خیال کرے گا جسے جہنم (جیل خانہ) میں ڈالدیا جائے — بہرحال ...... میں نے آج جانا کہ آپ بڑے اچھے آدمی ہیں — بڑی خوبیوں والے - لیکن میں درخواست کرونگا کہ قبل اس کے کہ میں یہاں سے جاؤں آپ مجھے دعائیں دیجئے — میرے خیال میں یہ سودمند ہوں گی - میں شرمندہ ہوں - (ندامت سے سر کو جھکا لیتا ہے) [فلپ اس کے حق میں دعائے خیر کرتا ہے]

ولیم — شب بخیر! (دروازہ سے باہر جانا چاہتا ہے)

فلپ — ٹھہرو بیٹا! تم اپنی چیز تو بھول ہی گئے — (چاندی کے شمعدان اسے حوالہ کرتے ہوئے)

ولیم — کیا مطلب! آپ چاہتے ہیں کہ میں انھیں لیتا جاؤں -

فلپ — ہاں! از راہ کرم — ممکن ہے کہ ان سے تمہارا کچھ کام چلے - [ولیم ایک حیرت اور استعجاب کے عالم میں وہ

قمعدان لے لیتا ہے) اور سنو بیٹا! اس جھونپڑی کے پیچھے کے دروازہ سے ایک راستہ جنگلوں میں سے ہوتا ہوا پیرس کو جاتا ہے، یہ بالکل خاموش اور سنسان راستہ ہے۔ تم اسی راستہ سے جاؤ۔ ہمارے خیال میں پولیس کے آدمی رات کو تمہیں اس راستہ میں نہ ملیں گے ———

ولیم — شکریہ! شکریہ! مقدس بزرگ! شکریہ۔ میں...... (سسکیاں بھرنے لگتا ہے) میں کتنا نادان تھا سمجھتا تھا کہ دنیا میں کہیں نیکی کا وجود ہی نہیں۔ لیکن آج — مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی میرے دل و دماغ کو متاثر کر رہا ہو۔ میں اب اپنے کو ایک جنگلی جانور نہیں — بلکہ پہلے کی طرح — ایک انسان پاتا ہوں۔

[پشت کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور ولیم وہیں کھڑا ہوتا ہے]

فلپ — (ولیم کے شانہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر) سنو بیٹا! یاد رکھنا یہ جسم خدا کی خداوند قیوم کی عبادت کے لئے ہے۔

ولیم — خداوند قیوم کی عبادت کیلئے! (درد سے) —— میں یاد رکھونگا۔ (چلا جاتا ہے)

[فلپ دروازہ بند کرتا ہے اور دو زانو ہو کر سجدہ معبود میں سر جھکا دیتا ہے]

"پردہ گرتا ہے"

جاپانی طالبات

جاپان کے شاہ میجی SHAH MAGY آنجہانی اپنے ملک کو ایک عظیم الشان ملک بنا دینے کا خواب دیکھا کرتے تھے، انھوں نے اپنی عمر جاپانی ترقی کے شوق اور جد و جہد میں گزاری ——— وہ حسب ضرورت قدیم رسوم اور احمقانہ تقلیدوں کے مٹانے اور متمدن ملکوں کا طرز عمل اختیار کرنے میں ساعی رہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاہ میجی ہی جاپان کے روشن خیال اور اولوالعزم بادشاہ گزرے جنھوں نے ترقی کی ایسی بنیادیں قائم کیں جن بنیادوں پر جاپان کی ترقیوں کی سر بفلک عمارتیں دنیا کو حیران کر رہی ہیں، شاہ موصوف کے عہد حکومت کے ایک فرمان میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :۔ "آیندہ سے تعلیم کو اس طور پر ترقی دی جائے گی کہ ملک میں کوئی خاندان جاہل رہے گا نہ کوئی فرد۔ اور اگر کوئی بچہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ابتدائی اسکول میں نہ داخل ہوگا تو اس کے والدین اس فروگذاشت کے جوابدہ ہوں گے" شاہ میجی کی مجوزہ مدت سے قبل ہی انھیں اپنے خواب کی بہترین تعبیر مل گئی تھی۔ جاپان میں واقعی کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں اور کوردہ ایسا نہیں جہاں تعلیم نہ ہو، یہاں تک کہ غریب سے غریب بھی اپنے خیالات قلمبند کر سکتا اور دلی جذبات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

مارچ ۱۹۳۳ء میں وہاں درس دینے والی پینتالیس ہزار سات سو ترانوے انجمنیں تھیں اور طلبہ کی تعداد ایک کروڑ چونتیس لاکھ آٹھ ہزار نو سو اکہتر تھی حالانکہ اس کی کل آبادی اس کی سات گنی سے بھی کم ہے

جاپان میں چھ سال کی عمر سے سولہ سال تک مدرسہ جانے کی عمر قرار دی گئی ہے۔ صرف وہی بچے جو کسی اندرونی یا بیرونی امراض کے قطعاً ناقابل تعلیم ہیں جبریہ تعلیم سے بری کر دئے جاتے ہیں بعض غریبوں کے بچے جو بے انتہا نادار ہیں وہ بھی مستثنیٰ ہوتے ہیں مگر ایسے بچوں کو جو لوگ نوکر رکھتے ہیں ان کے لئے حکم ہے کہ وہ ان سے اس طریقے پر کام لیں کہ انھیں اسکول جانے کا وقت بھی مل جایا کرے۔ محتاج محض لوگوں کے بچوں کی فیس معاف کر دی جاتی ہے۔

۱۹۳۵ء میں اسکولی عمر کے بچوں کی تعداد فی صدی ۹۹،۵۷ تھی ان میں ۵۴ لاکھ ۵۳ ہزار ۱۱۴ لڑکے اور ۵۳ لاکھ ایک ہزار ۸۴۸ لڑکیاں تھیں۔

جاپان میں ابتدائی عمر سے لڑکیوں کو ملک کے لئے کارآمد اور سلطنت کے لئے مفید شہری بنانے کی اتنی ہی

کوشش کیجاتی ہے جتنی لڑکوں کو ۔ گو قدیم ترین زمانہ میں بھی عورتیں ہر امر میں مردوں کے دوش بدوش تھیں لیکن زمانہ وسطی میں جو تنزلی ہوگئی تھی وہ چینی اور کورین اثرات تھے ۔ چنانچہ ایکی موتی نے بیان کیا ہے کہ جاپان خاصکر اس زمانہ میں اس قدر بیدار تھا کہ عورتیں ملکی اور جماعتی امور میں مردوں سے کسی طرح کم نہ تھیں ۔ سنہ ۵۹۲ء سے سنہ ۷۷۰ء تک وہاں سولہ بادشاہ ہوئے جن میں آٹھ عورتیں تھیں یہ سب مذہبی اور ادبی قابلیتوں کے علاوہ سائنس کی واقفیت میں بھی کچھ نہ کچھ مشہور تھیں ۔

بین زمانہ کے آخری حصہ میں وہاں کی عورتوں کی تقریباً تمام خوبیاں ختم ہوگئی تھیں اور وہ اپنے والدین، شوہروں اور دوسری مرد ہستیوں کی غلام بن گئی تھیں ۔ ایکی موتی صاحبہ لکھتی ہیں کہ عورتوں کی غلامی کے اضافہ میں گوتم بدھ اور کن فیوشس مذہب کے مبلغین کا بھی کچھ کم ہاتھ نہ تھا ۔ عورتوں نے ملکی امور میں اپنے اختیار کھو دینے کے بعد شاعری اور دوسرے آسان مشغلے اختیار کئے ۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے موسیقی اور جاپانی ڈرامو کی ایک بڑی حد تک تکمیل کرلی ——— چونکہ جاپانی عورتوں نے ایک زمانہ میں نسوانی ترقیاں بہت کچھ کی تھیں اور ان کے اثرات گو روایتاً ہی سہی ان میں باقی تھے اسلئے گزشتہ زمانہ انقلاب میں انھوں نے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اسی وقت سے ان کی ترقیوں کا پھر سے ایک نیا باب کھل گیا جس کی تکمیل محض پچیس سال کے عرصہ میں ہوگئی ۔ مذکورہ پچیس سالہ ترقیوں کا موازنہ اگر یورپین اناث سے کیجئے تو آپ کو حیرت ہوگی اس لئے کہ انھوں نے اتنی ترقی پانچ سو سال کی سعی بلیغ سے حاصل کی ہے حتیٰ کہ ڈاکٹر ایلین ایسے صاحبان بھی اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں ۔

دوراندیش شاہ بھی جاپانی طریق تعلیم میں یورپین اور امریکن طریقہ ہائے تعلیم شامل کرنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے جاپانی طالب علموں کے گروہ امریکہ بھیجنا شروع کئے اور سنہ ۱۸۷۱ء کے پہلے ہی گروپ میں پانچ جاپانی طالبات بھی شریک تھیں، ان کے امریکہ بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ امریکن زندگی کا مطالعہ کریں اور تمام کارآمد امور سیکھ کر واپس آئیں ۔ ان لڑکیوں میں سب سے زیادہ صغیر سن ایک ہفت سالہ لڑکی تھی وہ جب فارغ التحصیل ہوکر ملک میں آئی تو اس نے ٹوکیو میں انگریزی نسوانی کالج کی بنیاد قائم کی اس کمسن لڑکی کا نام "امے سودا" ہے ۔

جاپان سے روانگی کے وقت وہ پانچوں لڑکیاں ٹوکیو میں مدعو کی گئیں اور قدیم ترین رسم کے مطابق ان میں سے ہر ایک کو اکابرین دربار کے ہاتھوں گلابی رنگ کے ریشمی خلعت مرحمت کئے گئے اور کہا گیا کہ جب تک تم امریکہ میں اقامت گزیں رہو گی تمہارے تمام مصارف گورنمنٹ ادا کرتی رہے گی ۔

جاپان میں تعلیم نسواں کی انجمنیں انیسویں صدی کے آغاز میں قائم ہوئی تھیں جسے صرف ۳۸ سال ہوئے بخلاف اس کے ہندوستان میں تعلیم نسواں کے ادارے سینکڑوں سال پرانے ہوچکے پھر بھی جاپان کے مقابلہ میں یہاں جو افسوسناک بے علمی ہے وہ محتاج بیان نہیں ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جاپان کی علمی، سیاسی، صنعتی اور ہر نوع کی فلک بوس ترقیوں کے سلسلہ بیان میں جہاں کا ہر متنفس اقوام عالم کے سامنے سربلند ہو ۔ ہندوستان ایسے غلام اور نفاق پسند ملک کا تذکرہ ہی لایعنی اور بے محل ہے ۔

فی زمانہ اخبار "موتو کی ہانی" اپنے "جیوگاکوئن" اسکول کے لئے سارے جاپان میں مشہور ہیں۔ یہ اسکول ۱۹۲۱ء میں قائم ہوا تھا لیکن اب یہ محض اسکول نہیں بلکہ ایک بڑا تعلیمی مرکز ہوگیا ہے اس کے متعلق ایک لڑکوں کا اسکول ہے ایک لڑکیوں کا اور ایک طریقہ تعلیم کا کالج ہے۔ موتو ہانی صاحبہ سے ایک ہندوستانی دوشیزہ کی ملاقات ہوئی، اس کا بیان ہے کہ وہ اپنے کالج کے قریب ہی سرکاری مکان میں رہتی ہیں جس وقت میں نے انھیں اپنے آنے کی اطلاع دی وہ کئی عورتوں کے ساتھ میرے استقبال کے لئے اپنے جوبی مکان سے آگئیں، انھوں نے جاپانی طرز سے سلام کیا، انگریزی زبان میں مزاج پرسی کی، وہ کمونو پہنے ہوئے تھیں اور قدرت کی مہربانیوں کا مجسمہ معلوم ہوتی تھیں، مذہباً عیسائی ہونے کے باعث وہ سادہ زندگی پسند کرتی ہیں، ان میں مجھے کسی نوع کا تصنع نہیں معلوم ہوا۔

موصوفہ کی ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوئی تھی، گریجویٹ ہونے کے بعد کچھ زمانہ انھوں نے ایک عیسائی اسکول میں گزارا اس وقت جاپانی عورتوں کی حالت اچھی نہ تھی، آپ نے ابتدائے عمر ہی سے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی بہنوں کی اصلاح میں تمام عمر صرف کر دیں گی تعلیم ختم کرتے ہی انھوں نے اپنی مجوزہ خدمات شروع کر دیں اور ایک جاپانی اخبار میں پروف ریڈری ذریعہ معاش قرار دی، اس کے بعد جاپان میں سب سے پہلے انھوں نے رسالہ نسواں جاری کیا۔ اب سے تیس سال قبل وہ اپنے شوہر کی مدد سے ایک اخبار بھی نکالتی تھیں اس اخبار کے ذریعہ سے دونوں میاں بیوی کی ادبی شہرت ہوئی۔ جب انھیں اپنی ایک لڑکی کو تعلیم دینے کا وقت آیا اس وقت انھوں نے میدان تعلیم میں قدم رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ نمونہ کے اسکولوں میں لڑکے لڑکیوں کو پوری آزادی اور بجا طور پر ملنا چاہئے اسی خیال کے زیر اثر ایک اسکول آف فریڈم (یعنی آزادی کے اسکول کی بنیاد قائم کی اور اپنی عمر کا تمام سرمایہ اس میں لگا دیا۔ ہمدردی رکھنے والے بھی آگے بڑھے، ٹوکیو شہر کے کنارے مقام میجرو میں ایک امریکن ماہر تعمیرات کی مدد سے بہت حسین عمارت تعمیر کی گئی اس وقت قصبہ میجرو شہر کے شور و غل اور گرد و غبار سے محفوظ تھا۔ پہلے ہی روز ۶۶ طالبات داخل ہوئیں رفتہ رفتہ ۳۰۰ سے زائد ہو گئیں اور ۵۰۰ سے زیادہ فارغ التعلیم ہو کر نکل چکیں ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ایک لڑکوں کا اسکول بھی اسی عمارت میں کھولا گیا ہے۔

جب میں موصوفہ کی معیت میں اسکول پہونچی تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہاں اور اس کے قریب کوئی خدمتگار، گھنٹہ بجانے والے، مالی اور نہ چپراسی نظر آئے یہاں تک کہ دفتر میں کوئی کلرک بھی موجود نہ تھا۔ میں نے پہلا کمرہ دیکھا، ایک معلمہ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو گانے کی تعلیم دے رہی تھی۔ اس کے بعد میری میزبانہ دوسرے کمرے میں لے گئیں، وہاں لڑکیاں دستکاری میں مشغول تھیں، انھوں نے ہمارا استقبال کیا اور اپنی مصنوعات بڑے شوق سے دکھائیں۔ وہ سب انگریزی بولتی تھیں۔ انھیں لڑکیوں میں مس نٹوکو سکوارائی سے ملاقات ہوئی وہ ہندوستانیوں کی دوست ہیں کیونکہ ان کے والد کئی بار ہندوستان آئے ہیں اور جاپان میں ہندوستانی طالب علموں کو ہمیشہ مدد دیتے رہتے ہیں، مس موصوفہ مجھ سے بڑے اخلاق سے ملیں اور ہندوستانی انداز میں سلام کیا۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حسب قاعدہ اسکول میں کوئی معمولی نوکر رکھا جاتا ہے نہ کلرک۔ کل کام لڑکیاں کرتی ہیں آمدنی تحویل میں رکھیں، خرچ کریں اور حساب و کتاب درج کرتی رہیں۔ معمولی اور غیر معمولی مصارف اور انتظامات بھی انھیں کے ہاتھ میں ہیں۔ اسکول اور کھیل کے میدان کی صفائی، دیکھ بھال تمام طالبات کے کھانے کا بندوبست اور جملہ امور کلیتہً انھیں کے سپرد ہیں۔ گویا اسکول ان کا گھر ہے۔

تعلیمی مضامین میں انتظام خانہ داری بھی ایک خاص مضمون ہے اور اسکول کا یہ انتظام ان کے اس مضمون کا ایک سین بن جاتا ہے۔

بانی صاحبہ ہر ایک درجہ کو ہفتہ میں ایک بار بذات خود تعلیم دیتی ہیں، وہ لکھنا پڑھنا یا حساب نہیں سکھاتیں بلکہ لڑکیوں سے گھل مل کر گفتگو کرتی ہیں، لڑکیاں روزمرہ کی زندگی کا جو کچھ مطالعہ کرتی ہیں وہ بانی صاحبہ سے دہراتی ہیں۔ اور وہ خود بھی اپنے نمونوں کو سمجھا کر لڑکیوں کو میدان عمل میں بڑھاتی رہتی ہیں۔ بانی صاحبہ کے شوہر بھی مرد جاہلوں اور آنکی بالکیاں بنا کر اپنی لئے دیتے ہیں۔

اسکول میں عمل کے سات کمرے ہیں۔ ایک میں رنگائی ہوتی ہے، دوسرے میں بنائی، تیسرے میں لکڑی کی کھدائی، چوتھے میں پلاسٹر ماڈلنگ، پانچویں میں کشیدہ کاری، چھٹے میں جاپانی اور یورپین مصوری

میں نے دیکھا لڑکیاں تمام کمروں میں مشغول کار تھیں، کچھ ہینڈ بیگوں، قالینوں، چٹائیوں اور رومالوں کے نئے نئے نمونے تیار کر رہی تھیں۔

اسکول کا (شوروم) نمائش کا کمرہ کھلونوں سے سجا ہوا تھا، ایک طرف لکڑی کے چمچے اور کانٹے تھے دوسری طرف ہاتھ کا کاتا ہوا سوت، کہیں چٹائیاں، کہیں بانس اور کاغذ کے بیگ کہیں رنگین چمڑے کے بیگ اور کہیں خوبصورت گھریلو فرنیچر۔ جو بہت ہی مشاقی ہوشیاری اور صفائی سے بنایا گیا تھا وہ چمکتا تھا اور دھوپ کے رخ پر تو نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ کام کرنے کے کمروں کی دیواروں پر خوشخط (موٹو) طغرے اور نصیحت آمیز جملے لکھے تھے۔ تمام نمائشی چیزیں عام طور پر دیکھنے اور خریدنے کی غرض سے چنی گئی تھیں۔

سارے اسکول میں ہر طرف علم و عمل کا بازار گرم تھا۔ طالبات وہاں محض حصول علم کے لئے نہیں آتیں بلکہ وہ ایک بہترین نمونہ بننے اور ترقیوں کی شاہراہوں پر چلنے کے لئے داخل ہوتی ہیں، ان میں قابلیت پیدا کیجاتی ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں، اپنے بھروسہ پر انتظامات کی ذمہ دار ہوں یہی سبب ہے کہ وہاں کوئی تنخواہ دار ملازم نہیں رکھا جاتا تیس لڑکیوں کی ایک کمیٹی دو ماہ تک تمام امور انجام دیتی ہے، ہر جمعہ کو انتظامیہ جلسہ ہوتا ہے، وہ سب مل کر اسکول کی اہم باتوں پر غور کرتی ہیں ان میں معلمہ بھی شامل ہوتی ہیں، اسٹور کی چیزیں فروخت کر کے اسکول کے تمام کام چلائے جاتے ہیں لڑکیاں اپنے گھروں کی ضرورت کی چیزیں بھی اسکول اسٹور ہی سے خریدتی ہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی لڑکیاں ہی پکاتی ہیں، ہر ایک کلاس کو ہفتہ میں ایک گھنٹہ کھانا پکانا ضروری ہے، بہت چھوٹی لڑکیوں کی مائیں کھانا تیار کرنے میں انکی بچوں



جناب سید کاظم علی شاہ صاحب سبزپوش
رئیس اعظم گورکھپور

مدد دیتی ہیں۔

جب میں اسکول کے ایک ایک جزو کو دیکھنے سے فارغ ہوئی تو دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا تھا۔ لڑکیوں نے بڑی خاکساری اور تواضع سے مجھے بھی دعوت دی، معلوم ہوا کہ غیر ملکی سیاح جو اسکول کا معائنہ کرنے کی غرض سے آتے ہیں انھیں عام طور پر کھانے میں شریک کیا جاتا ہے۔ میزوں پر بڑے بڑے ظروف میں چاول، چینی کے پیالوں میں گوشت، گوبھی دوسری ترکاریاں اور شکر میں پکی ہوئی مچھلیاں چنی گئیں، لڑکیاں یوروپین وضع کے لباس میں تھیں، کھانے سے قبل وہ حمد الٰہی میں نغمہ سرا ہوئیں۔

ان کے تبسم آمیز خوشنما چہروں کا مجھ پر بہت اثر ہوا، وہ آٹھ آٹھ کی ٹولیوں میں ایک ایک میز پر مشغول طعام تھیں صرف ہماری میز پر چار تھیں۔ کھانے کا کمرہ بہت سادہ اور صاف تھا کھانے کے بعد ہماری میزبان نے جاپانی زبان میں مجھے متعارف کرنے کے لئے ایک مختصر سی تقریر کی۔ میں لکچرار نہیں ہوں تاہم میں نے ان کی خاطر تواضع اور شریفانہ مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھا۔

ہر روز کھانے کے بعد لڑکیاں اخبار کے (کٹنگ) ٹکڑے پڑھتی ہیں، اپنی مالی حالت پر تبصرہ آمدنی بڑھانے اور خرچ کم کرنے پر بحث کرتی ہیں، وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑی ہو کر لکچر دیتی ہیں، بعض لکھ کر سناتی ہیں، میں کچھ دیر ان تقریروں کو سنتی رہی مگر ایک لفظ بھی نہ سمجھی کیونکہ تقریریں ٹھیٹھ جاپانی زبان میں تھیں۔

اسکول کی لڑکیاں دھلائی اور صفائی کا کام بڑے سلیقہ سے کرتی ہیں، میں نے دیکھا کچھ لڑکیاں لانبے لانبے برش لئے فرش صاف کر رہی تھیں۔

دوسرے روز میں جاپانی نسوانی یونیورسٹی دیکھنے گئی، میری رہنما   صاحبہ تھیں اگرچہ وہ بھی پہلی ہی بار اس یونیورسٹی میں گئیں تھیں مگر انھیں راستہ بھولنے کا اندیشہ نہ تھا، ہم دونوں میجورو جانے والی لوکل ٹرین پر سوار ہوئے، خوش قسمتی سے ایک لڑکی یونیورسٹی سے قریب ہی رہنے والی مل گئی، اس نے یونیورسٹی جانے والی سڑک تک ہماری رہبری کی، دوپہر کے بارہ بجے تھے، کچھ لڑکیاں جھولے لٹکائے جاتی نظر آئیں، پھاٹک کے سامنے سڑک کی مرمت ہو رہی تھی اس لئے کچھ غیر معمولی کیچڑ ہو گئی تھی، بہت دقت سے یونیورسٹی پہونچے، پہلے ایک بڑا احاطہ ملا، ایک طرف باغ لہلہا رہا تھا دوسری جانب کھیلوں کے میدان تھے، لڑکیاں اس روز تعطیل منانے کی دھن میں تھیں، کچھ چکر دار جھولوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، کچھ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں، انکی عمر سترہ اٹھارہ سال سے کم کی نہ تھی۔ بعض درختوں پر جھولوں میں کھٹولے پڑے تھے، لڑکیاں جھول رہی تھیں کچھ لڑکیاں چیری کے درختوں کے قریب کھیل رہی تھیں، چیری کے سفید اور گلابی پھول موسم بہار کا منظر دکھا رہے تھے، آفس کے قریب ہمارے کارڈ طلب کئے گئے، اندر داخل ہو کر ہمیں انگیٹھی کے پاس بٹھایا گیا، ایک لڑکی معاً ایک شعلہ فشاں انگیٹھی میرے

پیروں کے قریب لاکر رکھ دی، پھر دوسری لڑکی نے کالج کے تمام کمرے دکھائے، اور ان کمروں میں لے گئی جہاں دماغی طاقتیں جانچنے کی مشینیں رکھی تھیں یہاں بچوں کی قوت باصرہ، سامعہ، ذہن کی تیزی، ہاتھ پاؤں کی پھرتی اور نہ معلوم کیا کیا حالتیں ناپی جاتی ہیں، کچھ خاص قسم کی تصویریں تھیں، بڑی لڑکیاں نیچے درجہ والوں کو کہانیاں سنا کر اور ان تصویروں کو دکھا کر ان سے کہانیاں دہرواتی ہیں، دیواریں تصویروں سے ڈھکی ہوئی تھیں، کچھ صنعتوں کے متعلق تھیں، کچھ ذہانت اور تخیلہ کو ابھارنے کے لئے۔ چونکہ وقتی امتحان ختم ہوا تھا اسی باعث لڑکیوں کو چھٹی دے دی گئی تھی اور ہم زیادہ لڑکیوں کو نہیں دیکھ سکے۔

سڑک پار کر کے اور کافی دور چلکر کالج کے کنڈرگارٹن حصہ میں پہونچے، اب کھانے کا وقت آگیا تھا اس لئے کچھ لڑکیاں کھانا کھا رہی تھیں، کھانے میں خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ وٹامن کی تعداد زیادہ ہو۔ کھانے سے فارغ ہو کر کچھ کھیلوں میں مشغول تھیں اور کچھ جانے کے لئے تیار تھیں، اسکول کی یہ عمارت ایک پہاڑی کی چوٹی پر ہے، ارد گرد خوبصورت باغیچہ ہیں۔

وہاں ایک طریقہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ لڑکیاں اپنے جھولوں میں ہلکے جوتے ضرور لاتی ہیں اسکول میں پہونچ کر سڑک پر پہننے والے جوتے جھولے میں رکھ کر وہ ہلکے جوتے پہن لیا کرتی ہیں، کنڈرگارٹن کی کرسیاں اور میزیں اس ساخت کی ہیں کہ وہ کھلونے کی طرح کے فرنیچر معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں چار سال سے چھ برس تک کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

اس کے بعد ہم نے پرائمری اسکول دیکھا، یہاں چھ سال سے بارہ سال تک کی لڑکیاں تھیں، کچھ دیر آفس میں چائے پلائی جانے کے باعث ہمیں قیام کرنا پڑا، جب ہم اسکول کی حدود میں داخل ہوئے جو لڑکیاں میدان میں کھیل رہی تھیں انھوں نے آفس کے راستے گھیر لئے ان کے لئے غیر ملکی ایک تماشہ ہو جاتے ہیں۔

جاپان کی سرزمین تیوہاروں کی سرزمین ہے، لڑکوں کے تیوہار، لڑکیوں کے تیوہار، ماؤں کے تیوہار اور نہ معلوم کون کون سے تیوہار ہوتے رہتے ہیں، میں جس روز اس اسکول میں پہونچی اس کے دوسرے ہی روز ماؤں کا تیوہار تھا اس لئے لڑکیاں اپنی اپنی ماں کے لئے تحفے تیار کرنے میں محو تھیں، یوروپین لباس میں ایک لڑکی آئی اور وہ ہمیں پہلے کمرے میں لے گئی وہاں کوئی پچاس لڑکیاں کاغذ کے گول گول ڈبہ بنا رہی تھیں، ہر ایک کے پاس قینچیاں، سٹ اسکوائر اور ضروری چیزیں موجود تھیں، ڈبہ تحفہ رکھنے کے لئے بنائے جا رہے تھے۔ میں نے جیسے ہی ان لڑکیوں کو سلام کیا وہ زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں، شاید انھوں نے ہمیں کوئی عجیب مخلوق سمجھا، دوسرے اور تیسرے درجوں میں بھی اسی نوع کی مصروفیت تھی، چوتھے درجہ میں معلمہ کمونو پہنے پلیٹ فارم پر جاپانی زبان میں لکچر دے رہی تھی، دوران تقریر میں ہر وقفہ پر جتنی لڑکیاں معلمہ کی تقریر سمجھ جاتی تھیں اپنے ہاتھ اٹھا دیتی تھیں اور جو ہاتھ بلند نہیں کرتی تھیں انھیں مکرر سمجھایا جاتا تھا، ہم نے ایک ایک کر کے وہاں کے چھٹوں درجوں کو دیکھا، تمام لڑکیاں یوروپین لباس میں تھیں، ان کی تعلیم اور تندرستی قابل تعریف ہیں، تقریباً ہر لڑکی کے گلابی رخسار اور یوروپین وضع کے ترشے ہوئے بال آنکھوں پر

روشنی پیدا کرتے ہیں۔

جاپان کا یہ نسوانی کالج ۱۹۰۱ء میں قائم ہوا تھا اس کے بورڈ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، کالج کا کورس سترہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے، یہاں یعنی علم النفس کے لئے بھی ایک جماعت ہے جس میں گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ لڑکیاں ریسرچ کا کام کرتی ہیں، اب تک پانچ ہزار گریجویٹ لڑکیاں اس کالج سے نکل چکی ہیں یہاں ۲۰ بورڈنگ ہاؤس ہیں جن میں جاپان کے تمام حصوں سے تقریباً ۰۰۰ تحصیل علم میں مشغول رہتی ہیں، اسکول اور کالج کی ڈگریاں اور خطابات جاپانی لڑکیوں کی شادی کے لئے ایک بہترین جہیز ثابت ہوتے ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ خوشنویسی، کاغذی گل تراشی، اور چائے تیار کرنے اور کپڑے سینے کی قدیم کاریگریوں کو جاپانی عورتوں نے اب بھی فراموش نہیں کیا مقامی لڑکیوں کے علاوہ بیرونی ممالک کی طالبات کے لئے نسوانی کالج میں تیسرے پہر اور شام کو کلاس لگتے ہیں اور ایسی تمام صنعتیں ذوق و شوق سے سکھائی جاتی ہیں۔

سال بھر تک شاہکار مفت کیسے حاصل ہو سکتا ہے

اس میں شک نہیں کہ شاہکار کا سالنامہ تحقیقی مضمونوں، معیاری نظموں اور دلچسپ افسانوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے — اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ وہ باعتبار حسن ظاہری کے بھی تمام خوش منظر صحائف میں بہترین ہے اس لئے آج ہی تین روپیہ سالانہ چندہ ارسال فرما کر خریدار ہو جائیے۔

اور اگر باوجود ادبی ذوق و شوق کے تین روپیہ ارسال کرنے سے مجبور ہیں تو صرف پانچ خریداروں سے زر چندہ ذریعہ منی آرڈر ارسال کرا دیجئے — اور مسلسل سال بھر شاہکار دیکھئے

فروری ۱۹۳۶ء کی نامکمل فہرست ملاحظہ کیجئے:۔ ۱ اقبال کی تحلیل نفسی۔ ایک لاجواب تنقید جو تاخیر سے پہونچنے کے باعث سالنامہ میں شائع نہ ہو سکی ۲ خانصاحب کی جوانی ایک بے انتہا دلچسپ مزاحیہ افسانہ۔ ۳ جاپان میں ریڈیو۔ ۴ عید کے دن "صابر گورکھپوری" کا افسانہ ۵ محمد ابن ابی المنصور تاریخی مضمون۔ اور منظومات میں ۶ حضرت علی اختر، ۷ مولانا کیفی ۸ جناب رضا نقوی ۹ اور حضرت فطرت واسطی کی بلند پایہ نظمیں ہونگی۔

منیجر رسالہ شاہکار گورکھپور

بے زبان عورت

آدھی رات کے سناٹے میں دنیا نیند کے مزے لے رہی ہے اور سلیم کروٹیں بدل رہا ہے، خیالات کے بے بنیاد ہجوم میں طرح طرح کی بھیانک شکلیں پیش ہو جاتی ہیں، کبھی وہم ہوتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے قصبہ شاہ آباد کے کتنے ہی چل بسے، میں بھی عمر طبعی کو پہونچ گیا ہوں، اگر بے زبان زبیدہ کے ادائے فرض سے پہلے ہی جان بحق ہو گیا تو کیا ہوگا؟ باہمی تنازعات اور جائداد کی تقسیم سے کسے فرصت ہوگی جو اس کی شادی بیاہ کی فکر کرے گا، ماں سے زیادہ بھی خواہ کون ہو سکتا ہے، مگر وہ بھی دائم المرض، میری آنکھ بند ہو جانے کے بعد غریب کیا کر سکتی ہے درانحالیکہ میں ابھی زندہ موجود ہوں اور مجبور محض ہوں ---

دفعتہً اسے اپنے قدیم دوست مسٹر آصف کا خیال آیا اور ساتھ ہی چشم تصور نے ان کے خوشرو اور نوجوان لڑکے کی تصویر بھی پیش نظر کر دی جو اسی سال اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہونے والا ہے۔ سلیم نے کوئی ... منٹ بھر حافظہ پر زور دے کر کہا :- "شاید سعید --- ؟ ہاں سعید ہی تو اس کا نام ہے ؟ --- اگر ذرا سا اشارہ کر دوں تو آصف زبیدہ سے اس کی نسبت کرنے کو تیار ہو جائیں، مگر مشکل یہ ہے کہ جن جن کے پیغامات ٹھکرا دئے ہیں وہی نہیں بلکہ ساری برادری تھڑی تھڑی کرے گی اور منھ دکھانے کے قابل نہ رہونگا، آصف کے صحیح النسب ہونے میں کیا شک ہے، مگر اسے کیا جائے ہماری برادری نے شرافت کا معیار ہی عجیب رکھا ہے، اس کے نزدیک چند تعصبات کے صرف وہی لوگ شریف ہیں جنھیں غلط فہمی ہے کہ شرافت ہم پر ختم ہو گئی ہے، باقی یا تو غیر شریف ہیں یا ان کی نام نہاد شرافت اس قابل نہیں کہ ان سے رشتہ جوڑ کر کوئی اپنی شرافت کو بحال رکھ سکے --- اب اگر غیر سے کئے دیتا ہوں تو تمام عمر آنکھ نیچی رہے گی اور نہیں کرتا ہوں تو جوان لڑکی ہے کب تک بٹھا رکھوں ؟ اسی نوع کے خیالات میں سر دھنتے دھنتے جیسے ہی اس نے لیمپ کی بتی کم کی زبیدہ کی والدہ نے آہستہ سے کہا :- "کیا آپ جاگ رہے ہیں ؟" "ہاں --- نیند نہیں آتی" انھوں نے اٹھ کر پاندان کھولا اور کہنے لگیں :- ان دنوں میرا بھی یہی حال ہے، راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ پڑے پڑے نہ معلوم کیا کیا سوچا کرتی ہوں" "ہاں --- جب پریشانیاں حد سے زیادہ ہوتی ہیں تو یہی حال ہو جاتا ہے" بیوی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا :- خدا معلوم یہ پانوں کی بیڑیاں کب کٹیں گی --- آخر آپ نے کچھ سوچا بھی ہے ؟" "کیا بتاؤں، میری عقل تو کام نہیں کرتی، جب تک زبیدہ زیر تعلیم رہی نسبتیں آتی گئیں اور کچھ نہ کچھ نقص نکال نکال کر ہم سب عورتوں نے انھیں نامنظور کر دیا۔ زبیدہ کی قابلیت اور ہنرمندیوں کی شہرت کے ساتھ یہ بھی

یہ بھی مشہور ہوگیا کہ وہاں ہر نسبت اور پیغام ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اب نسبتیں کیسے آسکتی ہیں، خصوصاً ان قصباتوں سے کہاں ممکن ہے ایک بار بات خالی جانے کے بعد دوبارہ تحریک کریں ورنہ میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ جن لوگوں سے انکار کر دیا گیا ہے اگر انھیں میں سے کوئی چھوٹوں کہہ دے تو خوشی سے منظور کرلوں، بہرحال اگر تمھاری رائے ہو تو اپنے دوست آصف کے لڑکے سے کر دوں، وہ تعلیم یافتہ ہے اور حد درجہ سعادتمند بھی" زبیدہ کی والدہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہا:- اوئی غضب! غیر برادری میں لڑکی دے کر ناک کٹوادی جائے گی؟ اس سے تو بہتر ہے کہ محمود ہی سے کر دیجئے، وہ جیسا بھی ہے ہے تو حقیقی بھتیجا؟" یہ سچ ہے مگر خیال تو کرو وہ پڑھنے سے بھاگ بھاگ کر کلکتہ، بمبئی اور کہاں کہاں مارا مارا پھرا، اتنی عمر آگئی صحیح خط نہیں لکھ سکتا اور آج بھی انھیں آوارہ لونڈوں کی صحبت ہے جنھوں نے اسکی زندگی برباد کر دی، ایسے لڑکے کے ساتھ زبیدہ کی تقدیر کیسے پھوڑ دی جائے ---؟

مگر میں تو سمجھتی ہوں کہ شادی کے بعد وہ خود ہی سنبھل جائے گا، اسکے علاوہ جائداد کافی ہے، اسکی ماں زبیدہ پر جان نثار کرنے کو تیار ہیں، ایسی صورت میں اسے کسی قسم کی محتاجی ہوگی نہ کسی طرح کی تکلیف" اور اگر شادی کے بعد بھی نہ سنبھلا --- تب --- اور مان لیا کہ تمھارا ہی کہنا ہوگیا پھر بھی زبیدہ ایسی لڑکی جس نے فقہ، حدیث کی تکمیل کی ہو، صوم و صلوٰۃ کی پابند اور صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ اس کی نظر میں ایک جاہل محض اور بد اطوار کی کیا وقعت ہوسکتی ہے اور ان میں میل جول ہی کیوں کر قائم رہیگا --- "معاف کیجئے، آپ نے ابھی زبیدہ کو سمجھا نہیں، وہ شدید سے شدید غم اور غصہ میں بھی زبان سے ایک حرف نہیں نکالتی ایسی لڑکی سے جھگڑا ہونا یا میل جول نہ رہنا ممکن نہیں، سچ کہتی ہوں میں نے تو ایسی لڑکی نہیں دیکھی مگر اسکی قسمت پر افسوس ہے" دونوں میاں بیوی بحر سکوت میں غرق ہوگئے ---

---

بھیگی ہوئی رات میں جب خاموشی چھا جاتی ہے، دور دور کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، زبیدہ تو برابر والے کمرے ہی میں تھی اس نے اپنے والدین کی گفتگو پہلے تو بے ارادہ سنی اور جب محسوس کیا کہ تمام دلشکن باتیں میرے ہی متعلق ہیں، اچھی طرح کان لگائے، نسبتیں مسترد کر دینے کا پچھتاوا، سماجی پابندیوں کی دشواریاں، سعید ایسے مناسب لڑکے کی بجائے نالائق محمود کو رفیق حیات بنانے کی تجویز" یہ سب ایسے نمونہ تھے کہ ایک وسیع النظر فاضل لڑکی ان پر تبصرہ نہ کرتی --- وہ محمود اور اس کے مذبوحی حرکات سے بخوبی واقف تھی، اس نے ایک درد بھری آہ کھینچ کر دل میں کہا:- غضب خدا کا! کیا بے زبان بھیڑ سے جو پال پوس کر آن واحد میں قصاب کے حوالہ کر دی جاتی ہے میری مجبوریاں کچھ کم عبرتناک ہیں اور کیا اس مجبور محض جانور کو اپنی جان، اپنے جسم اور اپنے رونگٹے رونگٹے سے جس طرح بے دخل مان کر لوگ اپنی ادنی ادنی ضرورتوں کا نشانہ بناتے ایسی ہی غریب نا کتخدا لڑکیاں نہیں سمجھ لی گئی ہیں، یہ کوئی معمولی بات ہے کہ وہ بغیر مرضی تمام عمر کے لئے جا ہے جسکے سپرد کر دی جائیں اور اف نہ کریں، عام اس سے کہ وہ کیسا ہی جاہل، بدچلن، بوڑھا نادار ہو یا اس سے بھی زیادہ ناموزوں، انھیں نا سمجھ والدین کی مصلحتوں اور ظالم سماج کے قانون پر بھینٹ چڑھ جانا اگر یہ ہے --- افسوس وہ نہیں جانتے کہ بے زبان لڑکیوں کے پہلوؤں میں بھی دل ہیں، انسانی دل جنھیں نکال کر اور میکے والوں ہی کے سپرد کر کے وہ سسرال نہیں جا سکتیں ---

وہ نہیں سمجھتے کہ بدترین شوہروں کے ہاتھ میں ہمارا ہاتھ پکڑا دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی پالو جانور کو بے قصور گولی مار دینا۔ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایک لمحہ میں جاں بحق ہو جاتا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ تمام عمر تڑپ تڑپ کر جان دی جائے ـــــ پھر کیوں نہ اس ڈرامہ کی تکمیل سے پہلے ہی چراغ حیات گل کر لوں تاکہ ان دونوں اور خود کو ہمیشہ کے لئے تمام آلام و افکار سے سبکدوش کر دوں ـــــ اس نے یاس آوریں خیالات کے زیر اثر خودکشی کا فیصلہ کرنے کو تو کر لیا مگر اس طرح جیسے پیاسا روزہ دار ایک گلاس پانی کے عوض ایمان دے دینے پر آمادہ ہو جائے اور روزے کی عظمت کو یک لخت فراموش کر دے ـــ وہ اپنی تجویز پر دوبارہ غور کرنے لگی آنکھیں چھت گیری کے نقش و نگار پر جمی ہوئیں اور دماغ مصروف خیال تھا یکبارگی اس کے ذہن میں آیا ـــ اس میں شک نہیں کہ مایوس سے مایوس کے دل میں بھی پس پردہ توقعات کی جھلک نہاں ہوتی ہے، برخلاف اسکے میرا دل تمام امیدوں اور مسرتوں سے خالی ہے جب ہی تو زندگی کا خاتمہ کرنے پر آمادہ ہوں ـــ مگر یہ میری سراسر بھول ہے، انتہائی مصیبت کے وقت بھی موت کی آرزو کرنا یا اپنے ہی ہاتھوں مرگ بے ہنگام کا شکار ہو جانا بزدلی ہے ـــ حد درجہ بزدلی اور حماقت بھی، اور مان لیا کہ اگر کسی غیر طبعی طور پر نظام حیات کو درہم و برہم ہی کر دیا جائے تب بھی تو پھر اس خود غرضی کے کہ محمود ایسے جاہل سے نجات مل جاتی ہے اپنے والدین اپنے حقیقی بھائیوں اور تمام اقربا کو ایسے شدید غم والم میں مبتلا کرتی ہوں جسکی تلافی غیر ممکن ہوگی۔

ایسے حقیقی چاہنے والوں کو محض اپنی خاطر ناقابل برداشت کلفتوں میں مبتلا کرنا انتہائی خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے، جسے میری غیرت ہرگز قبول نہیں کر سکتی، میں نے بے جا فیصلہ کیا تھا، اب میں موت کی بجائے اپنے لئے قوت برداشت، استقامت اور فرماں بردار رہنے کی دعا مانگتی ہوں، میرے والدین سماجی بندے اور محض کم ہمت ہیں، ذراسی دشواری میں جی چھوڑ دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ محمود تو محمود ہے زبیدہ ایک زندہ صفت انسان کے ساتھ بھی صبر و جبر سے نہیں بلکہ کیف و مسرت سے نباہ سکتی ہے، شادی بیاہ کے بغیر بھی عزت سے زندگی گزار سکتی ہے، ایسی عزت سے نہیں جیسی در پردہ نفس پرستی کرنے والیوں یا خانقاہ کی اچھوتیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ اس مخصوص عفت و عصمت کے ساتھ جسکی بدولت عورت عورت ہی نہیں بلکہ قابل پرستش دیوی سمجھی جاتی ہے۔

زبیدہ کو دوشیزگی کی منزل سے گزر کر محمود کے گھر کی رونق بنے ہوئے کئی مہینہ ہو چکے ہیں، محمود اب بھی یار باشیوں میں منہمک ہے، ہفتے ہو جاتے ہیں دن کیوقت اسکی صورت نہیں دکھائی دیتی، راتوں کو بھی غائب رہتا ہے اور اگر آیا بھی تو چور کیطرح کبھی آدھی رات کو کبھی پچھلے پہر جب دنیا خواب غفلت میں مدہوش اور زبیدہ اپنی خلوت میں سراپا انتظار ہوتی ہے۔

ایک تاریک رات ہے مضمحل تارے ایک ایک کرکے دم توڑ رہے ہیں، زبیدہ کی نگاہیں ہر اتفاقیہ آہٹ پر دروازے کیجانب اٹھ جاتی ہیں ـــ جیسے ہی بڑی گھڑی نے تین بجائے، اسی وقت محمود آگیا اور آتے ہی حیرت سے کہنے لگا:۔ "ہائیں! تم اب تک جاگ رہی ہو!؟ جی ہاں انتظار کرتے کرتے نیند اچٹ گئی" محمود پہلے تو کچھ دیر ایک سنگین بت کی طرح دم بخود رہا پھر کہنے لگا:۔ "تعجب ہے کہ منع کر دینے کے باوجود بھی تم نے انتظار کیا، شاید اس سے تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں پے در پے شرمندہ ہوتا رہوں، تم ایک ایک کے سامنے میرے غائب رہنے کا رونا روتی ہو اور وہ سب مجھے ذلیل سمجھیں۔ مجھے ایسی ذلیل پابندیاں پسند نہیں ورنہ

میں اس طرح کی نامعقول حرکتوں سے زیر ہو سکتا ہوں — اس نے تیور بدل کر کہا:— بہتر یہی ہے کہ آئندہ انتظار کا لفظ سنوں نہ انتظار کرتا ہوا دیکھوں ورنہ ایسی سخت سزا دونگا کہ تمام عمر یاد رکھو گی —"

محمود کی دلخراش گفتگو سن کر زبیدہ نے ایک دردبھری اور سب سے ہلکی سانس لی۔ سرہانے سے لٹکتے ہوئے پھولوں کا گجرا اٹھا کر محمود کے بستر پر رکھدیا اس کے بعد وہ جیسے ہی پاؤں دبانے کے لئے بڑھی محمود نے پہلے سے بھی زیادہ درشت لہجہ میں کہا:— "رہنے دو — اب پاؤں دابنے کا وقت نہیں ہے"

وہ کچھ ہی دیر میں خراٹے لینے لگا اور دل شکستہ زبیدہ نے ایک فلسفی کی طرح محمود کے دلخراش طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے دل میں کہا:— آہ! میرے خدا!! کیا دولہا دلھنوں سے ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں؟ کیا مجھ بدنصیب میں کوئی ایسی خرابی ہے کہ صورت دیکھتے ہی بیزار ہو جائیں اور کیا اس خرابی کا رفع ہو جانا ممکن ہے؟ اس نے اپنی شکل و صورت، قطع وضع اور برتاؤ پر بڑی احتیاط سے غور کرتے ہوئے خیال کیا:— میں ان کے لئے اجنبی اور محض نووارد ہوں بظاہر مجھ میں کوئی عیب ہی محسوس ہوتا ہے اور اگر مان لیا جائے کہ اپنے عیب کا آپ اندازہ نہیں کر سکتی کوئی نہ کوئی ناقابل برداشت خرابی ضرور موجود ہے۔ تب بھی سوال یہ ہے کہ انھوں نے ایسی نامرغوب شادی ہی کیوں منظور کر لی اسکے علاوہ جب وہ دور دور رہتے ہیں، ناک بھوں چڑھائے آتے ہیں اور بے بات کی بات پہ جھڑک کر چلے جاتے ہیں پھر انھیں میرے عیب ظاہر کرنے میں کیا تکلف ہو سکتا ہے۔ مجھے غم سے زیادہ ضبط غم کی تکلیف مارے ڈالتی ہے، (چھوٹی نند) کلثوم ایک چنچل لڑکی ہے، ہنستی ہے اور ہنسانے پر آمادہ رہتی ہے۔ وہ غریب کیا جانے کہ میرا دل تو آٹھوں پہر روتا رہتا ہے میں کیا خاک ہنسوں اور اسکے تمسخر کا جواب دوں، پھر واقعہ بھی ایسا جسے کسی سے کہہ نہیں سکتی، مشورہ لے نہیں سکتی، چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہتا ہے رو نہیں سکتی — رازداری کے لئے سب سے زیادہ مناسب ماں ہیں ضعیف ماں مگر وہ بھی کیا کر سکتی ہیں، کسی کے دل کو پھیر دینا انسانی قدرت سے باہر ہے، میرے حالات سنتے ہی روتے روتے حال خراب کر لیں گی جتنی زندگی باقی ہے وہ بھی جلد سے جلد ختم کر دیں گی اور باوجود اس کے میرے غم میں خس برابر کمی نہ ہوگی۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ جو کچھ گذرتی ہے صبر و سکون سے برداشت کر لوں، ان جذبات جو شوہر کی ٹھوکروں میں پامال ہو رہے ہیں ہونے دوں۔ اور زبان سے اُف تک نہ نکالوں۔ آنے والا زمانہ حقیقت حال کا خود ہی انکشاف کر دیگا۔

زمانہ بھی کتنے دبے پاؤں گزر جاتا ہے، زبیدہ کو روحانی تکلیفوں پر بسر کرتے پورے ساڑھے مہینے ہو گئے، اسے غم کھانے اور خون جگر پیتے رہنے کی عادت سی ہو گئی، ساری ساری راتیں بحر تخیل میں گہرے سے گہرے غوطے کھاتے ختم ہو جاتی ہیں، ہفتوں بجز مختصر اور اشد ضروری الفاظ کے بات کرتی اور نہ کسی کی دلچسپ سے دلچسپ گفتگو سنتی ہے

ایک دوپہر کے سناٹے میں جبکہ تمازت آفتاب سے بچنے کے لئے لوگ دروازے بند کئے تاریک کمروں میں مصروف راحت ہیں زبیدہ خلوت میں اپنے حالات پر تبصرہ کرتے کرتے دل میں کہتی ہے:— خداوندا! انھیں کون سا مرض ہے جسکے لئے انھوں نے مہینوں دہلی میں علاج کیا اور واپس آنے پر بظاہر کوئی تبدیلی نہیں محسوس ہوتی، ان کی بے التفاتیوں کا وہی حال ہے صرف مزاج میں تغیر ہو گیا

ہے۔ پہلے وہ چڑچڑے تھے اب ان پر ایک نوع کا انفعال طاری رہتا ہے، ہر وقت کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں، مجھ سے چار آنکھیں پہلے نہیں کرتے تھے اب بھی نظر سے نظر نہیں ملاتے البتہ میری عارضی خاموشی اور خشک مزاجی جو ساس نندوں اور تمام آنے جانے والوں کی زبان پر ہے، کوئی مجھے مغرور کہتا ہے کوئی اکل کھرا کوئی کھلی ہوئی عداوت پر کمربستہ اور کوئی منحوس بانجھ بجھوتی کہہ کر ان کی دوسری شادی کی تجویز پیش کرتا ہے اب وہ ان سب کی مخالفت کرتے ہیں، میری شکایت سن کر آزردہ ہو جاتے ہیں اور کلثوم سے اس لئے خوش ہیں کہ وہ میری دلدہی کرتی ہے، زبردستی کھانا کھلا دیتی ہے اور میری رنجیدگی سے متاثر ہو کر خود بھی غمگین ہو جاتی ہے ——"

اس کے خیالات کی رو یہیں تک پہونچی تھی کہ کلثوم شوخی سے زمین پر قدم رکھتی اور اس طرح مسکراتی ہوئی جیسے کوئی بہت ہی چست جملہ کہنے سے پہلے اسے متبسم ہونے کی عادت تھی آ گئی اور آتے ہی کہا :— بھابی جان اگر آپ کا ہنسنا اور کوئی بات منھ سے نکالنا محض بھائی جان کے لئے مخصوص ہے تو میں ان سے اقرار لوں گی کہ وہ انگریزوں کی طرح اپنی میم کو بھی کمر میں ہاتھ ڈال کر ساتھ ہی لیتے جایا کریں۔ اس نے بھاوج سے لپٹ کر پوچھا کہئے کیا رائے ہے جب زبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو گدگدانا شروع کیا اور اس وقت تک دم نہ لینے دیا جب تک زبیدہ بھی ہنسنے نہ لگی۔ پھر سنجیدگی سے کہا :- بھابی جان! آخر کیا بات ہے جو ہمیشہ چپ لگی رہتی ہے؟ ہمارے یہاں آنے سے پہلے تو آپ ہر وقت باتیں کرتی تھیں، ہنستی تھیں اور ہر وقت خوش مزاج رہا کرتی تھیں یہاں کوئی صدمہ رہتا ہے یا کیا سبب ہے کہ جب دیکھو جیسے آنسو نکلنے کو ہوں" اچھا میں بتا دوں گی مگر اس وقت ایک بات پوچھتی ہوں چھپاؤ نہیں صاف صاف کہہ دیں کسی سے نہ کہوں گی" پوچھئے کون سی بات ہے —— وہی تو نہیں جو کل شام کو اماں جان آپا اور چھوٹی باجی سے کہہ رہی تھیں؟ "ہاں وہی" اُسے نہ پوچھئے مفت میں آپ کو رنج ہوگا" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ میں بدنصیب صدموں سے کہاں تک بچ سکتی ہوں —— اس خیال کو جانے دو اور جو کچھ ہونے والا ہے بتا دو میں تمہارا بڑا احسان مانوں گی ——" دونوں آبدیدہ ہو گئیں، کلثوم نے کہا :- سنئے آپا کے مزاج سے تو آپ واقف ہیں وہی روز روز آپ کو بانجھ بجھوتی کہتی ہیں، وہی بھائی جان کی دوسری شادی کرنے پر امی جان کو ابھارتی رہتی ہیں، اور خاص انھیں کے زور دینے سے سب ہی رضامند ہو گئے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی، زبیدہ نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا :- میری پیاری کلثوم! اور جو جو سنا ہے صاف صاف کہو میں زندگی بھر تمہارا احسان مانونگی" اور کیا کہوں بس یہی سنا ہے کہ فدا حسین خالو —— زینب کی شادی بھائی جان سے کرنے پر آمادہ ہیں، سوا من مٹھائی بنانے کے لئے کلو حلوائی سے کہلا دیا گیا ہے —— اب یہ کام ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ——" اور کیا تمہارے بھائی جان نے بھی منظور کر لیا ہے؟" نہیں —— وہ تو کہتے تھے کہ اگر دوسری شادی کرنے پر مجھے مجبور کیا گیا تو میں تمام عمر کے لئے کہیں روپوش ہو جاؤں گا —— لیکن آپ جانتی ہیں کہ امی جان جب کسی بات پر اڑ جاتی ہیں پھر کہاں ممکن کہ اس سے باز آجائیں اس لئے میرا خیال ہے کہ بھائی جان کو بھی کسی نہ کسی طرح راضی ہونا ہی پڑے گا ——"

یہ واقعات معلوم کرنے پر جس پر آشوب غم میں زبیدہ مبتلا ہو گئی اس کے اظہار کے بجائے اس نے ایک نہایت ہی دردناک سانس لی اور دم بخود رہ گئی۔

ایک تاریک و بھیانک اعتکاف میں زبیدہ شکستہ رباب کی طرح مجسم حزن پہلے تو دیر تک عالم کیا کیا سوچتی رہی، محمود کی دوسری شادی کی تاریخ متعین ہوگئی تھی، جذبات اور خیالات اُمڈ کر اُسکے دماغ میں بحر بیکراں کی طرح موجزن ہوگئے تھے۔ یکبارگی اسکا خیال والدین کی جانب منتقل ہوا وہ دل میں کہنے لگی :- "والدین! قسمت! مجھے اس عذاب الیم میں ماں باپ دیدہ و دانستہ مبتلا کرکے یکے بعد دیگرے رخصت ہوگئے، شوہر کی بے التفاتیوں نے پہلے ہی گہرے گہرے زخم ڈال دئے تھے اس پر ستم دوسوت لائے جانیکے روح فرسا انتظامات ہیں جن سے متاثر ہوکر انسان تو انسان ہے شاید فرشتہ بھی چیخ اُٹھے مگر خداوندا! تو ہی شاہد ہے کہ میں نے ابھی تک دامن صبر ہاتھ سے جانے نہیں دیا، آئندہ کی نسبت نہیں کہہ سکتی کیا ہونیوالا ہے، مگر کلثوم تو یہی کہتی تھی کہ وہ دوسری شادی کے لئے رضامند نہیں ہیں، تاہم نفسیاتی گتھیاں سلجھا لینا انسانی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے، کسے معلوم کہ آخر تک انکار پر قائم رہیں گے یا کثرت رائے سے مغلوب ہوکر میرے گلے پر چھری چلا دیں گے ـــ"

کچھ دیر بعد زبیدہ کرسی کی آڑ لگائے سوگئی، اور جب بیدار ہوئی تو اس کے اعضا کسمند تھے، انگڑائی لیتے ہوئے وہ اچانک مڑی، اس نے ایک عجیب نظارہ دیکھا :- محمود بحالت گریہ کچھ لکھنے میں منہمک تھا، پہلے تو وہ اسی تصور میں کھوگئی پھر اس نے بغور غور کیا، محمود کی صورت سے غیر معمولی غمگینی نمایاں تھی، چہرہ زرد ہوگیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے روح تحلیل ہوگئی ہو، اسکے تلخ ترین برتاؤ کے باوجود برداشت نہ کرسکی، اس نے دردمند لہجہ میں دریافت کیا :- آپ روکیوں رہے ہیں؟ اسے کوئی جواب نہ ملا، مکرر پوچھنے پر محمود نے جواب دیا۔ رونے کو کیا پوچھتی ہو کھوئے ہوئے زمانہ کی بے ثباتی پر ہاتھ مل رہا ہوں ـــ" اتنا کہہ کر اس نے جلدی سے تحریر تکیہ کے نیچے رکھی اور باہر مردانے مکان میں چلا گیا، زبیدہ پر جیسے بجلی سی گر پڑی ہو، وہ شوہر کے غمناک معمہ کو حل کرنے میں اپنا جانکاہ غم فراموش کرگئی، پھر بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہونچی، اس نے یقین کر لیا کہ تحریر دیکھنے سے حقیقت حال معلوم ہوجائیگی، اس نے دو مرتبہ تکیہ تک ہاتھ بڑھایا اور کھینچ لیا، وہ دل ہی میں کہتی رہی کہ بلا اجازت انکی تحریر دیکھنا خیانت ہے اور خائن ہونے سے یہی بہتر ہے کہ تکلیف برداشت کروں، تکلیفیں سہنا تو قسمت ہی میں لکھا کر آئی ہوں، وقت آئے گا اور حالات کو منکشف کردیگا۔

صبح کو محمود کی پُر اسرار موت پر شاہ آباد میں ہلچل پڑگئی، رونا پیٹنا تو ایسے موقع پر ہوا ہی کرتا ہے، زیادہ لوگ اسباب موت پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے مگر کسی سربستہ راز کا انکشاف کیسے ممکن تھا، زبیدہ نے اس قیامت خیز خبر کو سنتے ہی سب سے پہلے خلوت کا دروازہ بند کیا اور اسوقت کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شوہر کا خط پڑھنا شروع کیا، شدت گریہ اور اشکوں کے تسلسل میں کسی تحریر کو پڑھ لینا کچھ آسان نہ تھا وہ بار بار آنسو پونچھتی جاتی تھی اور ایک ایک لفظ پڑھ رہی تھی :- بیشک ـــ میں نے ـــ تم سے ـــ درشت برتاؤ کیا ـــ اسلئے ـــ کہ میری غلط کاریوں ـــ کے نتیجے نے میرے ـــ دل ـــ و دماغ کے توازن کو قائم ـــ نہیں ـــ رکھا تھا ـــ

اسلئے کہ ـــ میں اپنی حماقتوں ـــ کا خمیازہ ـــ بھگت رہا ـــ تھا ـــ اور اسلئے کہ میری ـــ زندگی ـــ اور ـــ اسکی ـــ تمام ـــ دلفریبیاں مجھے کاٹے ـــ کھاتی تھیں ـــ ایسی ـــ صورت میں ـــ میری کل فروگزاشتیں ـــ قابل ـــ معافی ـــ ہیں ـــ مجھے شادی سے قبل ـــ اپنی خود تباہ کی ہوئی ـــ قوتوں کا ـــ اندازہ نہ تھا ـــ اور ـــ اس کے بعد عرصہ تک ـــ توقع تھی ـــ کہ میں گزرا ہوا وقت ـــ واپس لاؤں گا ـــ قوتوں کو بحال کروں گا ـــ زندوں میں شامل ہوجاؤں گا ـــ اور تم ایسی ـــ رفیقۂ حیات ـــ اور فرشتہ صفت ـــ بیوی کی زندگی کو ـــ بربادیوں سے ـــ بچالونگا ـــ مگر افسوس ـــ صد افسوس ـــ ایسا نہیں ہوا ـــ امیدیں منقطع ہوگئیں ـــ اب موت سے بدتر زندگی پر ـــ موت کو ترجیح دینے کے لئے ـــ مجبور ہوں ـــ

زبیدہ نے سینہ زور سے کوٹ کر کہا :- آہ میرے خدا! وہ مجبور تھے، اس قدر مجبور ـــ کاش وہ مجھ سے ظاہر کرتے اور میں تسلی دے کر انھیں زندہ رہنے پر رضامند کرلیتی ـــ میں نے بانجھ ہونے کا الزام گوارا کیا ـــ اب میں ان کے خط کو احتیاط کے ساتھ پوشیدہ رکھوں گی۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن نکتہ چینیاں برداشت کرتی رہوں گی اور انھیں خود کردہ غلط کاریوں کی ذلتوں سے بچاؤں گی۔

حکیم عارف ـــ بلگرامی

باقیات فانی

(عطیہ حضرت فانی بدایونی)

بیخودی پہ تھا فانی کچھ نہ اختیار اپنا		عمر بھر کیا ناحق ہم نے انتظار اپنا
تاب ضبطِ غم نے بھی دیدیا جواب آخر		انکے دل سے اٹھتا ہے آج اعتبار اپنا
عشق زندگی ٹھیرا لیکن اب یہ مشکل ہے		زندگی سے ہوتا ہے عہد استوار اپنا
غم ہی جی کا دشمن تھا غم سے دور رہتے تھے		غم ہی رہ گیا آخر ایک غمگسار اپنا
لے گیا چمن کو بھی موسم بہار آکر		اب قفس کا گوشہ ہے حاصل بہار اپنا
جھوٹ ہی سہی وعدہ کیوں یقیں نہ کر لیتے		بات دلفریب انکی دل امیدوار اپنا
انقلابِ عالم میں ورنہ دیر ہی کیا تھی		انکے آستان تک تھا خیر سے غبار اپنا

دل ہے مضطرب فانی آنکھ محو حیرت ہے
دل نے دیدیا شاید آنکھ کو قرار اپنا

خاص

ایک علمی حقیقت کا انکشاف

(از حضرت خیر بہوروی)

"چوہے نامہ" بلی نامہ" اردو کی ایک مصور مثنوی ہے جو ہندوستان کے مختلف ادبی پریسوں میں متعدد بار چھپ چکی ہے لیکن اس حقیقت کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ اس مثنوی کا اصل مالک ایران کا ایک نامور شاعر "زاکانی" ہے جس نے فارسی زبان میں "موش و گربہ" کے نام سے اس کی ابتدا کی ہے۔ اصل مثنوی جو کسی ایرانی خوشنویس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے میرے قلمی ذخیرے میں محفوظ ہے۔ بے موقع نہ ہوگا اگر اسی سلسلے میں "مثنوی موش و گربہ" کے اصل مصنف اور مالک نظام الدین عبید اللہ المخاطب بہ عبید زاکانی کے متعلق چند سرسری اشارات کر دوں۔ عبید اپنے وقت کا امام تھا اور اس کا شمار اس دور کے مشاہیر شعرا میں کیا جاتا تھا۔ جن تذکرہ نویسوں نے عبید کو ہزل نگاران عجم کا پیشوا مانا ہے میں ان سے متفق نہیں ہوں۔

کیونکہ انھوں نے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ سوسائٹی کے اثرات سے متاثر ہونے پر اس نے یہ رنگ اختیار کیا۔

عبید جس دور کا شاعر ہے تاریخ کی زبان میں یہ وہ دور تھا جب ایران میں ترک برسر اقتدار تھے اور کوئی اخلاقی عیب ایسا نہیں تھا جو ان میں نہ پایا جاتا ہو۔ دربار کا رنگ یہ تھا کہ متانت و سنجیدگی کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔

رنگین مزاج امرا کے دربار میں سب سے زیادہ قابل عزت وہ خیال کیا جاتا تھا جو مسخرگی کی گوناں گوں کمالات کی نمائش کر سکے۔

سوسائٹی کے اسی رنگ نے عبید جیسے سر آمد فضلائے روزگار کو دعوت دی کہ وہ علم و حکمت کی قبا کو اتار کر پھینک دے اور ان لوگوں میں شامل ہو جائے جو بھانڈ اور مسخرے بن کر امرا کی روٹیوں پر تہذیب و متانت کی قربانیاں کر رہے ہیں۔

عبید اپنی مثنوی کا آغاز کرتے ہوئے بلی کا سراپا یوں بیان کرتا ہے۔

از قضائے فلک یکے گربہ (۱) بود چوں اژدہا بکرمانا　　گربۂ دوربین و شیر شکار (۲) کہرباچشم و تیز مژگانا

پاسے کژدم عقاب پیشانی (۳) بود پر مکر در یہ زورستانا　　شکمش طبل و سینہ اش قاقم (۴) ابرویش قوس و تیز دندانا

اردو شاعر بلی کا سراپا یوں کھینچتا ہے۔

رقم ہے کہ اک گربۂ پرفتن (۱) فسوں ساز حیلہ گر و راہ زن　　اسے یاد تھیں خوب عیاریاں (۲) سکھاتی تھی روبہ کو مکاریاں

وہ بلی تھی اک آفت روزگار (۳) کہ شیر نیستاں تھا جس کا شکار　　دم رزم دیکھے جو سوئے پلنگ (۴) تو ہو عرصہ زندگی اس پہ تنگ

مقابل جو ہو شیر بہر جدال　　یہ جنگل سے اس کے آنکھیں نکال

عبید بلی کا سراپا کھینچنے کے بعد لکھتا ہے کہ ایک دن جب اس باکمال بلی کو بھوک کی شدت نے نڈھال کر دیا تو وہ ایک

شراب خانے میں پہونچی اور ایک خُم کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی۔ کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ ایک موٹا تازہ چوہا آیا اور خُم پر چڑھ گیا اور شراب پینے لگا۔ شراب تیز تھی فوراً ہی بدمست ہو گیا اور کہنے لگا۔

گفت کو گربہ تا سرش بکنم (۱) سر اورا برم بہ میدانا
گربہ در پیش من چو سگ باشد (۲) گر شود روبرو بہ میدانا

اردو شاعر کہتا ہے :-

گئی ایکدن میکدہ میں وہ گربہ (۱) بخوبی ہوا صورت اکل و شرب
بہ امید صید آگے زیر سبو (۲) رہی بیٹھ وہ گربہ سیاہ رو
اوچک پڑا اپنے سوراخ سے ناگہاں (۳) سر خم پہ آیا بتاب و تواں
بھری تھی جو اس میں مئے ارغواں (۴) لگا پینے چوہا بصد لطف جاں
ہوا مست چوہا جو پی کر شراب (۵) لگا دل میں کہنے بذوق کباب
نہیں گربہ و سگ کی ہے یہ مجال (۶) کریں سامنے میرے کچھ قیل و قال

عبید کہتا ہے کہ بلی تھوڑی دیر تک تو چوہے کی یہ لنترانیاں سنتی رہی پھر کود کر چوہے کو دبوچ بیٹھی۔

ناگہاں جست و موش را بگرفت — گفت موشک کجا بری جانا
یہ سن کر رہی پھر نہ بلی کو تاب — دبا بیٹھی اسکو بصد آب و تاب

چوہے کا نشہ ہرن ہو گیا۔ عاجزانہ لہجہ میں کہنے لگا میں سرکار کا پرانا غلام ہوں۔ قصور معاف فرمایا جائے۔ مستی میں گستاخانہ باتیں منھ سے نکل گئیں

موش گفتا کہ من غلام توام (۱) عفو کن بر من ایں گناہانا
مست بودم اگر گہے خوردم (۲) کہ فراواں خورند مستانا
من غلامم غلام حلقہ بگوش (۳) خوف برگردنم غلامانہ

جو چوہا میاں دہن ہو گیا — تو پھر نشہ سے ہرن ہو گیا
کہا تب چوہے نے اے نیکنام — مجھے چھوڑ دے میں ہوں تیرا غلام

لیکن بلی نے چوہے کی ان عاجزانہ التجاؤں پر کوئی توجہ نہیں کی اور چٹ کر گئی اور اس خون ناحق سے پشیمان ہو کر مسجد میں پہونچی تاکہ مکر و فریب کی گرہ کو اور مضبوط کر سکے۔

گربہ آں موش را بکشت و بخورد (۱) سوئے مسجد بشد خرامانا
دست و رو را بشست و مسح کشید (۲) ورد حق را بخواند دو بانا
بارالہا کہ توبہ کردم من (۳) ندرم موش را بدندانا
گربہ می کرد توبہ در مسجد (۴) یا کریم و قدیم و سبحانا
کار من توبہ است و استغفار (۵) اے خداوندگار رحمانا
بہر ایں خون ناحق اے خلاق (۶) من تصدق دہم دو من دانا
تو ببخشی گناہم اے غفار (۷) از گنہ گشتہ ام پشیمانا
در مکر و فریب باز نمود (۸) تابحدے کہ گشت گریانا

لہو پونچھ کر منھ سے اور کر وضو — وہ مسجد کے اندر گئی سیاہ رو
خدا کی طرف کرکے دل کو رجوع — وظیفہ کیا مکر کا پھر شروع
تو غفار ہے میں گنہگار ہوں — ترے رحم کا اب طلبگار ہوں
ترا نام ستار غفار ہے — مرا نام عاصی گنہگار ہے
ہوئی ہے جو مجھ سے خطا اے کریم — مجھے بخش دے اے غفور رحیم
الٰہی مری بخش دے یہ خطا — دو من غلہ دیتی ہوں میں خونبہا
جناب خدا میں بہ مکر و دغا — اٹھا ہاتھ یہ کر رہی تھی دعا

:- بلی کی اس گریہ و زاری نے ایک بھولے بھالے چوہے کو جو مسجد میں منبر کے نیچے چھپا ہوا تھا یقین دلا دیا کہ بلی اب تائب ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اسی وقت اپنی برادری میں یہ خبر پہنچا دی

کہ بلی ہوئی عابد و پارسا   وہ سن کر لگے کہنے اے کبریا
زاہد و مومن و مسلمانا   مژدگانے کہ گربہ عابد شد

اس خبر کو سنکر برادری کے بڑے بوڑھوں نے فیصلہ کیا کہ سات چوہوں کا ایک وفد شراب بھنے گوشت مٹھائی میوہ خشک و تر اور شربت کے تحفے لیکر بلی کی خدمت میں جائے اور اسکی اس تبدیلی روش پر اظہار مسرت کرے۔ بلی مسجد میں بھگت بنی بیٹھی ہوئی تھی اور آمین وفد آئے تو اس نے پرفریب لہجے میں ان کو اپنے پاس بلایا لیکن وہ جیوں ہی قریب آئے جست کرکے ان تو دبوچ بیٹھی دو چوہے بچ کر بھاگے اور اپنی کونسل میں پہونچے اور تمام سرگزشت بیان کی کئی دنوں تک تمام برادری میں صف ماتم بچھی رہی بالآخر چوہوں کے ایک لشکر جرار نے بلیوں پر حملہ کیا اور اس بلی کو گرفتار کرکے اپنے بادشاہ کے پاس لائے جو ارکان وفد کو کر وغیرہ سے کھا گئی تھی - بادشاہ نے سولی کا حکم سنایا لیکن وہ بچ گئی اور اس نے چوہوں پر حملہ شروع کر دیا -

عبید اپنی مثنوی اس شعر پر ختم کرتا ہے :- بست این قصہ عجیب و غریب ؛ یادگار عبید زاکانا

افسوس ہے فارسی تذکرہ نویسوں نے عبید پر بہت کم توجہ کی ہے - ورنہ دوسرے فارسی شعرا کی طرح آج وہ بھی ہماری زبانوں پر ہوتا - اردو کے شاعر صاحب نعمت خان نے اسکی مثنوی کا ترجمہ اتارا ہے انھوں نے بھی اس پر ظلم کیا کہ اس غریب کا تعارف نہ کرایا - عبید کا وہ کلام جو ہزلیات سے الگ ہے - عزت سے دیکھے جانے کے قابل ہے - لیکن چونکہ ہمارا فارسی ذوق دن دن مردہ ہوتا جا رہا ہے اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ اسکی طرف توجہ کرنا محمود نہیں سمجھتا - حالانکہ اس عدم توجہی کا نتیجہ ہماری ادبی تباہی کی صورت میں رونما ہو رہا ہے -

ایرانی لٹریچر پر مستشرق شبلی کے بعد بہت کم لوگوں نے توجہ کی - اور تحقیق و مطالعہ تو بڑی چیز ہے سرسری اشارات کی بھی زحمت گوارا برداشت نہیں کی ورنہ ایک کافی ذخیرہ اردو زبان میں فارسی ادبیات کا داخل ہو جاتا - ایرانی لٹریچر کا دور جدید ابتک محروم توجہ ہے - اور قوم کا وہ قابل عزت طبقہ جو قوم اور ملک کا وارث کہلاتا ہے اور جس سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اپنی مادری زبان سے غافل ہو کر اپنی قیمتی راتیں اور کار آمد دنوں کو ایک ایسی زبان کے حاصل کرنے میں ضائع کر رہا ہے جو نہ اس کے لئے مفید ہے نہ ملک اور قوم کے لئے -

مشرق کا شاعر خیام "مغرب" کے ہاتھوں جی رہا ہے "ادبیات ایران" پر انگریز مصنفین کا قبضہ ہے - مصری لٹریچر غیروں کی بدولت آبرو دار ہے - اس سے بڑھ کر ہماری ادبی پستی اور کیا ہو سکتی ہے :- "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کہنے والے شاید اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ مسلم کا صرف وطن ہی سارا جہاں نہیں ہے بلکہ وہ سارے جہان کے علوم و فنون کا بھی مالک ہے -

علامہ اقبال کا فارسی ذوق کسی ایرانی سے دب کر نہیں ہے لیکن اس کی حیثیت بھی مستشرقانہ نہیں ہے - ہر چند کہ قوم کے ادبی افلاس کی گذارش ان سے یہی ہے -

بات کہاں سے کہاں پہونچی کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عبید زاکانی بھی ہماری توجہ کا مستحق ہے اور ایک بدیسی مورخ کے قلمی احسان کی بدولت خاص خاص حلقوں میں جی رہا ہے - اس لئے ضرورت ہے کہ اس غریب شاعر کے کمالات علمی اور ادبی کو اجاگر کیا جائے - اس کے لئے میرے نزدیک مولانا سید سلیمان ندوی کا قلم زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے -

عبید کی ایک تصنیف "اخلاق الاشراف" کا ترجمہ اس زہر کے لئے تریاق کا حکم رکھتا ہے اگر ہو جائے -

عجمی شاعروں میں حکیم شاعر جس نے زندگی کے ہر شعبہ پر محققانہ نظر ڈالی ہے صرف عبید زاکانی ہے - افسوس ہے کہ زمانہ نے اس کی وہ قدر دانی نہیں کی جس کا وہ اپنے کمالات کی بنا پر مستحق تھا - تذکرہ نویس متفق ہیں کہ اس کی ساری عمر بھانڈوں اور مسخروں کی صف میں اول رہنے کے باوجود بھی مفلسی ہی کی شکار رہی - یہاں تک سنہ ۱۳۷۱ء میں اس نے دنیا کو اسی بے سروسامانی کی حالت میں الوداع کہی -

نیند اور خواب

از جناب سید عبد الحلیم بی اے (عثمانیہ)

اس موضوع پر نہ صرف زمانہ حال میں بلکہ قدیم زمانہ میں بھی بہت کچھ بحث کیجا چکی ہے۔ ہر فن اور ہر شعبہ کے ماہرین اس پر خیال آرائی کرتے ہیں۔ ایک طرف شعرا کا طبقہ ہے جن کی راتیں تڑپ تڑپ کر گذرتی ہیں۔ دوسری طرف مزدور ہیں کہ دن بھر محنت کی شام کو زہر مار کیا اور سکھ کی نیند سو گئے، تیسرا طبقہ ان ماہرین نفسیات کا ہے جو اپنی عقلی کد و کاوش سے کسی بات کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں گو زمانہ موجودہ میں اس کی سائنٹیفک تحقیقات ضرور ہوئیں لیکن اس کی اصل بنیاد ابھی تک تاریکی میں ہے ہم اپنی زندگی کا تقریباً ایک ثلث حصہ نیند میں بسر کرتے ہیں۔ اس میں نظام اعصاب کی وہ فضیلت بھی داخل ہے جس کے ساتھ شعور نہیں ہوتا۔ نیند کی ضرورت غالباً اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ دماغی خلایا کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور توانائی حاصل کرنے کے لئے ان کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح دن کے بعد رات ضروری ہے اسی طرح دماغی خلایا کے لئے تھکاوٹ کے بعد آرام لابدی ہے جسمانی حرکات اور ذہنی افعال اس وقت تک ٹھیک ٹھیک صادر نہیں ہوتے جب تک ان کو کافی آرام نہ دیا جائے اور اسی تھکاوٹ کا نتیجہ نیند کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ انسان تنفس کے بغیر چند لمحہ زندہ رہ سکتا ہے۔ پانی کے بغیر چند دن گذار سکتا ہے اور تقریباً ایک مہینہ بغیر غذا کے بھی رہ سکتا ہے لیکن نیند کے بغیر ایک ہفتہ بھی زندہ رہنا مشکل ہے۔ نیند نہ صرف تھکاوٹ کو دور کرتی ہے بلکہ وہ ہماری بقائے حیات کی شرائط کے منجملہ ایک لازمی شرط ہے جس طرح بغیر کنجی کے گھڑی نہیں چل سکتی اسی طرح انسان بھی بغیر نیند کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر نیند صرف تھکاوٹ ہی کو دور کرنے کے لئے ضروری ہوتی تو ہر شخص اپنی تھکاوٹ کے لحاظ سے آرام کرتا لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ایک معمولی انسان بیکار اوقات میں بھی اتنا ہی سوتا ہے جتنا محنت کرنے کے بعد بلکہ ایک محنتی شخص بیکار آدمی سے کم ہی سوتا ہے لہذا یہ عام نظریہ کہ تھکا ہوا آدمی زیادہ سوتا ہے صحیح نہیں ہے۔ اگر ہم ان تمام اشیا کو جو جذبات کو مشتعل کرتی ہیں دور کر دیں اپنے جسم کو ایک حالت پر رکھیں۔ روشنی کی شعاعوں کو کمرہ میں آنے سے روک دیں۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں اور شور و شغب سے دور ہو جائیں تو اس حالت کی یکسانیت بھی ہم میں ایک غنودگی پیدا کردے گی اور ہم تقریباً سو جائیں گے۔ ہم کسی نہ کسی جذبہ کی وجہ سے جاگتے رہتے ہیں۔ اگر یہ جذبہ دور کر دیا جائے تو خود بخود نیند کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔

کسی یکساں آواز پر اگر دیر تک توجہ کیجائے تو وہ بھی نیند کا باعث ہو سکتی ہے۔ مثلاً ریل کے ڈبوں کی آواز۔

گرجا کی عبادت یا ایک غیر دلچسپ لکچر۔ اگر یہ یکسانیت ختم ہو جائے تو نیند بھی اچاٹ ہو جاتی ہے مثلاً سفر میں اس کا بارہا تجربہ ہوتا ہے کہ ٹرین جب تک چلتی رہتی ہے اسوقت تک ہم بھی سوتے رہتے ہیں لیکن اس کے رک جانے سے ہم جاگ اُٹھتے ہیں۔

نیند کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم میں کسی چیز کے متعلق دلچسپی باقی نہ رہے لیکن اگر دلچسپی بھی شدید ہے تو نیم خوابی کی حالت طاری ہو جاتی ہے اسی لئے اگر کوئی عورت اپنے بچے کے پاس سو رہی ہو تو ممکن ہے وہ طوفان کی آواز سے نہ جاگے لیکن بچہ کی ذراسی سسکی اس کو جگانے کے لئے کافی ہے اسی طریقہ سے گو ایک ڈاکٹر ٹیلیفون کی گھنٹی سے نہ اٹھے لیکن نشتر کی آواز پر فوراً چوکنا ہو جاتا ہے نیند کی حالت میں دماغ سے خون قلیل مقدار میں تقسیم ہوتا ہے اور اگر اس دوران خون میں کسی وجہ سے زیادتی ہو جائے تو انسان فوراً جاگ اٹھتا ہے۔

چنانچہ شریانوں کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس کی فعلیت میں اس وقت زیادتی ہو جاتی ہے جب انسان جاگتا رہتا ہے گو انسان کے سونے کی حالت میں کوئی خاص ذہنی یا جسمانی وظیفہ نہیں معلوم کیا جا سکتا لیکن نیند کی حالت میں تمام عضلات کی فعلیت میں کمی آجاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ دل کی دھڑکن ضعیف ہو جاتی ہے۔ تنفس میں سستی پیدا ہو جاتی ہے اور آکسیجن کی مقدار جو ایک معمولی انسان جاگنے کے وقت حاصل کرتا ہے ½ رہ جاتی ہے۔ دوسرے حالات کا مشاہدہ بھی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اکثر آدمی پانچ گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے لیکن بعض ۷ گھنٹے سوتے ہیں اور ۹ گھنٹے سونے والے بھی موجود ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ ایک تندرست اور بالغ شخص کے لئے ۷ گھنٹے سونا کافی ہے نیند کا انحصار زیادہ تر پیشہ اور عادت پر منحصر ہے لیکن یہاں بھی اچھی اور بری دونوں عادات پائی جاتی ہیں۔ زیادہ سونے والے اشخاص وہی ہیں جو یا تو بے کار رہتے ہیں یا ذہنی کام کم کرتے ہیں ایسے اشخاص کی صحت اسی وقت اچھی رہ سکتی ہے جبکہ وہ حفظان صحت کے اصول کی پابندی کریں۔

نیند میں عمر کو بہت دخل ہے۔ بچے زیادہ تر اپنا وقت سونے میں گذارتے ہیں جوں جوں وہ بڑھتے جاتے ہیں نیند کی زیادتی میں کمی بھی آتی جاتی ضعیفی میں نیند زیادہ آتی ہے سونے کی حالت کے لحاظ سے بھی نیند میں فرق پیدا ہو جاتا ہے یعنی ایسا شخص جو خوب گہری اور اطمینان کی نیند سوتا ہے ایسے شخص سے جو اطمینان سے نہیں سوتا کم سوئے گا۔ نیند کے پہلے دو گھنٹے بہت آرام دہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے شروع کا وقت خوشگوار ہوتا ہے۔ عورتیں صرف مردوں سے زیادہ ہی نہیں سوتیں بلکہ ان کو زیادہ سونے کی ضرورت بھی ہے اس کی وجہ نظام اعصاب کے اختلاف پر مبنی ہے۔

عورتوں کی نیند گو آرام دہ ہے مگر کم گہری ہوتی ہے۔ عورتوں کو زیادہ بدخوابی کی بھی شکایت نہیں ہوتی۔ کیونکہ عموماً ان کے تفکرات نسبتاً کم ہوتے ہیں۔ بدخوابی کی شکایت اکثر اختلاف آب و ہوا سے بھی پیدا ہو جاتی ہے خصوصاً شمالی حصص کی آب و ہوا۔ سمندر کی قربت یا کسی دوسرے کے بستر پر لیٹ جانے سے بھی یہ شکایت ظہور پذیر ہوتی ہے

اگر کھانا وقت پر نہ کھایا جائے۔ سونے کے پیشتر کوئی ایسی چیز چھوٹ جائے جس کی عادت ہے مثلاً دودھ وغیرہ تو اس سے بھی اس شکایت کے پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ سونے سے پیشتر صرف اتنی غذا کھانا چاہیے جو اچھی طرح تحلیل ہو سکے تو نیند آرام دہ اور زیادہ آتی ہے گو نیند کی حالت میں خواب کا نظر آنا ضروری نہیں ہے مگر خیالات کی پراگندگی کی وجہ سے آرام دہ نیند میں بھی خواب نظر آسکتے ہیں۔ اگر بہت زیادہ بدخوابی ہوتی ہے یا ڈراؤنے خواب نظر آتے ہوں تو یہ صحت کی خرابی کی علامت ہے اور اس کا علاج کرانا چاہیئے۔ اکثر اوقات افکار کا ہجوم رہتا ہے۔ لیٹنے سے پہلے ایک بے چینی سی محسوس ہوتی ہے اور سونے کے بعد یہی بدخوابی کی حالت پیدا کرتی ہے۔ خصوصاً زمانہ موجودہ میں جبکہ تمام ممالک ترقی کر رہے ہیں اور لین دین کے معاملات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دماغی کام بھی بہت ہو گئے ہیں لہذا عام طور پر اگر بدخوابی کی شکایت پیدا ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ حساس طبائع رکھنے والوں پر بستر کے رخ کا بھی اثر ہوتا ہے مثلاً کوئی شمال کی طرف سونے کا عادی ہے تو کوئی جنوب کو پسند کرتا ہے۔ اس کی وجہ خود جسم کی قوت جاذبہ ہے لیکن ہم صحت و تیقن کے ساتھ جسم کی قوت جاذبہ کو نہیں جان سکتے۔ گو یہ صحیح ہے کہ جسم ترقی منتقل کرتا ہے۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ جسم کو زمین کے متوازی رکھنا چاہیئے۔ بعض اس کے برعکس بتلاتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ زاویہ قائمہ بنانا چاہیئے یعنی مغرب یا مشرق کی طرف جسم ہونا چاہیئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب عادت پر موقوف ہے۔

بعض اوقات بستر کی جگہ تبدیل کرنے سے نیند آجاتی ہے اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ اس طرف ہوا کا رخ زیادہ ہو یا کوئی کھڑکی بستر سے قریب ہو گئی ہو۔ ان خیالات کے صحت کی تصدیق تو نہیں ہو سکتی البتہ سونے کے وقت جسم کی حالت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

دماغی ساخت کا اثر دماغ میں مختلف خلایا اور ریشے ہوتے ہیں جو جاگنے کی حالت میں اپنی فعلیت جاری رکھتے۔ ریشوں کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک رقبہ کو دوسرے رقبہ سے متعلق کرتے ہیں اور تموج کو ادھر ادھر دوڑاتے ہیں۔ سونے کی حالت میں یہ اپنی فعلیت چھوڑ دیتے ہیں اور دماغ کورا ہو جاتا ہے۔

اگر کسی وجہ سے مثلاً دماغی غور و خوض یا کسی ہیجان حرکت جس سے ایک بے چینی محسوس ہوتی رہے۔ خلایا کا ایک مجموعہ اپنی فعلیت جاری رکھے اور ریشے اپنا وظیفہ جاری رکھیں تو اس سے یا تو نیند اچاٹ ہو جائے گی یا خواب نظر آئیں گے ان خوابوں میں نہ تو کوئی ترتیب ہوگی نہ کوئی نتیجہ۔ کیونکہ دماغ کے صرف ایک حصہ کی فعلیت جاری ہے اور دوسرا حصہ ساکن رہتا ہے جس سے دماغ کے تمام حصص میں تعلق قائم نہیں رہتا اور بے ترتیبی و انتشار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے عموماً ہم خواب سے جاگنے سے قبل ہی بھول جاتے ہیں یا ان کی تفصیل ذہن سے نکل جاتی ہے اور صرف وہی خواب یاد رہتے ہیں جو نیم خوابی کی حالت میں نظر آئے ہوں۔ اسی وجہ سے ہمارے اکثر خواب نامکمل رہ جاتے ہیں۔ اکثر ہم ایسے وقت جاگ اٹھتے ہیں جبکہ خواب بیحد دلچسپ ہو گیا ہو یا ہم کسی نازک لمحہ پر پہونچ گئے ہوں اور نتیجہ کا انتظار ہو گو دماغ سونے کے وقت

اپنی فعلیت اس تیزی کے ساتھ جاری نہیں رکھتا اگر خارجی وقت سے کلیتہً بے خبر بھی نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص سونے سے پہلے یہ تہیہ کرلیتا ہے کہ میں فلاں وقت اٹھونگا اور وہ اس وقت اٹھ بیٹھتا ہے اکثر خواب خیالات کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد آواز کا نمبر ہے چکھنے اور سونگھنے کے خواب کم نظر آتے ہیں ایک شخص ایک باغ کا خواب دیکھ سکتا ہے اور وہاں کے پھولوں کی خوشبو کا احساس نہ ہو۔ ایک شخص ایک دعوت کا خواب دیکھ سکتا ہے جہاں مرغن غذائیں چنی ہوئی ہوں لیکن یہ شاذ ہی ہوتا ہے کہ وہ ان کے ذائقہ کو بھی محسوس کرے۔

خواب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ہم خواب کی ہر شے کو بغیر کسی ثبوت کے مان لیتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی مہمل اور لغو کیوں نہ ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ سونے میں ہم اپنے حواس خمسہ سے کام نہیں لیتے۔ یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ سونے میں ہم اپنی شخصیت کو گم نہیں کرتے۔ ایک شخص اپنے کو وائسرائے بنتے ہوئے دیکھ سکتا ہے مگر اپنی شخصیت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

خواب اکثر خارجی حالات کیوجہ سے بھی نظر آتے۔ مثلاً جسم آوارہ حالت میں نہ ہو۔ شور ہو رہا ہو۔ خیرہ کن روشنی ہو۔ جاڑوں میں جسم کا کوئی حصہ سرد ہو جائے اندرونی علامات بھی ہوسکتی ہیں مثلاً بھوک۔ پیاس یا کوئی اور تکلیف ہو۔ ایسے خواب جو تنفس کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوں عموماً ڈراؤنے ہوتے ہیں مثلاً ڈاکوؤں اور لٹیروں میں اپنے کو گھرا ہوا دیکھنا اور بے دست و پا ہو جانا۔ بیماری کی حالت میں جو ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں وہ اکثر دماغ میں زہر سرایت کرجانے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اگر پیٹ ضرورت سے زیادہ بھرا ہو تو کابوس (NIGHT MARE) سے سابقہ پڑتا ہے۔

یہ شاذ ہی ہوتا ہے کہ ہم خواب میں بجنسہ ایسے واقعات دیکھیں جن کا ہم کو بیداری میں تجربہ ہوچکا ہے خواب اکثر دوسرے خیالات سے مرکب ہو جاتے ہیں۔ اگر سونے کی حالت میں تیز روشنی ہمارے چہرہ پر ڈالی جائے تو بہت ممکن ہے کہ ہم اس روشنی کو چاندنی تصور کرلیں کہ وہ کسی تالاب یا جھیل پر پڑ رہی ہے۔ یا آگ کا بھی احساس اس سے پیدا ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی تیز آواز کیجائے تو یہ بادل کی گرج اور رعد کی کڑک میں تبدیل ہوسکتی ہے۔

انقلاب

(از جناب مظفر صاحب گیلانی ایم اے پٹنہ کالج)

دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ آٹھ برس کی طویل مدت میں دنیا میں صدہا انقلابات ہوئے، لاکھوں گھر تباہ اور برباد ہوئے ہزاروں نئے نئے مکانات اور کوٹھیاں بن گئیں، بچے جوان ہوگئے، بوڑھوں نے دنیا کی کلفتوں سے تنگ آکر ہمیشہ کے لئے اس کو خیر باد کہہ دیا۔

احمد اور سلمیٰ بھی آخر اسی دنیا کے رہنے والے تھے، انقلاب دہر سے کیونکر بچے رہتے، نہ وہ اب لڑکپن کی شرارتیں تھیں نہ ان کی معصومانہ چھیڑ چھاڑ، احمد سلمیٰ کو کتنا تنگ کیا کرتا تھا، بیچاری ہمیشہ اس سے عاجز رہا کرتی۔ لیکن پھر بھی دونوں بچوں میں بے انتہا محبت تھی۔ ایک پاک محبت دونوں کے دلوں میں موجزن تھی، آج تک ایسا نہ ہوا کہ احمد نے کوئی چیز بغیر سلمیٰ کو کھلائے ہوئے کھائی ہو اور سلمیٰ کی بھی بس یہی حالت تھی، لوگ دیکھتے اور ان کی محبت پر رشک کرتے۔ لیکن اب .... اب ان کی دنیا بدل چکی تھی، نہ وہ پہلی سی بے تکلفی تھی اور نہ وہ میل جول، وہ سماج کے قانون میں جکڑے ہوئے تھے، دنیا کی آنکھیں اب ان پر پڑ رہی تھیں لیکن ان کی پاک محبت میں ذرا بھی کمی واقع نہ ہوئی۔

احمد اب اپنی زندگی کی سولہویں منزل طے کر رہا تھا اور مدرسے سے فارغ ہو کر انٹرنس میں پڑھتا تھا، سلمیٰ بھی اب جوان ہو چکی تھی اور اپنی زندگی کی چودھویں بہار دیکھ رہی تھی، اس نے بھی اب مدرسہ جانا ترک کر دیا کیونکہ کافی تعلیم جو عورتوں کے لئے ضروری ہے اس نے حاصل کر لی تھی اور اب دن رات گھر کے کاموں میں مشغول رہا کرتی۔

گرچہ سلمیٰ کے والد بہت ہی ضعیف تھے اور احمد کے والد بھی گویا جوان ہی تھے لیکن ہمسایہ ہونے کی بنا پر دونوں میں بہت ہی گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ احمد سے کسی قسم کا پردہ نہ تھا، وہ بے دھڑک سلمیٰ کے گھر جاتا اور اکثر اپنی شرارتوں سے تنگ کیا کرتا تھا، کبھی اس غریب کی گڑیا چرا کر لے آتا اور بہت ہی منت خوشامد کے بعد دیتا، کبھی اس پر پانی انڈیل کر بھاگ جاتا۔ غرض کہ دونوں بغیر کسی رکاوٹ کے ایک دوسرے سے ملتے رہے لیکن اب سلمیٰ شرم و حیا کی وجہ سے اس شوخی سے نہیں ملتی جس کی وہ پہلے عادی تھی۔

اسی طرح ایک برس کی اور مدت گذر گئی اور احمد نے فسٹ ہو کر انٹرنس پاس کیا، ہر طرف خوشیاں منائی جانے لگی۔ سلمیٰ کے والد نے احمد کو اس خوشی کے موقع پر بیش قیمت تحفے دئے، جس کو اس نے خوشی خوشی قبول کیا، سلمیٰ نے بھی اسکو ایک رومال جس پر اس نے اپنا اور احمد کا نام سرخ دھاگے سے نہایت خوبصورتی سے لکھا تھا پیش کیا۔ اسکو لیتے ہوئے احمد نے پہلی بار سلمیٰ کو غور سے دیکھا، سلمیٰ کی آنکھیں جھک گئیں، احمد کے دل کی دھڑکن نہ جانے کیوں تیز ہو گئی اور وہ بغیر شکریہ ادا کئے رومال لیکر چلا آیا اور بہت دیر تک اسکو دیکھتا رہا۔

کچھ دنوں کے بعد احمد کے کالج جانے کی تیاریاں ہونے لگیں نئے نئے کپڑے بنے، جوتے اور ٹوپیاں خریدی گئیں، احمد بہت ہی خوش تھا کہ بس اب تھوڑے ہی دنوں میں وہ کالج کا ایک ہونہار طالب علم ہوگا۔

احمد ایک روز اپنے والد کے پاس بیٹھا ہوا اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ سوالات کر رہا تھا کہ ڈاکئے نے ایک خط لاکر دیا، احمد کے والد نے اسکو کھول کر پڑھا، یہاں کے ایک دوست کا خط تھا، جس میں انھوں نے تذکرہ کیا تھا کہ ان کا بڑا لڑکا اعلیٰ تعلیم کیلئے اس مہینہ ولایت جارہا ہے۔ کیوں نہ احمد کو بھی ولایت بھیجدیا جائے، احمد کے والد نے دل میں خیال کیا "وہاں اسکی بہتر تعلیم ہو سکے گی"۔

"کیوں احمد! ولایت جاؤ گے؟" انھوں نے اسکو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا "تمھارے منصور بھی مہینہ ولایت جارہے ہیں"

"ضرور جاؤنگا" احمد نے خوش ہو کر کہا، "اچھا تو تیار ہو جاؤ" اس کے والد نے جواب دیا"

چنانچہ احمد کے ولایت جانے کی ٹھہری۔ اسکی والدہ نے سخت مخالفت کی لیکن احمد کے والد کے سامنے ایک نہ چلی اور مجبوراً اجازت دینا ہی پڑی اور اب احمد کے ولایت جانیکی تیاری ہونے لگیں، جاتے وقت اسکی والدہ نے اسکو بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور چند نصیحتیں کیں "دیکھو بیٹا!" یہ ان کی آخری نصیحت تھی "ولایت بہت ہی خراب جگہ ہے، ایسا نہ ہو کہ تم وہاں کی ہنگامہ آرائیوں میں شریک ہو کر اپنی زندگی برباد کر ڈالو" احمد نے ہنس کر جواب دیا "ایسا نہیں ہو سکتا"۔

وہ اپنے والد سے ملنے گیا، انھوں نے بھی نصیحتوں کا ایک دفتر کھولدیا جسکو احمد نے بہت ہی غور سے سنا اور عمل کرنے کا وعدہ کیا اسی وقت سلمیٰ کے والد بھی آگئے انھوں نے ولایت اور وہاں کی آزادانہ زندگی پر ایک زبردست لکچر دیا، جسکو احمد بغور سنتا رہا، پھر وہ احمد کو اپنے گھر لے گئے۔ ہر طرف سے عورتوں نے اس بچارے کو آکر گھیر لیا۔

"دیکھو بیٹا" سلمیٰ کی نانی اماں صاحبہ نے فرمایا "کرسٹان بنکر نہ آنا" نماز ضرور پڑھنا" ایک دوسری بوڑھی عورت نے کہا "اگر جو کوئی میم لیکر آئے تو خاندان کی عزت ہی خاک میں مل جائیگی" ایک تیسری عورت نے ارشاد فرمایا۔ غرض ہر شخص اپنی اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق اسکو نصیحت کر رہا تھا اور وہ خاموش سب کی سن رہا تھا۔

لوٹتے ہوئے احمد سلمیٰ کے کمرے میں بھی گیا، وہ خاموش ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی، اسکی آنکھیں نم تھیں گرچہ احمد سلمیٰ سے اکثر گفتگو کیا کرتا تھا لیکن اس وقت اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سلسلہ کلام کس طرح شروع کیا جائے۔

آخر وہ اپنی انتہائی کوشش کے بعد صرف اتنا کہہ سکا "سلمیٰ بھول نہ جانا"

سلمیٰ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر بولی "کیونکر بھول سکتی ہوں" "اچھا تم کو ..... تم کو اپنے ..... لڑکپن کا وعدہ بھی یاد ہے؟" احمد نے ڈرتے ہوئے پوچھا، سلمیٰ کچھ شرما گئی اور ایک عجیب پریشانی کے عالم میں نظریں نیچی کرلیں،

"خفا ہو گئیں؟" احمد نے کہا "نہیں" سلمیٰ نے جواب دیا۔

"تو پھر جواب کیوں نہیں دیتیں" احمد نے پوچھا"

چند سکنڈ کے بعد ایک ہلکی آواز سے کہا "ہاں" احمد نے سنا وہ خاموش ہو گیا۔

شام کی میل سے احمد بمبئی روانہ ہو گیا، وہاں منصور صاحب نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا، اسٹیشن پر احمد کے والدین اور ان کے دوستوں کی کثیر جماعت موجود تھی، احمد کے والد کی حالت عجیب تھی، وہ خوش بھی تھے اور مغموم بھی آخر انھوں نے

بہ سفر فتنت مبارک باد　　　بہ سلامت روی و باز آئی

کہتے ہوئے اپنے لخت جگر کو رخصت کیا۔

ولایت کی دلچسپیوں کا کیا کہنا، سینما، تھیٹر، ڈانس گھر اور پھر وہاں کی آزادانہ زندگی ایک نوجوان کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے بہت کافی ہیں، لیکن احمد ان سب چیزوں سے بچا رہا وہ دن رات وہاں کی عورتوں سے ملتا، ان سے گفتگو کرتا، کالج میں ساتھ پڑھتا، لیکن ان میں وہ تصنع اور بناوٹ کی ایسی جھلک پاتا، جس نے اس کو ان کی طرف سے متنفر کر دیا تھا، احمد ان کی رگ رگ میں بے وفائی صاف طور پر نمایاں پاتا، اس کا فلسفہ حسن بالکل الگ تھا، وہ ایک عورت میں نسائیت کی مکمل تصویر دیکھنے کا خواہشمند تھا اور یہی اس کے نزدیک حسن کا ایک اعلیٰ معیار تھا اگر عورت مردوں کی طرح بے حیا اور بے باک ہو جائے تو وہ عورت نہیں بلکہ اسکو "عورت نما مرد" کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور یہ نہ صرف عورتوں کی بلکہ حسن کی توہین ہے۔ اپنے والد کی یاد سلمیٰ کا تصور اور تعلیم کی مشغولیت ولایت کی ان ہنگامہ آرائیوں سے دور رکھنے کے لئے بہت کافی تھیں،

غرض احمد چار برس کی پاک زندگی ولایت میں بسر کرنے کے بعد آج خوش خوش گھر واپس آ رہا تھا، اس نے اپنے والد کو اپنی آمد کا تار بھی دیدیا تھا، راستے بھر اس کو طرح طرح کے خیالات ستاتے رہے، کیا سلمیٰ واقعی اپنے وعدہ پر قائم رہے گی، اس نے اپنے دل میں کہا" وہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے اس نے پھر خیال کیا" اسکو ضرور مجھ سے محبت ہے" اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس کے سامنے سلمیٰ کی تصویر موجود تھی، اور اس کے کانوں میں سلمیٰ کے الوداعی الفاظ گونج رہے تھے،

جہاز بمبئی کے بندرگاہ میں آکر رکا، وہاں اس کے والد مع چند دوستوں کے۔ پہلے ہی سے موجود تھے، وہ اپنے والد اور ان کے دوستوں سے نہایت تپاک سے ملا اور دیر تک گھر کے لوگوں کی خیریت دریافت کرتا رہا،

بمبئی آکر اس کو پہلی بار معلوم ہوا کہ اس کی والدہ کا اس کے ولایت جانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد انتقال ہو گیا تھا، اور اب اس کے والد نے دوسری شادی کر لی ہے، یہ خبر سنتے ہی اس کو سخت صدمہ ہوا اور وہ دیر تک روتا رہا اپنے والد کی دوسری شادی کا کوئی اسکو خاص افسوس نہ تھا، لیکن والدہ کی جدائی اس کے لئے جانگسل تھی۔

غرض وہ نہایت پژمردگی کے عالم میں گھر پہونچا، لوگ جوق جوق اس سے ملنے آئے، لیکن وہ کسی سے نہ ملا اور سیدھا حویلی چلا گیا، تاکہ وہ ان لوگوں کے سوالات سے بچ سکے، وہاں اس نے اپنے والد کو سلمیٰ سے ہنس ہنس کر گفتگو کرتے ہوئے دیکھا، وہ فوراً ہی سب حالات کی تہ تک پہونچ گیا۔

دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں اور پھر جھک گئیں۔ احمد ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا اور پھر کبھی نہ اٹھا۔

اردو زبان کے قدیم و جدید ناقدانِ ادب

(از جناب عطاء اللہ پالوی)

رسالہ شاہکار (گورکھپور) کے ستمبر نمبر ۱۹۳۷ء میں "ہمارے ناقد" کے عنوان سے ملاحظات کے تحت فن تنقید اور موجودہ دور کی تنقید نگاری کے متعلق جو کچھ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ صحیح ہیں البتہ اس جملے سے مجھے اتفاق نہیں کہ "اردو زبان میں اچھے ناقد ہیں نہ حقیقی تنقیدیں" کیونکہ ہماری زبان میں بفضلہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ ابھی حال میں اردو زبان کے مشہور تنقیدی رسالہ "ادب لطیف" (لاہور) کے لئے میں نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں "اردو زبان کی بلند پایہ تنقیدی کتابیں" کے عنوان سے اردو زبان کے تنقیدی ادب کی کل کتابوں پر اظہار خیال کی ناکام کوشش کی ہے۔ ارادہ تھا کہ آئندہ کسی فرصت میں موجودہ دور کے بلند پایہ تنقید نگار ادبا پر ایک سرسری نظر ڈال کر ان کی خصوصیات پر اظہار خیال کرونگا چنانچہ یہ دیکھ کر کہ "شاہکار" کا سالنامہ نکل رہا ہے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حسب ذیل سطور حاضر کر رہا ہوں۔ اس کے مکمل اور کامیاب ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں لیکن اپنے رنگ کا بالکل انوکھا اور اپنے عنوان کا سب سے پہلا مضمون ہونے کا خیال خام ضرور ہے اور وہ بھی اس لئے کہ ؎

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
(جمیل مظہری)

ورنہ میں کیا اور میرا مضمون کیا۔ فقط عطاء اللہ پالوی

"تنقید"[1] ایک ایسا لفظ ہے جس کا اطلاق ہر اس جگہ ہو سکتا ہے جہاں کسی چیز کے پرکھنے کا عمل کیا گیا ہو اور ناقد کا اطلاق ہر اس شخص پر ہو سکتا ہے جو کسی عنوان کے تحت کسی موضوع پر تنقیدی بحث یا ناقدانہ اظہار خیال کرے مگر اس صورت میں فن نقد کا دائرہ کس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ خود اس میں رطب و یابس کی شناخت مشکل اور ہر شخص کو "ناقد" کا خطاب دینا آسان معلوم ہوتا ہے درآنحالیکہ "نقد" اور "ناقد" کی خصوصیات و ذمہ داریاں بڑی کٹھن اور حد درجہ دشوار ہیں لہذا اس فن یا اس کے ماہرین کی جانچ پڑتال کیلئے اس کی

---

[1] لفظ "تنقید" اردو زبان میں ایک ایسا غلط لفظ ہے جسے ہر شخص قابل استعمال تو سمجھتا ہے لیکن اسکے غلط ہونے کا بھی ضرور اقرار کرتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اب تک اس لفظ کو استعمال کیا ہے انھوں نے اسکے غلط ہونے پر بھی بحث کی ہے میرا ارادہ تھا کہ میں سرے سے اس لغو حرکت کا مرتکب نہ ہونگا مگر کیا کیا جائے کہ آخر کار ضرورتاً اس حماقت کا ارتکاب کرنا ہی پڑے گا۔ عطاء اللہ

تمام خصوصیات مدنظر رکھنی ہوگی اور اس کے تمام قواعد و ضوابط کو پیش نظر رکھ کر عمل پیرا ہونا ہوگا۔

اردو زبان میں فن نقد کے متعلق جتنے مقالات شائع ہوئے ہیں ان میں نقاد کے جو فرائض قرار دئے گئے ہیں وہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ نقاد کو مشرقی و مغربی علوم پر عبور کامل حاصل ہو اور وہ تمام فنون لطیفہ (شعرگوئی، مصوری، موسیقی سنگتراشی اور رقص) میں مہارت تامہ رکھتا ہو" بھلا صرف ان مہملات سے اردو زبان کے نقادوں کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؛ چاہیے تو یہ تھا کہ اپنی اختراعیت کو بروئے کار لا کر نہ سہی علمیت ہی سے وہ بنائے ہوئے اصول بتائے جاتے جن پر فن نقد کی استعماریت منحصر ہے۔ ورنہ صرف ایک رٹ لگائے جانے سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ بلکہ میں تو عرض کرونگا کہ اکثر مقولے قطعی لغو اور فرسودہ ہیں مثلاً یہ کہ "ناقد کا فنون لطیفہ میں ماہر ہونا ضروری ہے"۔ مولانا شبلی، حالی وغیرہ ہماری زبان کے عدیم المثال تنقید نگار تسلیم کئے جاتے ہیں مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے نہ ان لوگوں نے کبھی رقص کیا نہ سنگتراشی میں انھیں کچھ بھی مہارت تھی اور نہ مصوری میں کوئی دخل تھا۔ پھر انھیں مسلم الثبوت تنقید نگار کس طرح مانا جاتا ہے؟ مولانا عبدالحق اور پروفیسر زور دور حاضرہ کے بڑے بلند پایہ تنقید نگار ہیں مگر جہاں تک میں جانتا ہوں یہ اصحاب نہ گوئیے ہیں، نہ رقاص، نہ مصور، اور نہ سنگتراش پھر وہ ایک اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہرین فن تنقید کیوں تسلیم کئے جاتے ہیں؟ بالکل اسی طرح مجھے اس امر کے تسلیم کرنے میں بھی عذر ہے کہ "اردو زبان کا ناقد تمام انگریزی نقادوں کے قواعد نقد اور نظریات تنقید سے باخبر ہو" کیونکہ یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا نقصان۔ مثلاً انگریزی نقادوں کے ذخیرۂ تنقید کو پیش نظر رکھ کر یہ جاننے کی کوشش کیجائے کہ "تنقید" کی صحیح تعریف کیا ہے اور دراصل "ناقد" کس کو کہتے ہیں؟ تو ہمیں اتنے مختلف الخیال نظریے ملیں گے کہ ہم کسی نتیجے پر پہونچ ہی نہیں سکتے۔ لارڈ بیکن اور بالزاک اس بات پر متفق ہیں کہ

"نقاد وہی ہوتے ہیں جو ادب و فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں اور اپنی ناکامی کی تلافی یوں کیجاتی ہے کہ تنقید نگاری شروع کر دیتے ہیں"

چارلس سوبرن کا خیال ہے کہ:-

"نقاد کا کام یہ ہے کہ محاسن کو پہچاننے اور اس کے بعد اس امر کو دریافت کرنے کی کوشش کرے کہ وہ کیوں اور کس طرح محاسن بنیں گے"۔

اڈیسن کہتا ہے:-

"بہترین نقاد وہی ہے جو کسی ادبی کارنامے کے محاسن کی نشاندہی کرے نہ کہ معائب کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے"

سینٹ بیوف فرماتے ہیں:-

"پڑھنا، سمجھنا، محبت کرنا اور دوسروں کو بھی اس پر مجبور کرنا تنقید کہلاتا ہے"۔

سر والٹر ریلے

"تنقید مردہ مصنف یا مصنفات کو زندہ کرتا ہے"

میتھو آرنلڈ:۔

"ہم جس کو جانتے ہیں جس کا دنیا میں خیال کر سکتے ہیں اسی کو بہترین طریقے پر معلوم کرنا اور انھیں معنویات کے ذریعہ شگفتہ اور صحیح خیالات پیدا کرنا تنقید کہلاتا ہے۔"

کاڈکسن:۔

"کسی کام کے کرنے کے دو طریقوں کے درمیان موازنہ کرنا اصلی تنقید ہے۔"

غرض جتنے مغربی ناقدین ہیں مختلف الخیال ہیں اور ان کے نظریوں سے ہم مشرقیوں کا کوئی نتیجہ نکالنا اگر ناممکن نہیں تو حد درجہ مشکل ضرور ہے۔ لہذا یہ سمجھنا کہ انگریز نقاد ہمارے راہبر ہو سکتے ہیں ایک حسین غلط فہمی ہے اگر ہمیں اکتساب فیض ہی کرنا ہے تو خود ہماری زبان کے ایسے ایسے اکثر اہل قلم گذرے اور موجود ہیں جن کا سرمایہ تنقید ہماری راہبری کے لئے کافی ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم انگریز نقادوں کا سہارا لیں؟ نیز تنقید کا وجود ہر زبان کے ادب میں اس وقت ہوا ہے جب اس زبان کا سرمایہ ایک خاص رتبہ حاصل کر چکتا ہے۔ اردو زبان تو اب جا کر اس قابل ہوئی ہے کہ اس میں فن تنقید کو خاص طور سے رواج دیا جائے اور اس لئے اس وقت اگر ہم اپنی زبان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اپنی زبان میں عمدہ تنقیدی کتابیں بھی ملتی ہیں اور "تنقید نگار" بھی ایسی صورت میں ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ خواہ مخواہ انگریزی ستون پکڑا ہی جائے۔

دورِ قدیم[51] میں اردو زبان میں اچھے اچھے ناقدین ہوتے گئے ہیں مثلاً حالیؔ، شبلیؔ، آزادؔ، بجنوریؔ، اثرؔ، ظفرؔ[52]، مہدیؔ اور خیالؔ ایسے تنقید نگار ہوئے جنھیں فراموش کرنا ناممکن ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اسلوب نگارش میں تنقید نگاری کیلئے نئی نئی راہیں قائم کی ہیں اور پس ماندگان کے لئے اس قدر گنجائش نکالدی ہے کہ ان کی راہبری سے فن تنقید کو مستقل فن کی حیثیت دیجا سکتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ کی تنقیدی کتابوں میں ان کا نام لینا شاید باعث ذلت سمجھا جاتا ہے کیونکہ جو صاحب اس طرف توجہ بھی کرتے ہیں وہ ان میں سے چند ایک کے نام سرسری طور پر اس طرح لیتے ہیں کہ پڑھ کر حسرت ہوتی ہے برخلاف اس کے مغربی نقادوں کی بحث و تمحیص میں اس قدر غلو سے کام لیتے ہیں کہ ساری کتاب ان کے

---

[51] دورِ قدیم سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو جنت نصیب ہو چکے ہیں اور چونکہ ان ناقدین کی محنتوں کو کافی سراہا جا چکا ہے لہذا میں ان کا ذکر سرسری طور پر کروں گا۔ عطاء اللہ

[52] مولانا ظفر علی خاں بڑے زبردست تنقید نگار تھے مگر وہ سیاسیات میں اس طرح غرق ہو گئے ہیں کہ انھیں اردو ادب میں زندہ سمجھنا حماقت ہے اور اسی لئے میں نے انھیں دورِ قدیم میں شمار کیا ہے۔ عطاء اللہ

لئے وقف کردی جاتی ہے۔ اس دور میں "روحِ تنقید" مولفہ حضرت زور قادری اور "نقد الادب" مولفہ حضرت افسر میرٹھی فن تنقید سے متعلق کتابیں تسلیم کی جاتی ہیں مگر کس قدر قابلِ افسوس بات ہے کہ دونوں صاحبوں نے مہدی اور خیال کو تو اس طرح بھلا دیا ہے گویا تنقید نگاری سے انھیں مس ہی نہ تھا۔ رہے شبلی، حالی، آزاد، اثر، اور بجنوری تو ان لوگوں پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس قدر بحالت ہے کہ اس سے کچھ نہ لکھنا زیادہ بہتر تھا۔ حضرت افسر نے تو اور بھی حد کر دی ہے وہ مولانا ظفر علی خاں کو شاید ناقد ہی نہیں سمجھتے کیونکہ باوجودیکہ "روحِ تنقید" میں ان کا نام موجود ہے مگر انھوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ بہرحال! یہ ان لوگوں کی بدنصیبی ہے اور ہم لوگوں کا ظلم ہے کہ ہم ان ہی کے بتائے ہوئے رستے پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں کہ یہ رستہ کس کا بتایا ہوا ہے۔ بہرحال۔

شبلی مولانا شبلی نعمانی کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" ہی نہیں بلکہ "فردوسی" "نظامی" اور "سعدی" وغیرہ بھی ہے۔ مگر یہ سب کچھ حالی کا فیض ہے کیونکہ حالی ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اردو زبان میں تنقید نگاری کی بنیاد ڈالی البتہ اتنا ضرور ہے کہ شبلی ہی نے سب سے پہلے اسے پروان چڑھایا اور اس کمال کے ساتھ کہ وہ ابتدائی چیز معلوم ہی نہیں ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ براؤن نے بھی فارسی شاعری کے متعلق بڑا اچھا تنقیدی کارنامہ پیش کیا ہے مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ شعر العجم کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ اور اس کی وجہ محض "قوتِ تنقید" ہے براؤن اس سے محروم تھا اس لئے وہ بات پیدا کر ہی نہ سکا۔ بہرحال شبلی کو بحیثیت نقاد بارہا پیش کیا جا چکا ہے اور ان کی انتقادی صلاحیت پر تحسین و آفریں کے اس قدر پھول چڑھائے گئے ہیں کہ اب اس پر کچھ لکھنا فضول ہے۔

حالی مولانا الطاف حسین حالی اردو زبان میں فن تنقید کی بنیاد رکھنے والے تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان کے تنقیدی کارنامے "مقدمہ دیوان حالی" حیات سعدی اور یادگار غالب وغیرہ ایک لازوال شہرت و عظمت کے حامل ہیں یا بقول حضرت افسر میرٹھی یہ کہئے کہ یہ وہ تصانیف ہیں جو دنیا کی بڑی ترقی یافتہ زبانوں کے لئے بھی باعث صد فخر و ناز ہو سکتی ہیں"۔ پروفیسر زور نے بھی اپنی تصنیف "روحِ تنقید" میں حالی کے کارناموں کو سراہا اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے البتہ ہمارے جناب سعید انصاری صاحب ایک ایسے ادیب ہیں جن کا خیال ہے کہ "مقدمہ" میں "غیر ضروری مباحث یا بیجا طوالت سے بہت کام لیا گیا ہے جس سے تصنیف کا رتبہ بہت کچھ گھٹ گیا ہے"۔ "حیات جاوید" میں "ذاتی و شخصی تعلقات کا وہی جذبہ کام کر رہا تھا جس نے باسول کو جانسن کی لائف لکھنے پر آمادہ کیا۔ باقی رہیں دو تصانیف یعنی "یادگار غالب" اور "حیات سعدی" تو ان میں مصنف کا کوئی خاص مقصد صاف طور پر نہیں ظاہر ہوتا ہے"۔ درانحالیکہ اردو زبان کے سب سے بڑے تنقید نگار مولانا عبد الحق صاحب کا قول ہے کہ:-

"ہماری زبان میں تنقید کا کام صرف مولانا حالی مرحوم نے کیا ہے۔ فن کی حیثیت سے وہ اس کے بانی ہی نہیں بلکہ
ایک اعلیٰ پایہ کے ادبی نقاد ہیں"

اب یہ کون کہے کہ ان میں سے کس کی رائے زیادہ وقعت کے قابل ہے؟

آزاد پروفیسر محمد حسین آزاد اپنے رنگ کا صرف ایک تنقید نگار ہے۔ اور اردو زبان میں ایک یہی شخص ایسا تنقید نگار ہے جس کے کارنامے دوست دشمن دونوں ہی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ مگر حضرت سعید انصاری ان سے بھی خفا ہیں فرماتے ہیں:-

"آزاد نے اردو اور فارسی شاعری کی تاریخ اور شعرا کے حالات لکھے۔ حالی نے شعر و شاعری پر فلسفیانہ نقطہ نظر سے بحث کی لیکن شبلی نے چار جلدوں میں "شعر العجم" اس ناقدانہ اور فلسفیانہ نقطۂ خیال سے لکھی جس کے آگے آزاد کی "سخندانِ فارس" اور "آبِ حیات" اور حالی کا "مقدمہ" ہیچ ہے"

درانحالیکہ اردو زبان کے مسلم الثبوت ادیب و نقاد حضرت مہدی کا قول ہے کہ:-

"سرسید سے "معقولات" الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں"

بجنوری مولوی عبدالرحمن بجنوری بی اے وہ مثالی تنقید نگار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے تنقیدی کارنامے "مقدمہ دیوانِ غالب" سے ہندوستان میں ایک ایسی دھاک بٹھا دی کہ اب تک بڑے بڑوں کے زہرے آب نظر آتے ہیں اور تنقید نگاری کا وہ انوکھا طرز ایجاد کیا جو آج کل مقبول ترین طرز سمجھا جاتا ہے اگر کاش صاحب موصوف کچھ دن اور زندہ رہ جاتے تو اردو زبان میں فن تنقید معراجِ کمال حاصل کر لیتی۔

اثر نواب امداد امام صاحب اثر کی تنقیدی عظمت و صلاحیت مسلم اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی تنقید نگاری اردو زبان میں ایک نئی راہ قائم کر گئی مگر ان کی مشہور تصنیف "کاشف الحقائق" کے تنقیدی مصنف ہونے میں مجھے کلام ہے۔ اور میں اس عنوان پر اپنے مضمون "اردو زبان کی بلند پایہ تنقیدی کتابیں" میں اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں لہٰذا ان کا اعادہ فضول ہے۔

ظفر مولانا ظفر علی خاں اردو زبان میں بڑے پائے کے تنقید نگار ہوئے اور سیاسیات سے جب تک وہ علیحدہ رہے انھوں نے اردو زبان کو تنقید سے روشناس اور مانوس بنانے میں بڑے انہماک سے کام لیا۔ مگر افسوس ہے کہ وہ زندگی ہی میں اردو تنقید نگاری کی طرف سے منھ پھیر کر مُردوں کے صف میں داخل ہو گئے۔ اور اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو جو داغ دے گئے وہ قابل فراموش نہیں

(باقی آیندہ)

جنت
ایک بیوی کی نظر میں

(از حضرت شوکت تھانوی)

رات دیر تک گھر کے باہر رہنا پڑا اور احباب کی ہا ہا ہو ہو میں وقت کا اندازہ نہ ہو سکا لہذا واپسی پر اس خیال سے کہ بیگم کی آنکھ نہ کھل جائے ایڑی اٹھائے پنجوں کے بل کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھتے کیا ہیں بیگم جانماز پر ہماری ہی تاک میں بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی ہیں یہ منظر دیکھتے ہی پہلے تو ارادہ کیا کہ بھاگیں مگر جب پیروں کو مع ہوش و حواس کے مفلوج پایا تو نہایت بے تکے پن کیساتھ کہا

”یعنی آپ اس وقت آدھی رات کو وظیفہ پڑھ رہی ہیں“

بیگم نے جو دراصل اپنی جان سے بیزار بیٹھی تھیں جل کر کہا ”آپ سے کیا مطلب آپ جائیے اپنے دوستوں کے ساتھ سیر کیجئے ابھی سے کیوں تشریف لائے ابھی تو بارہ بجکر کچھ ہی منٹ آئے ہیں۔“

ہم نے اتنی دیر میں اپنے حواس کچھ درست کر لئے تھے لہذا سنبھل کر کہا ”میرا شکریہ ادا کیجئے کہ میرے نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے اتنی عبادت کر لی حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آپ اسوقت دل لگا کر اور پورے خلوص کیساتھ میرے ان کم بختوں کو دوستوں کو کوس رہی ہونگی جو واقعی اس قابل ہیں یعنی آج بھی گھڑی کی سوئی گھما کر مجھ سے کہا کہ ابھی تو ساڑھے سات بجے ہیں۔“

بیگم نے منہ پھیلا کر کہا ”آپ تو خیر ایسے ہی اللہ میاں کی گائے ہیں مگر میں کیوں کسی کو کوسنے لگی البتہ یہ ضرور چاہتی ہوں کہ جس طرح اس دنیا میں جل رہی ہوں وہاں بھی نہ جلوں“

ہم نے سادگی کے ساتھ کہا ”کہاں“

بیگم نے طنز آمیز لہجہ میں کہا ”وہیں جہاں جانیکا خیال آپ کو نہیں ہے اور جہاں سب جائیں گے سوائے آپ کے“

ہم نے شیروانی اتارتے ہوئے کہا ”میں سمجھا خدا کے یہاں۔ مگر یہ میں نے کب کہا کہ میں نہ جاؤنگا۔ جاؤں یا نہ جاؤں مگر جانا پڑے گا۔ حالانکہ گناہ اتنے کئے ہیں کہ واقعی اگر ممکن ہو تو بھاگ کھڑا ہوں“

بیگم نے منہ چڑھانے کے انداز سے کہا ”شرم تو نہ آتی ہو گی ایسی باتیں کرتے ہوئے بھاگیں گے منہ چڑائیں گے یہ سب کچھ ہو گا مگر نماز نہ پڑھیں گے ہاں گھومنے کو دیدیجئے تو رات بھر ساڑھے سات بجتے رہیں گے۔“

ہم نے کہا ”دیکھئے میرا نماز نہ پڑھنا ہی ایک قسم کا اشارہ ہے بات یہ ہے کہ اگر میں نے نماز پڑھی تو آپ مجھکو جنت جانے سے روک نہیں سکتیں اور اگر میں بھی آپ کے ساتھ جنت میں رہا تو آپ جس طرح یہاں جلتی ہیں وہاں بھی جلیں گی۔“

بیگم نے بڑی بڑی آنکھوں کو جھپکا کر کہا "جی ہاں وہ بھی گویا آپ کا دولت خانہ یا مردوں کی حکومت کرنے والی دنیا ہوگی کہ وہاں بھی آپ چلائیں اور ہم چلیں" یہ یاد رہے کہ وہاں آپ لوگوں کی دال نہ گلنے گی۔

یہ ہم نے کہا "یعنی کیا مطلب آپ کا گویا وہاں آپ اس قدر معقول اور دلدادہ ہو جائیں گی کہ ہم خواہ کسی حور سے ملیں اور خواہ کسی حور کے ساتھ دن دن بھر اور رات رات بھر غائب رہیں آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی"

بیگم نے جنت کی حوروں سے بطور پیشگی جلتے ہوئے کہا "آپ لوگوں کے دماغ میں تو بس یہی باتیں بسی رہتی ہیں جنت کا خیال آیا اور صرف حوروں کے لئے گویا وہاں کے لئے بھی نیت پاک نہیں ہے"۔ ہم نے کہا۔ "میں نے تو ایک بات کہی ورنہ آپ جانتی ہیں کہ جب جنت میں آپ بھی ہونگی تو کسی حور کی ضرورت ہی کیا ہے" یہ جملہ دراصل ہم نے تلافی کے طور پر کہا تھا چنانچہ اس کا اثر بھی خاطر خواہ بہتر ہی ہوا اور بیگم نے یہ جلی کٹی ایک حد تک ختم کرتے ہوئے کہا "جنت واقعی خدا جانے کیسی اچھی ہوگی۔" ارادہ ہوا کہ جنت کی صحیح تعریف کر دیں "بیوی کی جنت صرف یہ ہے کہ اسکا شوہر پالتو ہو اشارہ پر زبان نکال کر دم ہلانے جب وہ سٹ ڈاؤن کہے تو بیٹھے اور جب وہ چاہے کسی سے لڑے تو شوہر بھی اس کی آواز میں آواز ملا کر بھونکنا شروع کر دے۔ اسی طرح بیوی کا جہنم یہ ہے کہ شوہر ذرا منھ زور اس کے کہے کا نہ ہو اور اپنے کو شوہر یعنی اپنی بیوی کا مجازی خدا سمجھتا ہو" جنت اور دوزخ کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کیا ہو سکتی ہے مگر اس وقت یہ تعریف کچھ خلاف مصلحت تھی لہذا ہم تو چپ ہو رہے بیگم نے لحاف سے منھ نکال کر جنت کی منظر کشی شروع کرتے ہوئے کہا کہ وہاں عورتوں کی قدر ہوگی اور دنیا میں مردوں نے جس قدر عورتوں کو دبا کر اور محکوم بنا کر رکھا ہے اسی قدر عورتوں کو آزادی حاصل ہوگی گھر کا دھندا مردوں کے سپرد ہوگا۔ ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ "یعنی چولھا ہانڈی وغیرہ نا" بیگم نے کہا "جی ہاں چولھا ہانڈی کیا سال بسال سب بچوں کو بھی مرد رکھیں گے"۔ ہم سے پھر نہ رہا گیا اور ہم نے پھر بات کاٹ کر کہا "بلکہ بچہ کشی بھی مردوں کے ذمہ ہوگی" بیگم نے کہا "خدا کرے ایسا ہی ہو مطلب تو یہ کہ جیسے مرد بے فکر پھرتے ہیں آزاد رہتے اسی طرح عورتیں وہاں بے فکر ہوں گی" مرد گھروں کے اندر پردہ میں رہا کریں گے اور عورتیں مردوں کی طرح کھلے بندوں پھریں گی۔ مرد اگر باہر نکلیں گے تو برقع میں یا ڈولی پر یا پردہ گاڑیوں پر اور عورتوں کو ان باتوں کی ضرورت نہ ہوگی میں خود آپ کے لئے ریشمی برقع منواؤں گی تاکہ جب میں پھر ایسی شان کے ساتھ آپ کو لیکر باہر نکلوں تو آپکا ریشمی برقع دیکھ کر دوسری عورتیں مجھ پر رشک کریں کہ اس نے کیسا لا جواب شوہر پایا ہے جو ایسے خوبصورت برقع میں رہتا ہے گویا برقع کو حسن آپ کے حسن کا پرتو سمجھا جائیگا پھر میں بار بار آپ سے کہونگی جیسے برقع میں چھپاؤ داڑھی برقع میں رکھو جس طرح آپ مجھکو ٹوکا کرتے ہیں کہ بال برقع کے باہر آ گئے چوٹی باہر لٹک رہی ہے بلکہ جس طرح آپ کہا کرتے ہیں کہ ساری کا آنچل برقع میں رکھو اور دوپٹہ چھپاؤ اسی طرح میں بھی احتیاط رکھوں گی کہ شیروانی کا دامن برقع کے باہر آنے پائے اور کوٹ کا کوئی حصہ نامحرم عورتیں نہ دیکھ سکیں میں جنت کی ہر چہل پہل میں حصہ لوں گی جلسوں میں جاؤنگی۔ دعوتوں میں شرکت کروں گی کھیل تماشوں میں دلچسپیاں لوں گی اور آپ گھر میں بیٹھے بچے کو تھپکیں گے سلائیں گے اور کروشیا سے میز پوش یا تیلیوں سے میرے لئے مفلر بنا رکھیں گے میں گھر میں آکر تازہ اخبارات پڑھا کروں گی اور میرے قریب بیٹھکر ڈلی کاٹا کریں گے مجھ سے ملنے جب میری کوئی جنتی سہیلی آئیگی تو آپ اس کے لئے پان بنا کر باہر بھیجیں گے اور ملازم سے کہلوائیں گے کہ میاں آپ کو سلام کہہ رہے ہیں اور مزاج پوچھتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ بہت دنوں سے آپ کے گھر میں سے نہیں آئے کہئے تو کس دن ڈولی بھیج دیجائے" ملازم یہ پیغام باہر لائیگا اور چلمن کے اندر سے جھانکیں گے میرے ساتھ جب کبھی آپ سفر کریں گے تو میں برقع میں آپ کو لپیٹ کر اسٹیشن لیجاؤں گی وہاں تانگہ کے ریل سے مخصوص مردانہ درجہ تک ڈولی میں آپ جائیں گے پھر چادر تان دی جائیں گی اور آپ ان کی آڑ میں چپکے سے مردانہ درجہ کے ایک کونے میں بیٹھ رہیں گے اور میں مردانہ درجہ کی کھڑکی بند کردوں گی تاکہ آپ کی بے پردگی نہ ہو۔" بیگم نہایت روانی کیساتھ اپنی جنت اور ہمارے جہنم کے مناظر پیش کر رہی تھیں اور ہم سن سن کر ہنس رہے تھے آخر ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے کہا "مگر سنئے تو جس طرح آج کل تعلیم یافتہ اور آزاد خیال گھرانوں میں پردہ نہیں ہے اسی طرح کیا وہاں آزاد خیالی کا نام نہ لیجائیگی" بیگم نے اپنا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "جی نہیں میں تو ذرا پرانے خیال کی عورت ہونگی جو اپنے شوہر کو پردہ میں رکھے آپ نے میرا پردہ دنیا میں اٹھوایا ہوتا تو جنت میں آپ کا برقع میں اتروا دیتی مگر یہ تو نقد سودا ہے اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے جیسا آپ نے مجھکو رکھا ہے ویسا ہی میں بھی آپ کو رکھونگی ابھی آپ نے

سنا ہی کیا ہے جن حور دیکھا آپ پھولے ہوئے ہیں میں تو ان سے بھی آپ کا سخت پردہ کراؤں گی البتہ غلمانوں کے سامنے آپ آئیں گے اور یہ دیکھ کر جلا کریں گے کہ میں خود آزاد خیال عورتوں کے بے پردہ مردوں سے ملا کروں گی جب کوئی جنتی خاتون معہ اپنے شوہر کے مجھ سے ملنے آئیں گی تو آپ کو آزاد مرد پر رشک ہوگا مگر میرے ڈر کے مارے آپ زبان سے نہ نکال سکیں گے آپ میری ان نظروں کو دیکھا کریں گے جب میں اسٹیشنوں پر آزادی سے بے پردہ پھرنے والے مردوں کو دیکھوں گی پھر آپ شکائتیں کریں گے اور میں ہنس ہنس کر دیدہ دلیری سے کام لوں گی اور آپ دل ہی دل میں اور بھی جلیں گے۔

بیگم کی جنت کے یہ مناظر انتہائی تکلیف دہ تھے لہٰذا ہم نے ایک جھرجھری لیکر اس موضوع سخن کو ہٹانے کے لئے جمائی لے کر کہا "خیر یہ سب تو ہوگا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہاں محنت مزدوری آپ کو کرنا پڑے گی"

بیگم نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "ہاں یہ تو ہے ہی کہ میں صبح اٹھ کر دفتر جانے کی طیاریاں کروں گی کنگھی چوٹی پاؤڈر غازہ سرسلپ اسکاٹ وغیرہ اور آپ جلدی جلدی میرے لئے ناشتہ طیار کریں گے جب میں اپنا رشمی چھاتہ لیکر دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلوں گی تو آپ ناشتہ لگا دیں گے اور میں اس طرح بیٹھ کر ناشتہ کھاؤں گی کہ آپ مرچیں لے کر مکھیاں اڑائیں گے دوڑ کر پانی لائیں گے اور لپک لپک کر کبھی چاء بنائیں گے کبھی توسٹ میں مکھن لگائیں گے اور کبھی انڈہ چھیلیں گے اس کے بعد میں دفتر جاؤں گی اور دفتر سے جب چار بجے واپس آؤں گی تو آپ پھر میرے اشاروں پر ناچتے ناچتے پھریں گے میں سہ پہر کی چاء پی کر ٹینس کھیلنے جاؤں گی اور آپ اپنے بال بچوں کو لیکر بیٹھیں گے میں ٹینس کے بعد اسی طرح سے اپنی سہیلوں سے ملنے ان کے تفریح کرنے سینما دیکھنے تھیٹر دیکھنے چلی جاؤں گی اور آپ رات گئے تک گھر میں لیٹے تارے گنا کریں گے میں روز کوئی نہ کوئی بہانہ لے کر آیا کروں گی اور آپ کو زبردستی اس کا یقین کراؤں گی اگر آپ نے یقین نہ کیا تو آپ سے لڑائی ہوگی اور آخر کار میں اس طرح خفا ہو جاؤنگی کہ دوسرے روز آپ ہی مجھکو منائیں کہ میری بیگم میری سرتاج میری مالکہ خدا کے لئے مان جاؤ اب تو میں آپ ہی کا ہوں ماں باپ کے یہاں سے آپ لائی ہیں تو مجھکو اپنا بنا کر رکھئے میں تو آپ کا غلام ہوں میرے والدین نے آپ کی غلامی کے لئے مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ کی اس خوشامد کے جواب میں میں نہایت فرعونیت کے ساتھ کہونگی کہ جی نہیں آپ تو جب خوش ہوتے اگر میں دوسری عورتوں کی طرح آپ کی پرواہ نہ کرتی اور دو دو دن آپ کی خبر نہ لیتی مگر قصہ تو یہ ہے کہ میں تو خود ہی اول دن سے دب گئی لاکھ مرتبہ کہا کہ تم گھر میں بیٹھنے والے مرد تم کیا جانو ہم عورتوں کی مصروفیتوں کو مگر تم تو مرد ہونا اوندھی کھوپڑی کے ناقص العقل تمہاری سمجھ میں کبھی کوئی بات نہ آنے کی آپ پھر خوشامد کریں گے اور آخر کار رونا شروع کر دیں گے تو بڑی مشکل سے میں مانوں گی اور پھر آزادی کے ساتھ سہیلیوں کے ساتھ رنگ رلیاں کروں گی۔ بات یہ ہے کہ اگر میں سہیلیوں کو چھوڑ کر آپ کے پاس رہی تو وہ طعنہ دے دے کر مار ڈالیں گی کہ شوہر مرید ہو اور شوہر سے دبتی ہو اور یہ بات چونکہ ڈوب مرنے والی ہوگی لہٰذا میں اس کا موقع ہی نہ دوں گی" بیگم کی جنت کے حالات کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتے تھے اور یہاں نیند گھر گھر کر آ رہی تھی جمائیوں کے مارے برا حال تھا اور انگڑائیوں پر انگڑائیاں آ رہی تھیں لہٰذا ہم نے کہا "مختصر یہ کہ آپ اپنی جنت میں ہم مردوں کی نقالیاں کریں گی بیگم نے بات کاٹ کر کہا نقالیاں کیسی بلکہ یہ کہئے کہ ایک ایک بات کا بدلہ لیا جائیگا اور کیوں نہ لیا جائے اپنی حکومت ہوگی اپنی عدالت اپنی پولیس اپنی فوج اپنے حاکم اپنے کارندے اپنے رکیں اور اپنا بنایا ہوا قانون آپ لوگ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکیں گے کہ مہر کے دعوے کریں روٹی کپڑے کی نالش کریں بیویوں کی بدسلوکی کا رونا روئیں اور برقع پہن کر ڈولیوں میں بیٹھ کر عورتوں کی عدالتوں میں فریاد لے کر جائیں" ہم نے ہنستے ہوئے کہا "اور وہ ہاں عدالتوں میں جج صاحبہ کو دیکھیں کہ وہ بات بات پر داد اور نوج کر رہی ہیں" بیگم نے تڑ کی بہ تڑ کی کہا "جی ہاں یہ زبان تو ہماری جنت میں عدالتی زبان ہوگی آپ لوگوں کی طرح واللہ اور استغفراللہ والی زبان تھوڑی ہوگی" ہم نے کہا "اچھا صاحب خدا کے لئے سو رہئے جب جنت میں جا سیئے گا جبھی اکڑ دیجئے گا فی الحال تو آپکا زور بس اتنا ہے کہ بات بات پر منہ پھلائیں یا زیادہ سے زیادہ روئیں" بیگم نے بدستور اکڑتے ہوئے کہا "گر جنت میں دیکھئے گا کہ کون منہ پھلاتا ہے اور کون ٹسوے بہاتا ہے ایسا ایسا سر پہ ہاتھ رکھ کر آپ لوگ روئیں گے کہ بس مزا ہی آئیگا" بیگم کی تقریر جاری تھی اور ہم نیند میں کھوئے سے تھے آخر بڑی دیر تک ان کی آواز سنتے سنتے پھر یہ بھی ہوش نہ رہا کہ وہ کب خاموش ہوئیں۔

(وہ مضمون جو ۳۰ دسمبر کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ کیا گیا اور اب بہ اجازت اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب شائع کیا جا رہا ہے) شوکت تھانوی

ارتقائے حیوانی کی ایک جھلک

ڈارون اور اس کے نقش قدم پر چلنے والوں کا قول ہے کہ انسان ابتدا میں حقیر جانداروں کی حالت میں تھا' وہ رفتہ رفتہ بندر بنا اور اس سے ترقی کرکے انسان ہوگیا' اس کے جسم کے بال غائب ہوگئے' دُم دفع ہوگئی اور عقل و شعور گویائی اور دوسری خصوصیات نے اسے اشرف المخلوقات کے مرتبہ پر فائز کردیا۔

اس حقیقت کو ماننے کیلئے اگر ایک متنفس بھی تیار نہ ہو تب بھی امر واقعہ اپنی جگہ پر صحیح ہے' دنیا میں بہت سے انکشافات ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں جن کے مشاہدے سے قبل اگر وہ ظاہر کردئے جاتے تو دنیا ان پر مضحکہ اڑاتی اور بیان کرنے والے کو محض پاگل سمجھ لیتی جس طرح اکبر نے۔ ' ریڈیو اور دوسری چیزیں ہیں کہ پیدائش عالم سے آج تک انسانوں پر منکشف نہیں ہوئی تھیں اسی طرح انسانی ارتقا بھی پردہ خفا میں بے شمار زمانہ تک رہا یہاں تک کہ ڈاروِن نے اس غبار آلود آئینہ کو گرد سے صاف کرکے دنیا کے سامنے پیش کردیا۔ اور اب اس قول سے انحراف کی مطلق گنجائش نہیں کہ انسان کی اصل بندر ہے مگر علم [illegible] سے ناواقفیت رکھنے والے جنھوں نے مخلوقات کی حالتوں پر غور نہیں کیا وہ انسان کی گری ہوئی اس تذلیل کو گوارا نہیں کرتے انھیں دُم کے وجود سے انکار' بوزنیۃ الاصل ہونے سے گریز اور تدریجی ارتقا سے انکار ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ صدہا امور کے سمجھنے میں انھیں آئے دن غلط فہمی ہوتی ہے' وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ دنیا کی چیزوں میں ہمیشہ سے تغیرات ہوتے چلے آئے اور ایسی تبدیلیاں بھی مشاہدے میں آتی ہیں جو سال و ماہ تو طویل مدتیں ہیں اکثر چیزیں کل کسی اور شکل میں تھیں اور آج اور شکل میں۔

درحقیقت حاضر الوقت جانداروں کی شکلیں اور شباہتیں قدیم ترین زمانہ میں قطعاً مختلف تھیں' اس وقت ان کی ساخت بالکل معمولی اور سادہ تھی جوں جوں وقت گزرتا گیا ان میں تغیرات ہوتے گئے' یہاں تک کہ انھیں میں سے کچھ غیر معمولی ترقی کرکے اعلیٰ ترین جاندار ہوگئے۔ کیونکہ جب انسان اور ترقی یافتہ حیوانات کے اجسام کی تشریح کیجاتی ہے تو ہر ایک کے اعضا کی ساخت میں حیران کن یکسانیت پائی جاتی ہے' دونوں کے اعصاب' عضلات ہڈیاں مفاصل اعضائے باطنی دوران خون اور تمام نظام جسمانی میں حد درجہ اشتراک پایا جاتا ہے۔

علم تقسیم الحیوانات کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ انسان کا ہاتھ' کتے کا پنجہ' چڑیوں کے بازو' ویو مچھلی کے دست و پا

اور گھوڑے کی ٹانگیں ظاہری شکل میں مختلف ہونے ہوئے بھی HOMOLOGOUS ORGAN ایک ہی طرح کے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر تمام حیوانات کی اصل ایک ہے تو ان میں اختلافات عظیم کیونکر پیدا ہوگئے اور ہم رشتہ ہوتے ہوئے بھی شکل و شباہت عادات و اطوار اور طرز زندگی جداگانہ کیوں ہیں۔ آدمی زمین پر بستے ہیں، طیور ہوا میں اڑتے اور مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش میں تمام حیوانات کے آبا و اجداد زمین پر تھے ان میں سے کچھ دیو مچھلی کی طرح پانی میں رہنے کے عادی ہوگئے، کچھ چمگادڑوں کی مانند ہوا میں اڑنے لگے اور کچھ بندروں کی طرح زمین ہی پر رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ اڑنا تیرنا اور زمین پر چلنا ایک دوسرے سے مختلف ہیں چنانچہ اپنے اپنے ماحول کے لحاظ سے تینوں قسموں کے جانداروں کے اعضا میں تبدیلیاں ہوئیں، ضروری اجزا کا اضافہ ہوا غیر ضروری مفقود ہوگئے۔ اسی نسبت سے عادتوں میں اختلافات رونما ہوئے اور ظاہری اشکال میں بھی تغیرات پیدا ہوگئے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو جدید ماحول میں ان کی بقا کا امکان ہی نہ ہوتا۔ خاندانی خصوصیات کے لحاظ سے بھی آنے والی نسلوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

موجودہ حالت میں انسان اشرف ہے اور باقی حیوانات میں بلند سب سے ترقی یافتہ خیال کیا جاتا ہے۔ علم (ZOOLOGY) کے اعتبار سے ان تمام جانداروں کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اسی کے ساتھ نشوونما کے لحاظ سے ایک سلسلہ وار زینہ بنایا گیا ہے تاکہ مطالعہ کرنے والے کے ذہن نشین ہوجائے کہ تمام جاندار ایک دوسرے کے بعد دیگرے ترتیب رکھتے ہیں جو کہ سیڑھی کے ڈنڈوں میں ہوتی ہے۔ جاندار مخلوق کا ارتقا بہت آہستگی سے ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک ایک زینہ کو طے کرکے دوسرے پر قدم رکھتا جاتا ہے۔ علم الارتقا کا راز جیسا کہ کہا گیا ہے کہ سر چارلس ڈارون پر منکشف ہوا۔



سر چارلس ڈارون

دفینوں کے ذریعہ سے بھی ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔ بے شمار زمانہ گزرا جب دنیا میں انسان کا وجود نہ تھا اس وقت خشکی اور تری میں بہت سے طویل القامت جانور موجود تھے جن کے بعض اعضا مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں اور قیاس کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے لڑ بھڑ کر تباہ ہو گئے۔ ان جانداروں کے ڈھانچوں سے موجودہ جانوروں کے خاندانوں کا پتہ لگانے میں بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ مثلاً اس زمانہ میں گھوڑوں کی ساخت اس وقت کے گھوڑوں سے بہت مختلف تھی، قدیم ترین ایام میں وہ قدوقامت میں موجودہ کتے اور لومڑی کے برابر تھے، ان کی ٹانگوں کے سرے پر تین چار انگلیاں ہوتی تھیں مگر رفتہ رفتہ وہ مفقود ہوتے گئے اور بجائے ان کے ایک بڑا جانور ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا عالم وجود میں آ گیا اور اس کے بعد بھی تغیرات ہوتے ہوتے ایسا جانور نمایاں ہوا جس کی متعدد انگلیوں کی جگہ پر صرف ایک سُم رہ گیا اور یہ وہی گھوڑا ہے جیسے اس زمانہ میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ کتے اور لومڑی کے قدوقامت والے قدیم ترین گھوڑے آج کل کے گھوڑوں کے آبا و اجداد تھے۔

تمام قسم کے سانپ اور پیٹ کے بل رینگنے والے جانداروں کے مقابلہ میں چڑیاں بلند مرتبہ رکھتی ہیں کیونکہ چڑیاں انھیں رینگنے والے جانوروں سے ترقی کر کے اس زینہ پر پہونچی ہیں۔

گو بظاہر چھپکلی اور کبوتر کی شکلیں مختلف ہیں، اول الذکر کے دانت ہوتے ہیں اور اڑنے سے مجبور ہیں، ثانی الذکر کے دانت نہیں ہوتے اور ہوا میں اڑتے ہیں اس لئے رینگنے اور اڑنے والے جانداروں کے درمیان میں ایک ترقی یافتہ اور دونوں میں مشترک شکل کا جاندار بھی ہونا ضروری ہے چنانچہ ۱۸۶۲ء میں ایک جاندار ARACHAESPTEYX کا ڈھانچہ دستیاب ہوا ہے جس کے دانت رینگنے والوں کی طرح اور باقی جسم کی ساخت پرندوں کی سی ہے دُم کی ہڈیاں چھپکلی سے مشابہ اور پاؤں چڑیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ جاندار چڑیوں اور پیٹ کے بل رینگنے والوں کے درمیان کڑی کا کام دیتا ہے۔ اس نوع کے جاندار جو دو جماعتوں کے درمیان میں ہوتے ہیں وہ اس وقت کی یاد تازہ کرتے ہیں جب وہاں کے ماحول میں انقلاب عظیم رونما تھا۔ جدید ماحول کے طلوع ہونے سے نئی نئی چیزوں کی ضرورت لاحق تھی اور نئے نئے پیدا اور غیر ضروری ناپید ہو رہے تھے۔

انسان ہو یا حیوان ہر ایک پر ماحول کا بھی بے انتہا اثر پڑتا ہے چنانچہ زمین میں بعض بہت بڑے اور تاریک غار ہیں جن کی مچھلیاں عام طور پر اندھی ہوتی ہیں۔ ناواقف سمجھتے ہوں گے کہ یہ مچھلیاں ہمیشہ سے اندھی پیدا ہوتی ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے وہ مچھلیاں آنکھ والی مچھلیوں کے خاندان سے ہیں کبھی خود ان کے بھی آنکھیں تھیں اور غار میں رہتے رہتے اور آنکھوں سے کام نہ لینے کے باعث اندھی ہو گئیں۔ ایسے غاروں کا راز جب سے منکشف ہوا ہے اس وقت سے ان غاروں کے تمام جانداروں کی زندگی کا مطالعہ سائنس داں بہت غور سے کر رہے ہیں اور اس چھان بین کے نتیجہ میں معلوم ہوا ہے کہ وہاں

کے کل جاندار نابینا ہیں اور انھیں کے قریب کے جاندار جہاں روشنی کافی موجود ہے بڑی بڑی آنکھوں والے اور بخوبی بینا ہیں مگر غار کا ہر جاندار اپنی ذات کے تمام جانداروں سے باعتبار ساخت بالکل یکساں ہے عام اس سے کہ وہ امریکہ کے جاندار ہوں یا یورپ اور دوسرے مقامات کے VESTIGIAL STRUCTURE غاروں کے نابینا جانداروں کی رفتہ رفتہ باصرہ دفع ہوکر آنکھوں کے نشانات بھی برائے نام رہ گئے ہیں کچھ جاندار ایسے درمیانی حالت کے بھی پائے گئے ہیں جن کی آنکھیں بتدریج چھوٹی ہو رہی ہیں اور ایک عرصہ بعد وہ بھی نابینا جانداروں میں شامل ہوجائیں گے - ایک مچھلی کی ابتدائی عمر میں آنکھیں موجود ہوتی ہیں، وہ جتنی جتنی بڑی ہوتی جاتی ہے آنکھیں کمزور ہوتے ہوتے بالکل بیکار ہوکر آس پاس کی جلد سے پوشیدہ ہوجاتی ہیں - بعض کیکڑوں کی قسم کے جانداروں کی آنکھیں قطعاً مفقود ہیں مگر ان کی آنکھوں کا زیریں حصہ اب تک موجود ہے -

جبکہ ایک ہی نوع کے جاندار کچھ بینا کچھ درمیانی حالت میں اور کچھ نابینا پائے جاتے ہیں تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تخلیق اسی طور پر ہوئی ہے ایک ٹوٹی ہوئی گھڑی ایک منہدم عمارت اور ایک بے ٹانگ کے آدمی کو دیکھ کر کون عقلمند کہے گا کہ یہ چیزیں ابتدا ہی سے ایسی ناقص بنائی گئی تھیں یہی حالات مذکورہ جانداروں کے ہیں جن کی آنکھیں ماحول کے بدلنے سے معدوم ہوگئی ہیں - ایک مچھلی میں بجائے آنکھوں کے صرف ریشے ہی NERVES ہوتے ہیں یہ ریشے محض بیکار ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر چیز کسی نہ کسی فائدے اور استعمال کے لئے خلق ہوتی ہے تو بجائے آنکھ کے ریشے کی کیا ضرورت تھی یا آنکھیں تو موجود نہیں اور آنکھوں کے کچھ حصوں کا VESTIGIAL STRUCTURES موجود ہونا اس امر کا زبردست ثبوت ہے کہ ان جانداروں کے آبا و اجداد بینا تھے مگر چونکہ آنکھیں دیکھنے کے لئے ہوتی ہیں اور دیکھنا بغیر روشنی کے ممکن نہیں بلکہ تاریکی میں آنکھ پر زور ڈالنا آنکھوں کو بیکار کر دیتا ہے اور مستقلاً آنکھ کا بند رکھنا بھی تکلیف دہ اور باصرہ کے لئے مضر ہے اس لئے تاریک مقامات میں رہنے والے جانداروں کی آنکھیں نہ ہونا ہی بہتر ہے - چنانچہ ابتدا میں جب کچھ تندرست جاندار غاروں میں سکونت پذیر ہوئے غار تاریک تھے آنکھیں تکلیف کا باعث ہوئیں جن کی آنکھیں کچھ کمزور تھیں وہ قوی البصر کے مقابلہ میں غاروں کی سکونت کے لئے زیادہ موزوں تھے - عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ مریض والدین کے بچے بھی مریض ہوتے ہیں چنانچہ ایسے کمزور آنکھ والے جاندار غاروں میں رہے - جنھیں کچھ قوی البصر ہونے کے باعث کم و بیش نظر آتا تھا وہ غاروں کے منہ پر آگئے - باقی جو پورے نگاہ والے جاندار تھے وہ غار سے باہر آگئے - اب ان جانداروں میں جو غار میں تھے ایک طرح کا انتخاب ہوا - بالکل تاریکی میں رہنے والے علیحدہ ہوئے، غار کے منہ کے نزدیک رہنے والے علیحدہ اور کھلے سمندر میں رہنے والے علیحدہ ہوگئے - بالکل اسی طرح کا انتخاب تمام جانداروں اور پودھوں میں قدرت کی طرف سے ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے - ان انتخابات میں صرف وہی اپنے اعضا کو اجزا کو یا اپنی ساری ہستی کو قائم اور زندہ رکھ سکتے ہیں جن کے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں جن کی اپنے اپنے ماحول میں ضرورت لاحق ہوتی ہے اور جو ماحول کا مقابلہ نہیں کرسکتے انھیں قدرت ہمیشہ کے لئے معدوم کر دیتی ہے -



دنیا میں بے شمار جاندار ہیں جن میں ماحول کے انقلابات نے ان کے معطل اور کام میں نہ آنیوالے اعضا کو مختصر ترین یا بیکار کر دیا ہے اور صرف ان کے نشانات باقی ہیں۔ مثلاً وہیل مچھلی پیدا ہونے سے قبل جب تک شکم میں رہتی ہے اس کے منہ میں دانت ہوتے ہیں اور پیدا ہونے کے بعد ناپید ہو جاتے ہیں کیونکہ اب وہ دانت اس کے لئے بیکار ہیں اسی طرح اور بھی کئی چیزیں اس کے جسم سے غائب ہو گئی ہیں جو خشکی کے جانداروں میں پائی جاتی ہیں اور پانی کی سکونت کے باعث بیکار ہو گئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہیل مچھلی کا خشکی کے جانداروں سے ضرور تعلق تھا اور اس کے آبا و اجداد کے دانت تھے۔ زندگی کے انقلاب اور ماحول کے تغیرات نے منقطع کر دئے۔ اور اسی قسم کے باقی رہ جانے والے اعضا کے نشانات ایسے جانداروں کی قدیمی اور نسلی تواریخ ظاہر کرتے ہیں۔ اگر HEREDITY خاندانی خصوصیات کا اثر نہ ہوتا تو ان خاص اعضا کا اب تک نام و نشان تک باقی نہ ہوتا۔

پائتھان اور اس کے ہم رشتہ سانپوں میں ان کے پچھلے قدموں کے باقی حصے اب تک پائے جاتے ہیں۔ بوآ سانپ کے پچھلے پیروں کا موجود ہونا ثابت کرتا ہے کہ موجودہ سانپوں کے آبا و اجداد دست و پا رکھتے تھے۔

اب اگر انسان پر توجہ کیجائے تو اس میں قدامت کا سب سے بڑا خزانہ موجود ہے' ویڈرشیم کے لحاظ سے اس میں تقریباً ۱۸۰ باقی نشانات موجود ہیں۔ اسی طرح مسٹر ڈرمانڈ نے بھی تقریباً ۷۰ چیزوں کا بیان کیا ہے جو قدیم ترین انسانی ماحول کی شہادت دیتی ہیں اور جو فی الحال انسان کیلئے بیکار ہیں۔

مینڈک اور مچھلیوں ایسے جانداروں سے لے کر دودھ والے جانداروں تک سب کی آنکھوں میں اوپر اور نیچے کے پپوٹوں کے علاوہ ایک تیسرا پپوٹا بھی ہوتا ہے جس کا پھیلنا اور سمٹنا ایسا اختیاری ہے جیسے پلک جھپکانا لیکن انسان اور بندر کی آنکھوں میں یہ گھٹتے گھٹتے محض ایک نشان کی صورت میں رہ گیا ہے۔

ہاتھیوں، گھوڑوں اور چوپایوں کے کان مکھیاں اڑانے کیلئے بہت ضروری ہیں چنانچہ اس نوع کے جانداروں کے اعصاب کانوں کو حرکت دینے کے لئے بڑے اور قوت دار ہوا کرتے ہیں لیکن بندر اور انسان کے لئے بڑے بڑے کان اور ان کے متعلق مضبوط پٹھوں کی اب ضرورت ہے نہ ان کا استعمال ہی ہوتا ہے اس لئے وہ بطور نشان کے باقی رہ گئے ہیں۔

مویشیوں کی آنتوں میں ایک حصہ پایا جاتا ہے جسے حاصل کرنے والی آنت کہتے ہیں یہ آنت گھاس چرنے والے جانداروں میں بہت لانبی ہوتی ہے اور ہضم میں مدد دیتی ہے۔ برخلاف ان کے انسانوں میں یہ مختصر سی آنت محض بیکار ہے بلکہ بعض اوقات اس میں ایک خطرناک مرض "اپنڈ سائیٹس" پیدا ہو جاتا ہے اس لئے گھٹتے گھٹتے یہ بھی بہت مختصر سی رہ گئی ہے۔

مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ مذکورہ آنت ان مخصوص بندروں میں بہ نسبت انسان کے کچھ بڑی پائی جاتی ہے جو بندر انسان سے بہت ملتے جلتے ہیں مثلاً گیبن بندر GIBBON اورنگ اٹان بندر ORANG OOTAN'

جمپنزی CHIMPANZI اور گوریلا GORILLA وغیرہ

مسٹر ڈاروِن کے نظریہ کے موافق ایسے بندر انسانوں کے قدیمی آبا و اجداد ہیں انھوں نے منجملہ صد ہا ثبوت کے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ انسان کی حالت عالم طفولیت میں بندر سے زیادہ مشابہ ہوتی ہے، شیرخوار بچوں کے پانوں بندر کے پانوں کی طرح اندر کو مڑے ہوتے ہیں یہ حالت بندروں میں تاحیات رہتی ہے وہ اندر کی جانب مڑے ہوئے پیروں سے درختوں کی ڈالیاں بخوبی پکڑ سکتے ہیں۔ ایسے ہی انسانی بچوں کے انگوٹھے ہاتھ کی انگلیوں سے علیحدہ رہتے ہیں بندروں میں یہ حالت بھی ہمیشہ رہتی ہے۔ انسانی بچوں کی انگلیوں میں کسی چیز کو پکڑنے کی حیرتناک طاقت ہوتی ہے۔ بندر کے بچے ہاتھوں اور انگلیوں کی قوت سے کام لے کر پیٹ کی کھال پکڑ کر اپنی ماں کے پیٹ یا پیٹھ سے لپٹے رہتے ہیں۔ سائینس داں حضرات کا خیال ہے کہ انسانی بچوں کے ہاتھوں میں غیر معمولی طاقت کا تعلق انسانی ارتقا سے پہلے کی یاد تازہ کرتا ہے۔



مہاتما رام داس کی تصویر

انسان اور انسان نما بندروں کے بظاہر دم نہیں ہوتی لیکن ان کی اندرونی ساخت اور حالت حمل کے تغیرات کا مشاہدہ کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ ان جانداروں میں کبھی دُم ضرور تھی۔ کیونکہ جنین کے مڑی ہوئی ظاہری طور پر دُم موجود ہوتی ہے اور اس وقت اس دم کی لمبائی جنین کی ٹانگوں سے دگنی ہوتی ہے پھر وہ جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے ظاہری دم گھٹتی جاتی ہے۔ یہی حالت مینڈک کی بھی ہوتی ہے، انسانوں کی اندرونی دُم کبھی اپریشن کر کے نکالی جاتی ہے اور صرف وہی اپریشن کئے ہوئے انسان بے دُم کے ہیں۔ باقی سب ہی کے دم موجود ہے۔

اسکے علاوہ بعض انسانوں کی ظاہری دُم بھی دیکھنے میں آئی ہے ثبوت کے لئے مہاراشٹر کے سادھو رام داس کی تصویر دیکھئے جو شیواجی کے استاد تھے۔ رام داس کے مختصر سی دُم تھی۔

ہندوستان

"نور مشرق" کی ایک نظم

(از حضرت ضیا فتح آبادی)

ہوئی مدت کہ اک تارہ فلک پر جگمگاتا تھا — سرور و کیف میں ڈوبے ہوئے نغمے سناتا تھا
بلندی سے شعاعیں پھینکتا تھا اہل عالم پر — رموز عیش کرتا تھا نمایاں بزم ماتم پر
زر و سیم و جواہر دہر والوں میں لٹاتا تھا — نشاں تاریکیوں کا نور سے اپنے مٹاتا تھا
کیا کرتا تھا صبح و شام سجدے آفتاب اسکو — دیا کرتا تھا بوسے بزم گردوں کا شباب اسکو

اچانک سوئے مغرب ایک طوفانی گھٹا اٹھی — سکندر اور نادر شہ کا لے کر حوصلہ اٹھی
اٹھی اور دم زدن میں آسماں پر چھا گئی ہر سو — بلند و پست اور کون و مکاں پر چھا گئی ہر سو
بڑھایا ظلمتوں نے دست استبدادیوں اپنا — بنایا سارے عالم کو غلام و سرنگوں اپنا
بقدر نور وہ تارا رہا محو ضیا باری — نقاب ابر لیکن ہو گیا آخر بہت بھاری

چھپا ایسا کہ چشم دہر نے دیکھا نہ پھر اس کو
کسی محمود یا تیمور نے تاکا نہ پھر اس کو

سرگزشت ناتمام

(از جناب حکیم محمد یٰسین مسیح بنارسی)

ازل کی گود میں مچلی جو مرضیِ تخلیق — تو مشتِ خاک سے انساں بنا دیا مجھکو
بتا کے رازِ دو عالم سکھا کے نام و نشاں — کلاہِ فخرِ نیابت پہنا دیا مجھکو
جھکا دیا سرِ کون و مکاں قدم پہ مرے — یہ امتیازِ عنایت عطا کیا مجھکو
ہجومِ جذبۂ پنہاں سے ہوگیا مضطر — ریاضِ خُلد کی ایسی لگی ہوا مجھکو
مسرتوں میں گزرتا رہا زمانۂ عیش — ملا سکون کی خاطر وہ ہمنوا مجھکو
کہ دفعتاً نگہِ مہر پھر گئی مجھ سے — ذرا سی بات پہ جنت سے بدر کیا مجھکو
وفورِ یاس میں عذرِ خطا بھی کر نہ سکا — فرازِ عرش سے نیچے گرا دیا مجھکو

یہ خاکدانِ جہاں خراب و تیرہ و تار — پسند آتی تو کس طرح یہ فضا مجھکو
مگر طبیعتِ عنصر سے اُنسیت جو بڑھی — بالآخرش کیا مجبورِ اقتضا مجھکو
بساطِ ارض پہ بڑھتا گیا چہار طرف — نمو کے رنگ میں بخشا یہ حوصلا مجھکو
تنوعاتِ تلون نے کر دیا ششدر — قدم قدم پہ دکھایا وہ ماجرا مجھکو

کبھی بنا دیا بے مزد و بے سر و ساماں — کبھی سریرِ شہی پر بٹھا دیا مجھکو

کبھی گناہ کی رسی دراز تر کر دی — کبھی بنا دیا یوسف سا پارسا مجھکو
کبھی پناہ دی طوفاں سے کوہساروں میں — کبھی عتاب کی موجوں میں دے دیا مجھکو
کبھی بلندیٔ منزل سے آگ میں پھینکا — کبھی بنا کے گلستاں بچا لیا مجھکو
کبھی تو کر دیا گم کردۂ رہِ منزل — کبھی بنا دیا ملت کا رہنما مجھکو
دیا نگاہ کو گاہے فریبِ حسن مجاز — کبھی جمالِ حقیقت دکھا دیا مجھکو
کبھی خیالِ تعین سے کر دیا عاجز — کبھی حدود سے آگے بڑھا دیا مجھکو
جنون شوق میں پھاڑی نقابِ چہرۂ دہر — دیا وہ ذوقِ تماشائے ارتقا مجھکو
مرے خیال کو دے دے کے نالشِ ادراک — کیا معارفِ فطرت سے آشنا مجھکو
نمود حاصلِ صد انقلابِ قدرت ہوں — خدا ہی جانے کہ ہونا ہے کیا سے کیا مجھکو

بیقراری

از حضرت ماہر القادری

زلف بدنام ہوئی جاتی ہے — ہر طرف شام ہوئی جاتی ہے
وہ جفا خاص جو تھی میرے لئے — رحمت عام ہوئی جاتی ہے
اے خدایا الست کی روداد نہ پوچھ
زیست الزام ہوئی جاتی ہے

اک سانس کو آہ کر لیا ہے — بھولے سے گناہ کر لیا ہے
جب دل پہ مرے چھری چلی ہے — دل ہی کو گواہ کر لیا ہے
پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو — کانٹوں سے نباہ کر لیا ہے
دل نے تری دیکھ کر نظر کو — اقرار گناہ کر لیا ہے
دیدار کی کیوں ہوس ہے ماہر
کیا دل کو نگاہ کر لیا ہے

شاعرہ

(از جناب ستیش چندر شباب بی اے)

مشرق کی سمت دیکھو کیسا دھواں اٹھا ہے
دریائے مغربی میں سورج نہا رہا ہے

ہے پرسکون منظر خاموش ہیں فضائیں
صحرا میں رک گئی ہیں چلتی ہوئی ہوائیں

اک شاعرہ نہ جانے کیا دل سے کہہ رہی ہے
گویا کہ شعریت کے دریا میں بہہ رہی ہے

افسردگی ہے رخ پر اور چشم اس کی نم ہے
کاغذ ہے سامنے کچھ اور ہاتھ میں قلم ہے

سوزِ دروں سے رخ کی رنگت ہے زعفرانی
اک ململی سی ساری پہنے ہے ارغوانی

اس کو خبر نہیں ہے کوئی چھپا کھڑا ہے
سینہ سے بیخودی میں آنچل سرک گیا ہے

الجھی ہوئی ہیں زلفیں۔ خاک ان پہ جم گئی ہے
بالوں میں مدتوں سے کنگھی نہیں ہوئی ہے

کانوں میں گوشوارے۔ بندے۔ نہ کوئی بالی
نازک کلائیاں بھی ہیں چوڑیوں سے خالی

وارفتۂ تخیل افکار میں ہے ڈوبی
ہے نظم اس کی شاید دشوار قافیے کی

او بے نیازِ عالم۔ کیونکر زبان کھولوں
دل میں ہے یاں ٹھہر کر جی بھر کے تجھکو دیکھوں

کیا ہو گیا حسینہ۔ وہ شوق خود نمائی
یہ وضع اجڑی اجڑی دل کو پسند آئی

دیکھا ہے جب سے تجھکو دنیا سے کھو گیا ہوں
ہوش و حواس تجھ پر قربان کر چکا ہوں

ایمان میرا لے لے۔ تخئیل میری لے لے
قرآن میرا لے لے۔ انجیل میری لے لے

دل میں تجھے چھپا لوں۔ پہلو میں میرے آجا
تو نور کی ہے پتلی یا ناز ہے سراپا

او کافرہ حسینہ۔ او مہ جبیں۔ پریرو
تو شاعرہ نہیں ہے دنیائے شعر ہے تو

کیا بات ہے کہ تو یوں کمھلائی جا رہی ہے
مثلِ گلِ فسردہ مرجھائی جا رہی ہے

او شاعرہ ابھی سے کیوں بن گئی ہے جوگن
کمسن ہے تو ابھی تو۔ ہیں کھیل کود کے دن

بیزار کس لئے تو دنیا سے ہو گئی ہے — میں تجھ میں کھو گیا ہوں - تو کس میں کھو گئی ہے
اک بیخودی سی تیری ہر بات میں عیاں ہے — تو ہے اسیر الفت - میرا تو یہ گماں ہے
کیا لکھ رہی ہے آخر جو یوں قلم رواں ہے — الفت کسی کی کوئی شاید یہ درد داستاں ہے
اصناف شاعری میں تجھ کو پسند کیا ہے — وہ راز کون سے ہیں دل جن سے آشنا ہے
تیری پسندِ خاطر جو ہو - اسی کو چن لوں — ہو گر کوئی ضرورت رنگِ سخن بدل دوں
آخر میں پوچھتا ہے تجھ سے شباب تیرا — اشعار میں ہے تیرے کس سے خطاب تیرا

تیرے لئے ہیں میری یہ دلگداز غزلیں
کس کے لئے ہیں تیری او مست ناز غزلیں

فلسفۂ ہستی

(جناب بسمل الہ آبادی)

گویا نہ بلندی میں نہ پستی میں ہوں — آلودۂ غم وہم پرستی میں ہوں
اک نقطۂ موہوم ہوں میں اے بسمل — کہنے کیلئے حلقۂ ہستی میں ہوں

بدمست کو بیکار کی مستی کیسی — افکار بلندی میں بھی پستی کیسی
ہم جیتے ہیں مرنے کیلئے اے بسمل — ہستی کی یہ صورت ہے تو ہستی کیسی

ماضی کی ایک حسین یاد

(از سحر طراز حضرت ثاقب کانپوری)

ابھی بھولا نہیں ہوں آہ اُن پُرکیف راتوں کو — کہ جن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی سبزہ زاروں پر
ترنم آہ وہ دلکش ترنم سازِ عالم کا — شعاعیں نور برساتی تھیں جب اُن آبشاروں پر

ابھی بھولا نہیں ہوں آہ اُن پُرکیف راتوں کو

سکونِ مستقل تھا اور دنیا میں خموشی تھی — فنا جب ہو چکے تھے دن کے محشر خیز ہنگامے
ہوائیں عطر میں ڈوبی ہوئی چلتی تھیں مستی میں — کہ جب بیدار تھے شب کے طرب انگیز ہنگامے

ابھی بھولا نہیں ہوں آہ اُن پُرکیف راتوں کو

مشامِ جاں پہ چھا جاتی تھی خوشبو تیری زلفوں کی — کہ جب دنیا سراپا رنگ و بو معلوم ہوتی تھی
مجھے گھیرے ہوئے تھے ہر طرف سے حسن کے جلوے — مجھے ہنستی ہوئی ہر آرزو معلوم ہوتی تھی

ابھی بھولا نہیں ہوں آہ اُن پُرکیف راتوں کو

ترے رخسار کے بوسے محبت کا فسانہ تھے — تبسم کی تجلی تھی طلوع صبح محشر میں
نہ تھی وسعت، بہت محدود دنیائے تخیل تھی — مزا آتا تھا دل کو تیرے دردآمیز نشتر میں

ابھی بھولا نہیں ہوں آہ ان پُرکیف راتوں کو

تمنا ہے کہ وہ عہدِ تمنا کاش پھر ملتا — کہ جن میں ولولے تھے دل کو اک معراج حاصل تھی
ترا نظارہ گرچہ روح پر نشتر لگاتا تھا — مگر وہ دید بھی میرے لئے اک دولتِ دل تھی

ابھی بھولا نہیں ہوں آہ ان پُرکیف راتوں کو

حکیم حاذق ایڈیٹر و پبلشر نے باہتمام جناب فضل احمد ادیب لکھنوی ظفر المطابع بارہ بنکی چھپوا کر دفتر شاہکار گورکھپور سے شائع کیا

فارم اطلاع نامہ حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ :- بعدالت اسپشل جج صاحب بہادر درجہ دوم ضلع گورکھپور نمبر مقدمہ ۸۸ سنہ ۱۹۳۵ء ہرگاہ میاں احمد اللہ ولد [illegible] ساکن موضع صاحب گنج تپہ بہاری سے پرگنہ حویلی گورکھپور نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ضمنی ۱ دفعہ ۱۱ ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جسکی تفصیل ضمیمہ ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا حقداران نے حسب دفعہ ۱۰ سائل مذکور کی جائداد بتایا ہے۔ اگر کوئی شخص جائداد مذکور پر کوئی دعویٰ رکھتا ہو تو وہ جواس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں اس حاکم کے روبرو اپنی عرضی پیش کرے جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں۔

ضمیمہ (الف) قرضدار کے استحقاق مالکانہ متعلقہ آراضی

نمبر سلسلہ	ضلع	نوعیت ملکیت	نام موضع مع پرگنہ و محال	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۱	گورکھپور	زمینداری	سوہر سہاری سے پرگنہ حویلی گورکھپور ضلع گورکھپور	نور و ے قابل انتقال	۸ پائی وجہ گہرے ۱۸ اخیر مینی ۸ پائی احمس ۱۴ احمانگ	بعد
			جائداد منظہرہ مہاجنان ، ۹۸			
۱	گورکھپور	زمینداری	بڑہا ٹپہ بچوارہ	قابل انتقال	۳ پائی	

ضمیمہ (ب) قرضدار کی جائداد جو باستثناء حقوق مالکانہ متعلق آراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی سنہ ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہوسکتی ہے۔

نمبر سلسلہ وار — نوعیت جائداد — وسعت حقیقت درخواست دہندہ

ایک قطعہ مکانات ذریعہ موضع صاحبگنج تپہ بہاری سے پرگنہ حویلی گورکھپور ضلع گورکھپور محدودہ ذیل میں حصہ سائل بقدر ۱/۲

پورب - مکان لال محمد جولاہا ، پچھم - سڑک خام ، اتر - مکان لال محمد ، دکھن - مکان بینی پرشاد

جائداد منظہرہ مہاجن مد

تین قطعہ مکانات واقع موضع بی بی گنج -

دستخط حاکم بخط انگریزی ، مہر عدالت

فارم اطلاع نامہ حسب دفعہ ۱۱ - ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ :- بعدالت اسپشل جج صاحب بہادر درجہ دوم ضلع گورکھپور مقدمہ نمبر ۹۶ سنہ ۱۹۳۶ء ہرگاہ گنگیسر پرشاد و ترنمی مہاسر پسران رام سیوک لال و راجارام ودا تا بہادر پسران گنگیسر پرشاد و لعل جی نابالغ بولایت گنگیسر پرشاد پدر خود ساکن محلہ جعفرا بازار شہر گورکھپور نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ضمنی ۱ دفعہ دفعہ ۱۱ ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جسکی تفصیل ضمیمہ ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا حقداران نے حسب دفعہ ۱۰ سائلان مذکور کی جائداد بتایا ہے اگر کوئی شخص جائداد مذکور پر کوئی دعویٰ رکھتا ہو وہ اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں اس حاکم کے روبرو اپنی عرضی پیش کرے جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں۔

ضمیمہ (الف) قرضدار کے استحقاق مالکانہ متعلقہ آراضی

نمبر سلسلہ وار	ضلع	نوعیت ملکیت	نام موضع مع پرگنہ و محال	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۱	گورکھپور	زمینداری	موضع چکنا سہرا پرگنہ صدر تحصیل صدر	قابل انتقال	۱۰ پائی مع باغات	
			محال ۳		۶ مع باغ	
			محال ۲		۱۶ مع درختان	
			محال ۴			

ضمیمہ (ب) قرضدار کی جائداد جو باستثناء حقوق مالکانہ متعلق آراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی سنہ ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہوسکتی ہے

۱- قطعہ مکان خفالہ پوش مع کھاری [illegible] وغیرہ واقع موضع چکنا سہرا پرگنہ صدر تحصیل صدر ضلع گورکھپور - حدود حسب ذیل

پورب - راستہ ، پچھم آراضی سیر ، اتر - راستہ ، دکھن - مکان موہر علی خاں

۲- قطعہ مکان سفالہ پوش محلہ جعفرا بازار شہر گورکھپور

پورب - سڑک سرکاری ، پچھم - مکان سوبرن دھل ، اتر - مکان دسرت لال ، دکھن راستہ سرکاری

دستخط حاکم بخط انگریزی ، مہر عدالت

نوٹس بابتہ درخواست ڈسچارج

بعدالت صاحب جج بہادر گورکھپور۔

باجلاس جناب اکبر حسین صاحب اسکوائر آئی۔ سی۔ ایس ڈسٹرکٹ جج بہادر گورکھپور۔ نمبر مقدمہ ۴ سنہ ۱۹۳۷ء

۱ ٹھکوری کوری ۲ بلی کوری پسران رگھوناتھ کوری ساکنان موضع سسوار تپہ مین پور پرگنہ سدہوا جوبنہ تحصیل پڈرونہ منصفی دیوریا سائلان دیوالیہ =

ذریعہ نوٹس ہذا ہر خاص و عام کو اطلاع دیجاتی ہے کہ مقدمہ مندرجہ بالا مین سائلان نے عدالت ہذا مین درخواست ڈسچارج داخل کیا ہے اور عدالت نے بغرض سماعت درخواست مذکور تاریخ ۸ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء کیا ہے۔ المرقوم ۱۵ نومبر سنہ ۳۷ء

مہر عدالت

دستخط حاکم

نوٹس بابتہ درخواست ڈسچارج

بعدالت صاحب جج بہادر گورکھپور۔

باجلاس جناب اکبر حسین صاحب اسکوائر۔ آئی سی۔ ایس ڈسٹرکٹ جج بہادر گورکھپور۔ نمبر مقدمہ ۵ سنہ ۱۹۳۷ء

۱ کوبیر کاندو ولد نگسیر کاندو ۲ کنتا کاندو ۳ تیرتھ کاندو ۴ نراین کاندو پسران سندر کاندو حی القایم ساکنان موضع بھوا پار تپہ حویلی پرگنہ بھوا پارہ منصفی شہر ضلع گورکھپور۔

مقدمہ مندرجہ بالا مین سائلان نے درخواست ڈسچارج عدالت ہذا مین داخل کیا ہے اور عدالت نے تاریخ ۲۲ جنوری سنہ ۳۸ء بغرض سماعت درخواست مذکور مقرر کیا ہے لہذا ذریعہ نوٹس ہذا ہر خاص و عام کو اطلاع دیجاتی ہے کہ جس کسی کو خلاف درخواست کچھ عذر ہو تاریخ مذکورہ بالا پر حاضر عدالت ہو کر پیش کرے۔ المرقوم ۱۶ دسمبر سنہ ۳۷ء۔

مہر عدالت

دستخط حاکم

فارم اطلاع عامہ حسب دفعہ ۹ ایکٹ جایداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

بدست عوام فروخت کے لئے } نمونہ نمبر ۱۶۹

اشتہار متفرقہ

بعدالت اسپشل جج درجہ دویم گورکھپور۔ مقدمہ نمبر ۱۷ سنہ ۱۹۳۷ء

ہرگاہ ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء (ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء) جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے۔ ۱ شیخ نعمت علی ۲ شیخ ریاست علی ۳ شیخ لیاقت علی پسران

شیخ اشرف علی ساکنان موضع موہن پور ٹپہ لہڈہ پرگنہ حویلی گورکھپور ضلع گورکھپور نے اس غرض سے پیش کی ہے کہ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ کے احکام اُس سے متعلق کیئے جائیں - لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ۹ (۱) ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ ۱۹۳۴ء جیسا کہ بہ رو سے ایکٹ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے اطلاع دیجاتی ہے کہ کل اشخاص جو سایلان مذکور کی ذات یا جائداد کے خلاف ہر دو ڈگری شدہ و غیر ڈگری شدہ خانگی قرضہ جات کے متعلق تحریری بیانات اس حاکم کے روبرو پیش کریں جسکی دستخط ذیل میں ثبت ہیں اور بہ صورت خلاف ورزی اس کے ہر ایک دعوی ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ خلاف سایل مذکور جملہ اغراض و موقوعات کے لئے زیر دفعہ ۱۳ ایکٹ مذکور بالضابطہ بے باق متصور ہوگا -

مہر عدالت دستخط اسپشیل جج

بدست عوام فروخت کیلئے - نمونہ نمبر ۱۰

فارم اطلاعنامہ حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

بعدالت جناب اسپشیل جج بہادر درجہ دوئم گورکھپور - نمبر مقدمہ ۵۹۸ سنہ ۱۹۳۶ء -

ہرگاہ اننت پرشاد - کمار پرشاد - بھگوان پرشاد پسران رام سروپ چودہری متوفی - جگرناتھ بالغ - بیجناتھ نابالغ - رگھوناتھ نابالغ پسران اننت پرشاد حی القایم بولایت اننت پرشاد پدر خود کرشن ناتھ نابالغ ولد جگرناتھ بولایت جگرناتھ پدر خود - لسنوناتھ - رام ناتھ نابالغان پسران کمار پرشاد بولایت کمار پرشاد پدر خود ساکنان مشہورا بازار ٹپہ خاص پرگنہ تلپور ضلع گورکھپور - کیجانب سے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جایداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے (پیش ہوئی) لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ضمنی ۱ دفعہ ۱۱ ایکٹ مذکورہ اطلاع دیجاتی ہے کہ اُس جائداد کو جس کی تفصیل ضمیمہ ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا حقداران نے حسب دفعہ ۱ سایلان مذکور کی جائداد بتایا ہے - اگر کوئی شخص جائداد مذکور پر کوئی دعوی رکھتا ہو وہ اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شایع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں اُس حاکم کے روبرو اپنی عرضی پیش کرے جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں -

ضمیمہ (الف)

قرضدار کے استحقاق مالکانہ متعلقہ آراضی

نمبر سلسلہ	ضلع	نوعیت جائداد	موضع معہ نمبر بندوبست و محال	درخواست دہندہ کی مستقل و قابل وراثت و قابل انتقال حقیت کی تصریح	وسعت حقیت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	درخواست دہندہ کی حقیت پر موجودہ تشخیص مالگذاری
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱	گورکھپور	زمینداری	محلگت پور ٹپہ نگوا پرگنہ بنایک پور تحصیل مہراج گنج	قابل انتقال	۲ آنہ ۶ پائی ۹ دھور ایک آنہ	

۲	گورکھپور	زمینداری	مشہور ابازار تپہ خاص پرگنہ بنایک پور	قابل انتقال	۱۴؍ پائی کھاتہ نمبر ۶
۳	"	"	سمرا تپہ دیر پرگنہ مذکور	"	۴؍ کھاتہ نمبر ۲
۴	"	"	جلنہوا تپہ نگوا پرگنہ مذکور	"	۸؍ کھاتہ نمبر ۱
۵	"	"	سلہ بہار تپہ پرگنہ مذکور	"	۱ آنہ ۵ ا چھٹانک معلہ زمین کے ½ حصہ سایلان بحال کھیوٹ کھاتہ نمبر ۳

ضمیمہ (ب)

قرضدار کی جائداد جو بہ استثنا حقوق مالکانہ متعلق آراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی سنہ ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہو سکتی ہے -

وسعت حقیت درخواست دہندہ — نوعیت جائداد

۱ قطعہ مکان سفالہ پوش واقع موضع بھگت پور واتپہ نگوا پرگنہ بنایک پور تحصیل مہراجگنج ضلع گورکھپور محدودہ ذیل
پورب مالاوغیرہ سایلان - پچھم مکان لکھن حجام - اوتر مکان دودھ ناتھ دوبے - دکھن مکان جگیسر بھتون

۲ قطعہ مکان سفالہ پوش واقع موضع ٹولہ دگرو پور متعلقہ موضع بھگت پور مذکور محدودہ ذیل -
پورب زمین پرتی - پچھم مکان سایلان - اوتر پرتی - دکھن مکان بھیکو پرشاد

۳ قطعہ بنگلہ کاہی پوش واقع ٹولہ مذکور محدودہ ذیل -
پورب مکان سایلان - پچھم صحن بارار - اوتر پرتی - دکھن مکان بھیکو پرشاد

۴ قطعہ مکان کاہی پوش موسومہ گھاری واقع موضع بھگت پور وا محدودہ ذیل
پورب زمین پرتی - پچھم زمین پرتی - اوتر کھلیان سایلان - دکھن زمین پرتی -

۵ قطعہ مکان موسومہ گھاری کاہی پوش واقع موضع مذکور محدود ذیل -
پورب مکان سکر علی دفالی - پچھم صحن - اوتر مکان رام جن دوبے - دکھن کنوان

۶ تین قطعہ مکانات سفالہ پوش سکونتی سایلان واقع موضع مشہور ابازار تپہ خاص پرگنہ بلیور محدودہ ذیل
پورب مکان سارو پرشاد - پچھم کولہ سایلان - اوتر مکان شبوناتھ وبندہ اچل - دکھن چرن دناد سایلان و مکان حسن سطولہ

۷ قطعہ مکان کاہی پوش واقع موضع مذکور محدودہ ذیل -
پورب مکان جگت لال - پچھم راستہ - اوتر مکان گلاب میان - دکھن راستہ

۸ قطعہ مکان واقع موضع سمرا مذکور محدودہ ذیل
پورب صحن دناد وچرن سایلان - پچھم آراضی مزروعہ سایلان - اوتر آراضی مزروعہ سایلان - دکھن آراضی مزروعہ سایلان -

۹ قطعہ مکان موسومہ گھاری کاہی پوش موضع جگیور مذکور محدودہ ذیل -
پورب راستہ - پچھم آراضی مزروعہ - اوتر کھلیان - دکھن مکان منگر واہیر

تفصیل درختان واقع موضع بھگت پور و اندر کور مع ٹولہ ڈگروپور بازار متعلقہ مذکور

املی ۔ امبہ بیجو ۔ امرود ۔ نیم ۔ بیل ۔ کٹہل ۔ شریفہ ۔ املی ۔ سیمل ۔ لیمو ۔ آنولا ۔ جامن ۔ ناشپاتی ۔

ساگون ۔ بانس ۔ شیشم ۔ سیسو ۔ بھوکوٹھا ۔ انار ۔ بیر ۔ کردن

تفصیل درختان واقع موضع جگنوا مذکور

کٹہل ۔ سیسو ۔ بیر ۔ پیپل ۔ برگد ۔

تفصیل درختان موضع سمرا ۔ امبہ بیجو ۔ مہوہ ۔ بانس ۔ سیمل ۔ برگد ۔ جامن ۔

تفصیل درختان موضع مشہورا بازار ۔ امبہ ۔ شیشم ۔ کوٹھی

تفصیل ڈگریات و پرونوٹ جو سایلان کا ہے ۔ قطعہ ڈگری کمار چودہری ڈگریدار بنام مہادیو چودہری تخمیناً مبلغ الصہ قطعہ پرونوٹ نوشتہ گہراؤ جگیسر موسومہ بھگوان پرشاد تخمیناً مبلغ الصہ ۔ قطعہ پرونوٹ نوشتہ بھنی اوبالی موسومہ بھگوان پرشاد تخمیناً مبلغ ماصہ ۔ قطعہ پرونوٹ نوشتہ بہاری اہیر موسومہ بھگوان پرشاد تعدادی مبلغ ماصہ ۔ قطعہ پرونوٹ رام سوبھگ اہیر موسومہ بھگوان پرشاد تخمیناً مبلغ ماصہ ۔ قطعہ پرونوٹ نوشتہ رحمن اہیر موسومہ بھگوان پرشاد تخمیناً مبلغ ماصہ بقیہ پرونوٹ و دستاویزات سائلان نے تخمیناً مبلغ الصہ کی تحریر کرایا ہے ۔ تفصیل مویشیان وغیرہ فہرست ۔ بیل بڑا ۳۶ راس ۔ بیل گاڑی ۸ راس ۔ بھینس ۱۴ راس ۔ گائے ۵۰ راس ۔ گھوڑا ایک راس ۔ ٹاٹو ۶ راس ۔ بیل گاڑی ۱۴ عدد

واسطے عوام فروخت کے لئے

نمونہ نمبر ۱

فارم اطلاع عامہ حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

بعدالت اسپیشل جج دویم گورکھپور ۔ مقدمہ نمبر ۵ سنہ ۱۹۳۶ء ۔ ہرگاہ سودرسن پرشاد و کملا پرشاد پسران منشی امبیکا لال دا بھی پرتاب نرائن نابالغ بولایت سودرسن پرشاد پدر خود و نند سودرسن پرشاد ساکنان محلہ گھاسی کٹرا کاستہ گورکھپور ضلع گورکھپور نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہذا اس تحریر کیا ۔ و سے حسب دفعہ ضمنی ا دفعہ ۱۱ ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل ضمیمہ ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا حقداران نے حسب دفعہ ۱۰ مذکور کی جائداد بتایا ہے ۔ اگر کوئی شخص جائداد مذکورہ پر کوئی دعوی رکھتا ہو تو ۔ سے جو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شایع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں اس حاکم کے روبرو اپنی عرضی پیش کرے جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں ۔

ضمیمہ (الف) ۔ قرضدار کے استحقاق مالکانہ متعلقہ اراضی ۔

سلسلہ نمبر		نام ضلع	موضع مع نمبر بندوبست و محال	درخواست دہندہ کی مستقل و قابل و ناقابل انتقال حقیقت کی تصریح	وسعت حقیقت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱	گورکھپور	زمینداری	منگل پور سکونی مہ شکوہ پور حویلی گورکھپور تحصیل مہراجگنج ضلع گورکھپور محال ۱	قابل انتقال	۸ حصہ سابق برد تقسیم موازی ۱۷	

۲	گورکھپور	زمینداری	منگل پور ٹیکولی محال .... تپہ	قابل انتقال	رسنگر آراضی یعنی ۱۶ار
۳	رر	آراضیداری	محلہ گھاسی کٹرہ شہر گورکھپور	رر	ایک بکر ۱۳ بسوہ ۷ کڑی کھیوٹ کھاتہ ۲
۴	رر	سیرخود کاشت	منگل پور ٹیکولی محال تپہ پرگنہ مذکور	ناقابل انتقال	ایکڑ ۳۰ دسمل

ضمیمہ (ب)

قرضداری جائداد معہ بہ استثنا حقوق مالکانہ متعلق آراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہوسکتی ہے۔

نمبر سلسلہ وار	نوعیت جائداد	وسعت حقیقیت درخواست دہندہ
۱	ایک قطعہ مکان پختہ واقع محلہ گھاسی کٹرہ شہر گورکھپور بحدود ذیل اوتر مکان رام چندر پرشاد دکھن راستہ ۔ پورب راستہ پچھم آراضی مزدہ	مکان مسکونہ سایلان ہے
۲	ایک قطعہ گواری دھوسولہ اندر حدود ذیل واقع موضع منگل پور ٹیکولی تپہ پرگنہ مذکور پورب مکان سری بھگوان لال ۔ پچھم باغ لچھمن پرشاد تیواری اوتر مکان پوجن دھوبی ۔ دکھن مکان گرجا سنگھ وار	مولشیان رہتی ہیں ۔
۳	ایک قطعہ مکان واقع موضع منگل پور ٹیکولی تپہ ٹنکویا پرگنہ حویلی گورکھپور تحصیل مہراجگنج ضلع گورکھپور =	زراعت کے غرض کیلئے ہے

بدست عوام فروخت کیلئے ۔ نمونہ نمبر ۱۰ ۔ فارم اطلاع عام حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جایداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

اسپیشل جج درجہ دویم گورکھپور ۔ مقدمہ نمبر ۱۷ سنہ ۱۹۳۰ء = برگاہ دھنپت من ترپاٹھی ولد سری بھجن من ترپاٹھی وچندر بھال من ترپاٹھی عرف دیہامن ترپاٹھی ولد دھنپت من ترپاٹھی حیات ساکن موضع دانی تپہ ریگولی پرگنہ حویلی گورکھپور ضلع گورکھپور نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ضمنی ۱ دفعہ ۱۱ ایکٹ مذکور اطلاع دی جاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل ضمیمہ ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا حقداران نے حسب دفعہ ۱۰ مذکور کی جائداد بتایا ہے اگر کوئی شخص جائداد مذکور پر کوئی دعوی رکھتا ہو تو ۔ سے جو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شایع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں اُس حاکم کے روبرو اپنی عرضی پیش کرے جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں

ضمیمہ (الف) قرضدار کے استحقاق مالکانہ متعلقہ آراضی

نمبر سلسلہ وار	ضلع	نام جائداد	موضع مع نمبر بندوبست و محال	درخواست دہندہ کی مستقل و قابل وراثت و قابل انتقال حقیقیت کی تفریح	وسعت حقیقیت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۱	گورکھپور	حصہ زمینداری	دانی معہ تپہ ریگولی پرگنہ حویلی کھیوٹ نمبر ۱ و ۲	کل جائداد موروثی اور قابل انتقال وراثت	۳۳ تا ۱۸ السن سا ملاتی
۲	رر	رر	گولہریا تپہ و پرگنہ مذکور	رر	۹ السن
۳	رر	رر	کسمہا تپہ و پرگنہ مذکور	رر	۱ تا ۱۳ السن
۴	رر	رر	کالا نابار تپہ و پرگنہ مذکور	رر	۱ تا ۲۷ السن
۵	رر	رر	پتھو و پرگنہ مذکور	رر	۲ تا ۲

ضمیمہ (ب)

قراضدار کی جائداد جو بہ استثناء حقوق مالکانہ متعلق آراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہو سکتی ہے۔

نمبر سلسلہ وار	نوعیت جائداد	وسعت حقیقت درخواست دہندہ
۱-	ڈگری مصدرہ عدالت جج خفیفہ گورکھپور مقدمہ دھنپت من تریاٹھی بنام ستیل پرشاد مصر مدعاعلیہ	سا ھ

بدست عوام فروخت کیلئے۔ نمونہ نمبر ۱۰ فارم اطلاعنامہ حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

بعدالت اپیل جج دویم گورکھپور مقدمہ نمبر ۵۵ سنہ ۱۹۳۶ء - ہرگاہ بابو مہادیو پرشاد سنگھ ولد بابو دیپت سنگھ و بابو امر نرسنگھ ولد بابو مہادیو پرشاد سنگھ و بابو شمشیر بہادر سنگھ و بابو موہن سمیر سنگھ نابالغان پسران بابو امر نرسنگھ بزرافت بابو امر نرسنگھ ساکنان موضع سہجنوان تپہ لہڈہ پرگنہ حویلی گورکھپور ضلع گورکھپور کیجانب سے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ مسل ہوئی ہے لہذا اس تحریر کی روسے حسب ضمنی ۱ دفعہ ۱۱ ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل ضمیمہ ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا حقداران نے حسب دفعہ ۱۰ مذکور کی جائداد بتایا ہے۔ اگر کوئی شخص جائداد مذکور پر کوئی دعوی رکھتا ہو تو سے جو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شایع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں اس حاکم کے روبرو اپنی عرضی پیش کرے جسکی دستخط ذیل میں ثبت ہیں۔

ضمیمہ (الف)

قرضدار کے استحقاق مالکانہ متعلقہ آراضی

نمبر سلسلہ وار	ضلع	نام جائداد	موضع معہ نمبر بند و بست و محال	درخواست دہندہ کی مستقل و قابل وراثت و قابل انتقال حقیت کی تقریح	وسعت حقیت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۱	گورکھپور	زمینداری	موضع سہجنوان محال ۵ تپہ لہڈہ پرگنہ حویلی گورکھپور	موروثی	۸ سر آنہ
۲	,,	,,	ایضاً محال ۶	,,	ایک پائی ۲۲ الس ۱۴ وسمل
۳	,,	,,	موضع کہرکہوہ محال ۲ تپہ لہڈہ پرگنہ حویلی گورکھپور	,,	۲ پائی ۱ $\frac{۱۹۴۹}{۳۸۳۵}$ ربع کا نصف
۴	,,	,,	,,	,,	۶ پائی $\frac{۱۹۶۲۹}{۵۴۲۲۶۹}$ ۳
۵	,,	,,	,,	,,	۲ پائی ۱ $\frac{۵۸۲۳}{۵۴۲۲۶۹}$ ربع
۶	,,	,,	ایضاً محال ۳	,,	۴ پائی ۱ $\frac{۴۰۴}{۲۷۲۷}$ ربع
۷	,,	,,	ایضاً محال ۹	,,	۷ پائی ۳ ربع
۸	,,	,,	موضع سرلاون گڈھ تپہ لہڈہ پرگنہ حویلی گورکھپور	,,	آدھ پائی
۹	,,	,,	موضع برگدوا عرف گونریا محال ۱ و محال ۲ سہ مرچوار پرگنہ نباک پور	,,	۷ پائی $\frac{۱۶۵}{۴۶۴}$ ثلث کا نصف
۱۰	,,	,,	موضع بیپری تپہ لہڈہ پرگنہ حویلی گورکھپور	موروثی	ایک پائی ایک ثلث کا نصف
۱۱	,,	,,	موضع پورینیان تپہ سرسیا پرگنہ نباک پور	,,	$\frac{۱۱}{۲۴}$ پائی کھیوٹ میں نام نہیں درج ہے

۱۲	گورکھپور	زمینداری	موضع ببلبہار نیپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	موروثی	$\frac{11}{24}$
۱۳	ر	ر	موضع زمین پور تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$ پائے کہیوٹ مین نام درج نہین ہے
۱۴	ر	ر	موضع رہرا تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$ پائے کہیوٹ مین نام درج نہین ہے لیکن حصہ پر قبضہ ہے
۱۵	ر	ر	موضع سکوب تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$ کہیوٹ مین نام درج نہین ہے
۱۶	ر	ر	موضع بڑہرا تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$ پائی
۱۷	ر	ر	موضع ترہیان تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$ پائی کہیوٹ مین نام درج نہین ہے
۱۸	ر	ر	موضع ھلگوان پور سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$
۱۹	ر	ر	موضع بردلی تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$
۲۰	ر	ر	موضع ہنومان گڈھا تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$
۲۱	ر	ر	موضع پرسا شمالی تپہ و پرگنہ مذکور	ر	$\frac{11}{24}$
۲۲	ر	ر	موضع جگرناتھ پور تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$ پائی کہیوٹ مین نام درج نہین ہے
۲۳	ر	ر	موضع سکردلی تپہ سرسیا پرگنہ نبایک پور	ر	$\frac{11}{24}$ کہیوٹ مین نام درج نہین ہے
۲۴	ر	ر	موضع ترلوک پور تپہ و پرگنہ مذکور	ر	$\frac{11}{24}$ کہیوٹ مین نام درج نہین ہے
۲۵	بستی	ر	موضع سرور تپہ ستیلا پرگنہ بانسی پتہ ضلع بستی	ر	۱/۱ پائے ۲ $\frac{1}{4}$ ربع
۲۶	گورکھپور	ر	موضع بیلوا تپہ نیتو پرگنہ نبایک پور کہاتہ ۳	ر	۲ پائی
۲۷	ر	ر	موضع بیلوا کہاتہ نمبر ۹ تپہ و پرگنہ مذکور	ر	۱/۲ پائے ۲ $\frac{1}{4}$ رتت
۲۸	ر	ر	موضع پوکھر بھٹوا محال ۶ تپہ و پرگنہ مذکور	ر	۱۳/۶
۲۹	ر	ر	موضع پوکھر بھٹوا محال ۹ سہ و پرگنہ مذکور	ر	۲/۶

ضمیمہ (ب)

قرضدار کی جائداد جو بہ استثنا حقوق مالکانہ متعلق مالکانہ اراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہو سکتی ہے

نمبر سلسلہ وار ۱	نوعیت جائداد	ذیل دستخط حقیت درخواست دہندہ ۳
۱-	قطعہ مکان سفالہ پوش واقع موضع بھجنوان تپہ اہڈہ پرگنہ حویلی گورکھپور نمبر ۴ پورب زمین پرتی - پچھم مکان بالو کا لیکا سنگہ وغیرہ - اوتر زمین پرتی - دکھن گلی	
۲-	قطعہ مکان سفالہ پوش واقع موضع پوکھر بھنڈہ تپہ نتو پرگنہ نبایک پور تحصیل بانسی ضلع بستی - پورب صحن سایلان - پچھم زمین پرتی و صحن سایلان - اوتر زمین پرتی و مکان پنڈت اومان دت - دکھن زمین پرتی و کھیت سایلان -	

۳- قطعہ گھاری سفالہ پوشش واقع موضع مذکور محدودہ ذیل - پورب زمین پرتی - پچھم زمین پرتی و چرن سائن اوتر زمین پرتی سایلان - دکھن زمین پرتی -

۴- اسکے علاوہ جن جن موضعات پر سائلان کی زمینداری واقع ہے درختان از قسم امبہ - مہوہ و کٹہل و شیشم وغیرہ داخل ہیں -

۵- مبلغ ۱۸/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء نوشتہ جوکھن پانڈے موسومہ بابو امر سنگھ

۶- مبلغ ۲۵۷/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۹ مارچ ۱۹۳۳ء نوشتہ کاشی کیوٹ موسومہ بابو امر سنگھ -

۷- مبلغ ۳۴/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء نوشتہ بابو کھڑگ بہادر سنگھ موسومہ بابو امر سنگھ

۸- مبلغ ۱۹۹/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۳۲ء نوشتہ گوری چالی موسومہ بابو امر سنگھ -

۹- مبلغ ۱۳۵/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۴ جون ۱۹۳۳ء نوشتہ راجہ سنگھ موسومہ بابو امر سنگھ -

۱۰- مبلغ ۴۹/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۲ء نوشتہ رام دیہل برلا موسومہ بابو امر سنگھ

۱۱- مبلغ ۹۹/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۳۳ء نوشتہ ابراہیم پوپا موسومہ بابو امر سنگھ -

۱۲- مبلغ ۳۷/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۳۳ء نوشتہ بھوراچار موسومہ بابو امر سنگھ

۱۳- مبلغ ۱۵/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۳ء نوشتہ گھرباری دہنیان موسومہ بابو امر سنگھ

۱۴- مبلغ ۴۹/- روپیہ بذریعہ تحریر پرونوٹ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۳۳ء نوشتہ شکرو دہونیان موسومہ بابو امر سنگھ

۱۵- تخمیناً مبلغ ۱۵۰/- روپیہ بذریعہ ڈگری نمبری ۹۴۴ سنہ ۱۹۳۵ء عدالت منصفی بانسی بابو مہادیو سنگھ وغیرہ ڈگریداران بنام بابو دلو کی نندن سنگھ وغیرہ -

۱۶- تخمیناً مبلغ ۳۵۰/- بذریعہ ڈگری نمبری ۳۳۳ سنہ ۱۹۳۳ء عدالت جج خفیفہ گورکھپور بابو امر سنگھ ڈگریدار بنام شیخ منشی -

۱۷- تخمیناً مبلغ ۳۲۵/- بذریعہ ڈگری عدالت جج خفیفہ گورکھپور بابو امر سنگھ بنام فوجدار رائے -

۱۸- مبلغ ۲۵۰/- روپیہ بذریعہ دست آویز رہن دخلی مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۰ء نوشتہ کیلاس دوبے وغیرہ موسومہ بابو امر سنگھ - رقم مذکور راہنان کا نمبران ۱۷ و ۲۷ واقع موضع میلوا تپہ نتور پرگنہ بنایک پور تحصیل بانسی پورب ضلع بستی رہن دخلی ہے جس پر راہنان کا قبضہ ہے -

۱۹- ایک راس گھوڑا برنگ سفید تعدادی مبلغ ۱۰۰/- روپیہ -

دستخط حاکم بخط انگریزی

مہر عدالت



موجد الائچی تمباکو رجسٹرڈ
کارخانہ مقتدا خاں اقتدا خاں
وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ میں ہے
ILLACHI-TOBACCO
REGISTRED
THE QUEEN OF TOBACCOS
FOR ITS QUALITY
MUQTIDA KHAN IQTIDA KHAN
PERFUMERS & TOBACCONISTS
VICTORIA STREET. LUCKNOW.